ہندوستان میں
www.KitaboSunnat.com
وہابی تحریک
مُصنّف
ڈاکٹر قیام الدّین احمد
ایم اے، پی ایچ ڈی۔ پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی
مُترجم
پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی
نفیس اکیڈمی
اردو بازار
کراچی

ہندوستان میں
وہابی تحریک

مصنف

ڈاکٹر قیام الدین احمد

ایم اے، پی ایچ ڈی - پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی

مترجم

پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

ایم اے

نفیس اکیڈیمی

اسٹریچن روڈ - کراچی

www.KitaboSunnat.com

نام کتاب ____	ہندوستان میں وہابی تحریک
تالیف ____	ڈاکٹر قیام الدین احمد - پی - ایچ ڈی -
مترجم ____	پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی ایم اے
ضخامت ____	۴۰۰ صفحات
ایڈیشن ____	آفسٹ
طبع سوم ____	مارچ ۱۹۸۰ء
فون نمبر ____	۲۱۳۳۰۳

قیمت ______ روپے

طابع
نفیس اکیڈیمی - کراچی

فہرست مضامین

وہابی تحریک حصّہ اوّل

باب ۳

باب ۴

دوسرا حصہ

باب ۶

باب ۷

باب ۹

باب ۱۰

حیات اور مکتوبات سیّد احمد شہیدؒ کے بعد

ہندوستان میں وہابی تحریک

چوہدری محمّد اقبال سلیم گاہندری

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے سامنے پیش ہے، ڈاکٹر قیام الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی کی گراں قدر اور بے مثال تصنیف "ہندوستان میں وہابی تحریک" (انگریزی) کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ پروفیسر محمد مسلم صاحب ایم اے نے کیا ہے اور خود پروفیسر صاحب کا نام نامی ترجمہ کی خوبی، سلاست اور عمدگی کے لیے ضمانت ہے۔ پروفیسر صاحب حضرت شادؔ کے شاگرد رشید اور پختہ مشق ادیب و شاعر ہونے کے علاوہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کے ادا شناس ہیں۔ ان کے ترجمہ کی خوبیوں کا کیا کہنا۔

مصنف کتاب ڈاکٹر قیام الدین صاحب نے یہ کتاب اس وقت لکھی ہے جب کہ "ہندوستان میں وہابی تحریک" سے متعلقہ مواد بہت کچھ ظاہر ہو چکا تھا اور جو ابھی تک عام نظروں سے پوشیدہ تھا اسے ڈاکٹر صاحب نے بڑی جستجو سے حاصل کیا ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی تواریخ عجیبہ۔ کالا پانی، غلام رسول مہر مرحوم کی تین ضخیم کتابیں۔ تحریک مجاہدین۔ سرگزشت مجاہدین اور سید احمد شہید بریلوی کے علاوہ مرحوم مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ہندوستان کی پہلی سیاسی تحریک اور مولانا ابوالحسن سید علی ندوی کی کتاب سید احمد شہید، اس سلسلہ کی مشہور کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر قیام الدین صاحب کی اس کتاب میں مذکورہ بالا تمام کتابوں کے علاوہ دوسرے متعدد ذرائع اور کاغذات سے حاصل شدہ اور بہت سا مواد موجود ہے جو کسی اور کتاب میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر دنیا میں سب سے زیادہ مکمل کتاب ہے اور جدید ترین معلومات پوری طرح اس میں موجود ہیں۔

وہابی تحریک حقیقتاً اس تحریک کا نام ہے جو شیخ محمد بن عبدالوہاب النجدی المتوفی ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء نے نجد میں چلائی تھی۔ یہ ایک اصلاحی تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو غیر ضروری اوہام اور غیر شرعی اعمال و رسوم پیدا ہو گئے ہیں انہیں ختم کر کے دین کو اپنی قدیم سادگی پر واپس لایا جائے۔ اور دین

پر مٹنے کی جو تمنا صحابہؓ کرام میں موجود تھی اسے پھر سے زندہ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول میں وہابیوں کو مختلف طاقتوں سے ٹکرانا پڑا اور وہ ٹکرائے۔

ہندوستان کی وہابی تحریک کا اس سے حقیقتاً کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ لوگ بھی دینی جذبات سے بریز تھے، ان میں بھی روح جہاد کارفرما تھی اور یہ بھی دین کو عہد اول کی سادگی پر لانا چاہتے تھے اس لیے یہ لوگ بھی وہابی مشہور ہو گئے یا دوسروں نے ان کی تحریک کو وہابی تحریک کے نام سے موسوم کر دیا۔

ہندوستان کی وہابی تحریک جس کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعلیمات سے ہوئی۔ ان کی اولاد اور ان کے شاگردوں نے اس درخت کی آبیاری کی اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ۔ حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ اور ان کے جاں نثار رفیقوں نے اسے اپنے خون سے سینچا۔ یہ ایک عوامی سیاسی تحریک تھی اور یقیناً پہلی عوامی تحریک تھی۔ اس کا مقصد کسی کو تخت وتاج دلوانا نہیں تھا۔ بلکہ غیر مسلموں کے اقتدار اور ان کے بے پناہ مظالم سے مسلمانوں کو نجات دلانا تھا۔ اگرچہ سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ اپنے چھ سو رفقاء کے ساتھ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شہید ہو گئے ؎

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لیکن اس تحریک نے مظلوموں کے قلوب میں وہ آگ روشن کر دی جو بار بار بھڑکتی رہی اور وہ وقت بھی آ ہی گیا کہ ؎

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

کہاں تو یہ حال تھا کہ سکھوں کے تسلط میں اذان دینا بھی جرم تھا۔ شاہی مسجد رنجیت سنگھ کے گھوڑوں کا اصطبل بنی ہوئی تھی۔ اور کہاں یہ وقت کہ ڈھونڈنے پر بھی ہزارہ اور لاہور میں کوئی سکھ نظر نہیں آتا۔ سکھوں کے بعد انگریز جو دشمن ہوئے تو ایسے ہوئے کہ ہر پابند شرع آدمی پر وہابی ہونے کا الزام لگا کر کالا پانی بھیجتے رہے۔ کتنی ہی بار پنجتار اور ستھانہ پر جو مجاہدین کے مرکز تھے۔ انگریزی فوجوں نے آگ برسائی اور ایسے ایسے مظالم کیے کہ ان کا ذکر بھی غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکانے کے لیے کافی ہے لیکن اس سے کیا نتیجہ نکلا ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام تک ان کا مرکز بھی قائم رہا اور ان کی تنظیم بھی موجود رہی انگریز کبھی ان کو سرنگوں کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ البتہ ۱۹۴۷ء میں جب مسلمانوں کی ایک مملکت پاکستان قائم ہو گئی تو آخری امیر المجاہدین نے یہ اعلان کر دیا کہ اب اس تنظیم اور مرکز مجاہدین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کا جواب پوری کتاب کو پوری توجہ سے پڑھ کر خود اپنے دل سے پوچھیے۔

سید احمد شہیدؒ کے حالات کو پڑھ کر جہاں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آج سے صرف سو سوا سو سال پہلے ہم میں اتنے مخلص بے خوف اور جفاکش مجاہدین موجود تھے وہاں یہ بات کچھ کم حیرت افزا نہیں کہ اس تحریک کے مقاصد میں کس قدر جاذبیت اور اس کے مقدس و محترم رہنما میں کس بلا کی مقناطیسی قوت موجود تھی کہ اس کی آواز پر مسلمان جنگل و صحرا کو عبور کر کے اور بھوک پیاس کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے، خطرات کو جھیلتے ہوئے، کفن بر دوش، اور سر بکف انتہائی تکلیف دہ اور غیر دلچسپ پہاڑی علاقے میں کھنچے ہوئے چلے آتے تھے، اور کیا حاصل کرنے کے لیے چلے آتے تھے، دولت دنیا۔ محلات واعزازات وزیری و مشیری، شہرت و ناموری؟ نہیں ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ خالق ارض و سماء کی رضامندی کے لیے۔ اور

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

سوچتا ہوں اور شرم سے سر جھکا کر خود اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ اب ہمارے علماء اور زعماء کی آوازوں میں وہ جاذبیت کیوں نہیں موجود ہے۔ کون دے اس کا جواب، اور کہاں سے ملے جواب سچ ہے کہ

"قومیں جب تباہ ہونے لگتی ہیں تو سب سے پہلے اس قوم
کے اربابِ اقتدار اور اربابِ علم بگڑ جاتے ہیں۔"

اس کتاب کی اشاعت سے ہمارا مقصد صرف کاروبار ہی نہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے بوڑھے اور جوان، مرد اور عورت سب اس کو پڑھیں اور دیکھیں کہ کتنے حوصلہ شکن حالات میں دل والے ایمان اور یقین والے اور جوش و عمل رکھنے والے کام کیا کرتے ہیں اور کتنے موانع اور رکاوٹوں کے باوجود دین و شریعت سے وابستگی کو قائم رکھتے ہیں۔

لیجیے یہ کتاب آپ کے سامنے پیش ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مطالعہ سے ہمارے سیاست دانوں اور عوام کو فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ

پہلی نظر

نام کتاب : میں نے جب اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو پہلے "وہابی موومنٹ" کے نام سے بدخط ہوا۔ مگر تمہید میں ان کا یہ عذر دیکھ کر مطمئن ہوگیا کہ وہ جماعت مجاہدین ہند کے انگریزوں کے تھوپے ہوئے خطاب "وہابی" کے اختیار کرنے پر اس لیے مجبور ہوگئے کہ ان کے شاطرانہ پروپیگنڈے سے ایک طرف مسلمانانِ ہند فریب کھا کر ان کو نجدی وہابیوں کا پیرو سمجھے اور اسی نام سے پکارنے لگے، دوسری طرف انگریزوں اور ہندوستانیوں نے بھی اس موضوع پر جو کتابیں اور رسالے لکھے یا سرکاری دفاتر میں ان سے متعلق جو رپورٹیں، دستاویزیں اور جتنے ماخذ ہیں سب ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ داغ ان کی پیشانی پر ایسا چپکا ہے کہ چھڑائے نہ چھوٹا۔

اس سلسلہ میں کچھ مزید توضیح مناسب سمجھتا ہوں۔ حضرت سید احمد شہید کا کوئی واسطہ بانی وہابیت محمد بن عبدالوہاب سے نہ تھا، نہ یہ دونوں معاصر تھے۔ محمد ۱۷۹۲ء میں وفات پا چکے تھے اور حضرت سید احمد ۱۸۲۱ء میں حج کو حجاز تشریف لے گئے تھے، اس لیے ان میں باہم ملاقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر محمد بن عبدالوہاب کے پیرو وہابیوں کی کشمکش مسلمانوں سے تھی اور مجاہدین ہند کی کفار سے یہ بہت بڑا اصولی فرق تھا۔

مجاہدین کی سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ آویزش سے لے کر آخری مجاہد امیر عبداللہ تک سرحدی قبائل اور سکھ بھی ان کو "ہندوستانی" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

رہا بعض عقائد میں وہابیان نجد اور مجاہدین ہند کا اشتراک یا مماثلت، توسیعی اصلاحِ عقائد میں یہ قدرتی اور اتفاقی ہے، جسے سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں۔

وہابیان نجد سے انگریزوں کی عداوت کی وجہ یہ تھی کہ وہابیوں کی آویزش صرف ترکوں سے نہیں ہوتی خلیج فارس میں وہابیوں کی مدافعانہ سرگرمی سے انگریزوں کے نوآبادیاتی مفاد اور جوع الارضی سے تصادم ہوا اور خونریز جھڑپیں ہوئیں۔ اسی لیے وہ وہابیوں سے سخت عناد رکھتے تھے اور مزید جھڑپوں کا اندیشہ رہتا تھا۔ انگریزوں نے اپنی فطری عیارانہ حکمت عملی سے مجاہدین کو مسلمانانِ ہندوستان میں مبغوض و مردود کرنے کا یہ زبردست حربہ استعمال کیا کہ ان کو "وہابی" بنادیا۔

یہ انگریزوں کا پرانا آزمودہ حربہ تھا جسے علمائے سوء کے ہاتھوں میں دے کر دُور سے ہی اپنا کام نکالتے تھے۔ علمائے سوء کی کمی نہ تھی۔ یہ ہمیشہ حکام وقت کے آلۂ کار بنے رہے۔ ٹیپو سلطان شہید نے جب انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو بھی دعوت جہاد دی تو انگریزوں نے نام نہاد خلیفۃ المسلمین سلطان سلیم سے درخواست کی کہ وہ شیخ الاسلام سے ایک فتوےٰ لکھوا دے کہ انگریز مسلمانوں کے فرائض و شعائرِ اسلامی میں دخل انداز نہیں ہوتے اس لیے ان کے خلاف جہاد جائز نہیں۔ سلطان ٹیپو دکن میں فرانسیسی افواج سے مدد لینے اور ان کے افواج کی عسکری تربیت بھی فرانسیسی سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی اور فرانس نپولین کے ماتحت ترکی کا حریف تھا۔ اس نے فرانسیسیوں سے ٹیپو سلطان کا گٹھ جوڑ سلطان سلیم کو سخت ناگوار تھا۔ اس نے انگریزوں کی خواہش پوری کر دی اور مطلوبہ فتوےٰ مہیا کر دیا۔ انگریزوں نے علمائے ہند کی وساطت سے اس کی خوب تشہیر کی۔ ان سے جہاد کے خلاف رسالے لکھوائے اور وعظ کہلوائے۔ ٹیپو سلطان لڑتے لڑتے شہید ہو گئے مگر شمالی ہند کے مسلمانوں نے انگلی بھی نہ اٹھائی۔

مجاہدین شمالی ہند کے ساتھ بھی یہ حربہ کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ اس موقع پر بھی انگریزوں نے اپنے اور ترکی کے مشترکہ دشمن کے ساتھ مجاہدین ہند کو آسانی سے وہابی یا بے دین مشہور کر دیا، ورنہ اصلیت کچھ نہیں۔

رہا عقائد میں کچھ اختلافات یا اجتہادات تو یہ دوسری ہی صدی میں معتزلہ کے ہاتھوں شدت سے رونما ہو چکے تھے۔ ان سے قطع نظر اب سے سات صدی پیشتر امام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم نے استمداد لغیر اللہ، سمع موتیٰ، ایصال ثواب، پیر پرستی تعظیم قبور، نذر و نیاز سے

متعلق مدلل بحثیں اور آواز بلند کی۔ بے شک ابن تیمیہؒ نے ان کی پاداش میں قید و بند میں زندگی گزار دی اور زندان میں ہی وفات پائی مگر مرتے ہی قوم نے اُن کو ہیرو بنا لیا، اور ان کے خلاف فتاوے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ پھر عہد اکبری میں حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے بھی حق گوئی کی پاداش میں ہی قید زنداں میں زندگی گزار دی۔ اس کے دو صدی کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عام عقائد پہ بحث کی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ بھی ان کے شریک رہے مگر آج یہ سب مجتہد اور فقہا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مگر ایسے ہی فروعی اختلافات کی بدولت مجاہدین ہند وہابی اور بے دین ٹھہرائے گئے۔ یہ امتیاز خاص اور وہابی کا لقب ان کو صرف جہاد کے انعام میں انگریزوں سے ویسے ہی عنایت ہوا جیسے جزیرہ انڈمان کی مہمانی۔

وہابی تحریک اصلاً مذہبی تھی یا سیاسی ؟ : اس سوال پہ ہمارے مورخینِ تحریک بہت اُلجھے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلام میں دین و سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں یہ اجتماع و اختلاط کس طرح ممکن ہے ؟ اسلام نے ایمان کے زور سے کر دکھایا۔ اُسی عہد سے جب مسلمانوں کو پیٹ بھر روٹی نصیب نہ تھی اپنی زنگ خوردہ تلواروں، تیر کمانوں اور معدودے چند لاغر اور بے زین کے گھوڑوں پہ ہزاروں بکتر بند گھوڑوں ہاتھیوں پہ آزمودہ کار رومی اور ایرانی سورماؤں کے مقابلے میں ڈٹ گئے، نہ جان و مال کی پروا کی، نہ ہزیمتوں سے بے دل ہوئے۔ آخر قیصریت و خسرویت کا خاتمہ کر دیا۔ کیا یہ سیاست نہ تھی، ضرور تھی مگر دین کا جزو لازمی اور ایمان کا کرشمہ۔

ہندوستان میں شجر جہاد نظر تو صرف زمین کے اوپر آتا ہے مگر اس کی جڑیں شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ سے اور گہری ہوتی ہوئی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتی ہیں۔ ہندوستان میں اکبر کی الحاد پروری کے مقابلے میں جب سارے علماء خاموش تماشائی تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے صبر سے قید و بند کی مشقتیں جھیل لیں اکبر کی سیاسی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بالفعل ان کی آرزو دل میں گھٹ کر رہ گئی، مگر یہ آرزو ان کے ارادت مندوں کے دلوں میں کلبلاتی رہی اور عمل میں نہ آ سکی۔ یہاں تک کہ دو

صدی کے اندر اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ نے بھی انگریزوں کی تھریانیت اور مسلمانوں کی محکومیت و بے چارگی محسوس کی۔ وہ مسلمانوں کی عام ذہنی و اقتصادی حالت دیکھ کر زبان ہلانے اور سیاست میں اُلجھنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ علوم کلام اور اسلامی نظریات پر انھوں نے مجتہدانہ مضامین لکھ کر اصلاحِ عقائد کی انتہائی کوشش کی۔ علمائے وقت کے علی الرّغم قرآن شریف کا فارسی ترجمہ کر دیا اور ان کے بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اُردو ترجمے بھی کر دیے۔ اس طرح نظریات و اعتقادات کی اصلاح کی بنیاد ڈال دی اور سیاسی جدوجہد کے لیے بھی میدان کچھ صاف کر دیا۔ مگر سیاسی کانٹے کی کھٹک نے بے چین رکھا۔ اپنے بیٹے شاہ عبدالعزیز کو یہ کانٹا امانتہً سونپ گئے۔ وہ بھی اکیلے اپنے آپ میں اس بار کے اٹھانے کی طاقت نہ پاتے تھے ؎

کہاں یہ تاب و طاقت ہے کہ ہم قفلِ دہن کھولیں
خزانے کی طرح دل میں لیے بیٹھے ہیں راز اُس کا

(شادؔ)

شاہ عبدالعزیز تمام عمر اس تاک میں رہے کہ کوئی ایسا مرد مومن ہاتھ آئے جو اس تحریک اصلاح کا بار اٹھانے کی طاقت رکھتا ہو۔ اپنے بھتیجے اور شاگرد شاہ اسماعیل کو تیار کیا۔ وہ بڑے جیالے منچلے جید عالم نکلے پھر بھی ان کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ اُن کے داماد شاہ عبدالحئی بھی نہایت قابل صاحب بصیرت، پرہیزگار عالم تھے، مگر وہ کسی کو اپنے مشن کے لائق نہ سمجھے۔ اُسی زمانے میں سید احمد پھرتے پھراتے تحصیل علم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے شاگرد بھی ہوئے اور مرید بھی۔ پیر نے مُرید کی بعض باتیں (جیسے مسئلہ تصوّرِ شیخ پر اختلاف) سُن کر اور درویشانہ اطوار دیکھ کر بھانپ لیا کہ "آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید" سید احمد ٹونک میں سپاہیانہ تجربہ بھی حاصل کر چکے تھے دین میں ان کی بصیرت کے قائل ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر ایک چیز اور تھی "بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست" وہ شیوہ جس کی تلاش تھی سید احمد میں دیکھ لیا۔ وہ تھی ان کی روحانیت و مادہ وہبی جسے ہم آپ تمیز

نہیں کر سکتے۔

جہاں تک علم و دانش کا تعلق ہے سیّد احمد کو شاہ اسماعیل سے کوئی نسبت نہ تھی، مگر شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسماعیل اور شاہ عبدالحئی کے ہاتھ سید احمد کے ہاتھ میں دے دیے۔ شاہ اسماعیل ایسے مرید ہوئے کہ تا دمِ آخر مرشد کا دامن نہ چھوڑا اور مر کر بھی میدان بالاکوٹ میں ان کا خون مرشد کے خون سے مل گیا۔

علماء و فقہا نے دین کی جو خدمتیں کی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں مگر ان میں سے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوا شاید کسی نے جہاد کے لیے تلوار اٹھا کر جانبازی نہیں دکھائی۔ تیرھویں صدی ہجری میں یہ سعادت سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور ان کی جماعت کے لیے مقدر تھی[1]

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا　　ہر شخص کے نصیب میں دار و رسن کہاں

خیر یہ تو بعد کی باتیں تھیں جو بر سبیلِ تذکرہ پہلے زبانِ قلم سے نکل گئیں۔ شروع میں شاہ عبدالعزیز کی تعلیمات کی روشنی میں ان کے شاگردوں اور مریدوں، شاہ اسماعیل، شاہ عبدالحئی، سید احمد وغیرہ نے اس مسئلہ پر غور و فکر کیا کہ کفار اور بالفعل سکھوں کے مسلمانوں پر آئے دن لرزہ خیز مظالم و خونخواریوں کا مقابلہ اس بے سر و سامانی میں کس طرح کیا جائے؟ مسئلہ ان کا سمجھا بوجھا ہوا تھا، آسانی سے طے پا گیا کہ یہ مقابلہ و مدافعہ اسی طرح کیا جائے جس طرح قرونِ اولٰے کے مسلمانوں نے ہم سے زیادہ بے سر و سامانی کے باوجود کفار سے کیا اور کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں کو غیر اسلامی زندگی سے روک کر اسلامی زندگی اختیار کرنے پر تیار کیا جائے۔ ان کو غیر اسلامی رسوم سے جو اسلامی بنالی گئی ہیں آگاہ کیا جائے۔ جیسے شادی۔ غمی کی مختلف خود ساختہ تقریبات پر جبری اخراجات اسراف و تبذیر، یہاں تک کہ بھاری بھاری قرضوں سے ان کا انجام۔ ان کو ترک

---

[1] گروہ صوفیہ میں سے طرابلس میں سنوسیہ تحریک اور صمالیہ میں مہدی سوڈانی کی قربانیاں بھی ناقابل فراموش ہیں۔ لیکن ان کا ظہور وہابی تحریک کے بعد ہوا اور دونوں کا حشر وہی ہوا جو وہابی تحریک کا لعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً۔

کر کے کفایت شعاری و سادہ زندگی سے بچائی ہوئی دولت اور ہمت تبلیغ دین اور جہاد پر صرف کی جاسکتی ہے۔

جہاد کا بھولا ہوا سبق پھر یاد کرایا جائے۔ ہر مسلمان عمر بھر اپنے آپ کو سپاہی سمجھے، مرنے مارنے کو تیار رہے۔ سپاہیانہ زندگی کے لیے نکاح بیوگان اور تعداد ازدواج بھی جاری کیا جائے کیونکہ نکاح محض نفسانی وجنسی تقاضا نہیں، بلکہ گوناگوں اقتصادی، سماجی، سیاسی و فوجی مسائل کا حل بھی ہے۔ خصوصًا اس زمانے میں جب کہ محاربین کی کثرت تعداد فوجی کامیابی کا بہت قوی عنصر تھی۔

اسی طرح پیروں کی لوٹ کھسوٹ اور اس کے نتائج پر غور کیا گیا۔ اور طے پایا کہ قبروں کی آرائش، روضوں کی تعمیر، بزرگوں کے مزاروں کی جاترا، عرس، نذر ونیاز پر ضائع ہونے والی رقمیں بچائی جائیں۔ اسی طرح اپنی اور مُردوں کی سکونت (مقبروں) مساجد، مدارس کے لیے عالی شان عمارات کی تعمیر سے اجتناب کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے افعال کا نتیجہ مسلمانوں نے پاکستان کو ہجرت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ نیز مسلمانوں کے ذہن نشین کیا جائے کہ ان کا کوئی ایک وطن نہیں "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" اور مدفن کے لیے بھی مردہ عزیزوں اور بزرگوں کے قرب کی تلاش بھی خام خیالی ہے۔

ان تمام اصلاحات کو آپ مذہبی کہیں گے یا سیاسی؟ کچھ بھی نہیں اور سب کچھ۔ اسلام میں سیاست جدید معنوں میں کوئی اصطلاح ہی نہیں۔ مسلم لغت میں یہ لفظ موجود نہیں۔

تعارف: ڈاکٹر قیام الدین احمد پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کی یہ تالیف درحقیقت ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقاتی مقالہ ہے۔ ہرچند اس موضوع پر کئی تالیف انگریزی اور اردو میں موجود ہیں جن میں مولانا غلام رسول مہر کی تالیف سید احمد شہید، جماعت مجاہدین و سرگزشت مجاہدین پر مشتمل چار جلدوں میں اتنی شرح و بسط، تحقیق و تدقیق اور ساتھ ہی انشاپردازانہ قدرت سے لکھی گئی ہیں کہ اب تک وہ اس موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہیں۔ مگر تاریخ میں کوئی حرفِ آخر مشکل سے ہوتا ہے یہ جنگل ناپیدا کنار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس تحقیقات کے دوران میں بہت سے ایسا مواد مل گیا جن تک اوروں کی رسائی نہ تھی، علاوہ بریں وہ خاندان

صادق پور کے چشم و چراغ بھی ہیں۔ تحریک کے ایک عظیم قائد مولانا احمد اللہ کے بیٹے حکیم عبدالحمید کے نواسے (ڈاکٹر عظیم الدین احمد صدر شعبہ عربی پٹنہ کالج) کے پوتے ہیں۔ اسی طرح ان کو اپنی خاندانی روایات پر بھی بہت کچھ دسترس ہے۔ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے تحریک سے متعلق مزید تحقیق اور بعض غلط فہمیوں کی اصلاح بھی کر دی ہے۔ اب اس موضوع پر ان کی کتاب کم سے کم انگریزی میں حرف آخر ہے۔

اس لیے میں نے باوجود کبر سنی و ضعف بصارت اس کا ہو بہو مکمل ترجمہ پیش کر دیا۔ خاکسار مترجم بھی اسی خاندان کا ایک "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" ہے اور تحریک کے دوسرے بزرگ تر قائد، سید احمد شہید کے خلیفہ ثانی مولانا عنایت علی کا پوتا ہے۔ اس جہت سے اس کا تعلق قدیم تر ہے اور روایات خاندانی سے واقفیت میں کسی سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ اس لیے میں نے اتنی جسارت کی کہ جابجا ذیلی حاشیہ (فوٹ نوٹ) میں مولف کے بعض تسامح یا غلط فہمی کی توضیح بھی کر دی۔ امید ہے کہ اب اردو میں یہ کتاب وہابی تحریک کی مکمل روداد، اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوگی۔

مؤلف کے بعض ذیلی حواشی، خصوصاً دستاویزات کے کچھ حوالے میں نے ترک کر دیے ہیں اس لیے ان حوالہ جات تک عام قارئین کی رسائی مشکل ہے۔ باقی تمام حوالے مع فہرست ماخذ اردو فارسی بھی نقل کر دیے ہیں۔

اکثر مقامات ایسے ہیں جن سے اب اکثر قارئین کو شاید کوئی دلچسپی نہ ہو۔ مگر میں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ ان ناموں میں سے کچھ مجاہدین و معاونین جہاد کی اولاد ہیں جو اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف یا غافل و بے پروا ہو کر بے فکر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے لیے اپنے فراموش کردہ اسلاف کے کارناموں کا ذکر تازیانۂ عبرت ہوگا۔ ان کی آواز اب بھی سن لیں گے۔

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو"

ہر مسلمان کو ہر زمانہ اور ہر زمین میں مجاہد رہنا ہے۔

تعظیمی خطاب مولف کتاب نے تمام مجاہدین و اکابر کے نام جن میں اکثر جلیل القدر

علماء ہیں کسی تعظیمی خطاب مثلاً شہید، مولانا، مولوی یا حضرت کے بغیر لکھے ہیں۔ یہی انگریزی تاریخوں کا دستور بھی ہے۔ میں نے بھی ترجمہ بعینہ کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے تعظیمی الفاظ نہیں بڑھائے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ یہ بزرگوار ہر تعظیمی توصیف سے مستغنی تھے۔

زعشق ناتمام ما جمالِ یار مستغنی ست
بآب و رنگ خال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

محمد مسلم عظیم آبادی (پروفیسر)
کراچی ۳۱ر جنوری ۱۹۷۱ء۔

ڈاکٹر قیام الدین احمد

۱۹۵۲ء میں کے بی جیسوال انجمن تحقیقات پٹنہ میں ایک تحقیقاتی طالب علم کی حیثیت سے میرے تقرر کے فوراً بعد حکومت بہار نے مجھے ڈاکٹر کے دتا کے زیر نگرانی جو انجمن کے اعزازی جائنٹ ڈائرکٹر تھے، کنور سنگھ اور امر سنگھ کے سوانح حیات مرتب کرنے کے لیے مامور کیا۔ اس کام میں مجھے صرف بہار کے تقریباً تمام ضلعی اور ڈویژنل محافظ خانے ہی نہیں بلکہ پٹنہ، کلکتہ، الہ آباد اور دہلی کے محافظ خانے کھنگالنا پڑے۔ اس وقت میری تحقیقات کا خاص موضوع بہار میں ۵۹-۱۸۵۷ء کی تحریک تھا۔ لیکن اکثر دستاویزات جو میرے ہاتھ آئے اس فساد کے زمانے میں وہابیوں اور ان کی جدوجہد سے بھی متعلق تھے۔ وہابیوں کے متعلق جزواً جزواً جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں ان سے اسی موضوع پر میرا شوق تجسس بھڑک اٹھا۔

وہابی تحریک کی تاریخ کی تالیف و ترتیب ایک کٹھن اور بڑا محنت طلب کام تھا۔ مختلف سرکاری محافظ خانوں سے اہم معلومات جمع کرنا اور کاغذات، پرانی کتابوں اور مسودوں کی جانچ پڑتال اور مطالعہ کرنا تھا۔ ان کے علاوہ تحریک کی مکمل تصویر کشی کے لیے کچھ نادر و نایاب ممنوع الاشاعت وہابی رسالے گوشۂ گمنامی سے کھود کر باہر نکالنا تھے اگرچہ لفظ وہابی غلط تسمیہ ہے مگر اس کی تشہیر و استعمال عام کی وجہ سے میرے لیے اس کتاب کے نام میں اسے اختیار کرنا ناگزیر سا ہو گیا۔ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متبعین کو اہل حدیث یا موحدین یا مصلحین سے تعبیر کرنا اور ہر جگہ توسین میں "وہابی" کے لفظ کا اضافہ کرنا اور کچھ نہیں تو جھنجھٹ ضرور تھا۔ انگریزوں اور اکثر ہندوستانی مصنفوں کا اس خطاب کے استعمال پر اصرار و ابرام عمداً اور بدنیتی پر محمول معلوم ہوتا ہے۔

(اب) نجدی وہابیوں نے شروع میں عوام کے بعض اعمال کو جن کو وہ غیر اسلامی تصوّر

کرتے تھے روکنے کے لیے فرطِ جوش میں جن حرکات کا ارتکاب کیا ان کی بدولت یہ جمہور مسلمانانِ ہند اور دوسری جگہوں میں بہت بدنام اور انگشت نما رہے۔ حکومت برطانیہ کی نظر میں تو لفظ وہابی غدار اور باغی کا مترادف تھا۔ اس طرح سید احمد کے متبعین کو وہابی سے تعبیر کر کے اُس وقت کے سرکاری حکام ایک تیر سے دو چڑیوں کا شکار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ایک تو اعلیٰ حکام کے طبقے میں ان پر باغی ہونے کا داغ لگانا دوسرے عام مسلمانوں میں انتہا پسند متعصب اور مآثر کا غارت گر قرار دینا۔ یہ لفظ ایک مذہبی سیاسی دشنام بن گیا۔ بہرحال اس کتاب میں وہابی کا خطاب برقرار رکھا گیا۔ اس لفظ کے غلط مفہوم سے جو اس میں پنہاں ہے مؤلف کو قطعاً کوئی سروکار نہیں۔

یہ کتاب دراصل پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے میرے اُس مقالے پر مبنی ہے جو میں نے ۱۹۶۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا اس کے بعد بعض نئے مواد جو باہر سے دستیاب ہوئے اُن کی مدد سے اس کی نظرِ ثانی کی گئی، نئی ترتیب دی گئی اور توسیع کی گئی۔ یہ ایک حد تک اس تاخیر اشاعت کا عذر ہے۔

یہ کتاب کئی اصحاب کے زیرِ بارِ منت ہے۔ میرے لیے اپنے دو واجب التعظیم استاد ڈاکٹر کے دتا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی اور پروفیسر سید حسن عسکری کے شکریہ کے کماحقہ احساس کا اظہار ناممکن ہے۔ ڈاکٹر دتا کی عالمانہ رہنمائی، ترغیب اور دلچسپی کے بغیر میرا مقالہ اور یہ کتاب شاید تکمیل نہ پاسکتی۔ موضوع کے وسیع مطالعہ کے ساتھ پروفیسر عسکری کا مشورہ اور مدد نہایت گراں بہا ثابت ہوئی جو ہر وقت مجھے حاصل رہی اور کام میں سہولت کا باعث ہوئی۔ میرے دوسرے واجب التعظیم استاد ڈاکٹر آر ایس شرما نے میرا مسودہ مطالعہ فرما کر عام قیمتی مشوروں سے نوازا۔ شعبہ مسودات فارسی کتب خانہ پٹنہ یونیورسٹی سے متعلق مرحوم فصیح الدین بلخی بھی ایک قیمتی ذریعہ اعانت تھے۔ کے پی جیسوال کی تحقیقاتی انجمن کے ایک رکن (فیلو) ڈاکٹر جے ایس جھا نے اس موضوع پر کچھ دستاویزات کی نشان دہی کر کے میری مدد کی۔

سنٹرل ریکارڈز آفس پٹنہ، کلکتہ، الہ آباد، پٹیالہ کے قومی محافظ خانوں اور ڈویژنل کمشنر پٹنہ کے دفتر کے محافظین دستاویزات کے افسروں کا بھی شکر گزار ہوں۔ کلکتہ کے محافظ دستاویزات

مسٹر جے سی گوسوامی بھی بالخصوص ہمیشہ اعانت کے لیے آمادہ رہے۔ میں نیشنل لائبریری بہار ریسرچ سوسائٹی اور پٹنہ کالج کے کتب خانوں کا بھی تحقیقات کے دوران مختلف سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ممنون ہوں۔

میرے بھائی ہشام نے ٹائپ شدہ مسودہ کی تصحیح اور تیاری میں میری مدد کی۔ میں خاص طور پر اپنی بیگم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہمیشہ خاموشی کے ساتھ میری مدد کی اور اس کتاب کی تیاری کی طویل المدت اور کبھی کبھی کٹھن گھڑیوں میں میرا ہاتھ بٹایا۔ میں مسٹر کے ایل موکو پادھیا کی اُس توجہ اور صبر و استقلال کا اعتراف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جو انہوں نے کتاب کی طباعت میں دکھائی۔

قیام الدین احمد

۹ رستمبر ۱۹۶۶ء۔ خواجہ کلاں۔ پٹنہ سٹی

تعارف

(مآخذ کا جائزہ)

وہابی تحریک انگریزوں کے خلاف اُن شدید ترین قدیم ترین اور ممتد ترین تحریکوں میں سے تھی جو اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک مہتم بالشان عنصر ہے۔ تاہم یہ افسوس ناک امر ہے کہ اگرچہ اس عظیم تحریک پر ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری مگر اب تک کسی تاریخی تالیف میں اس پر کماحقہ بحث کی گئی نہ صحیح نقطۂ نگاہ سے نظر کی گئی ہے۔ آج تک وہابیوں پر ایک سر ولیم ہنٹر کی کتاب مطبوعہ ۱۸۷۱ء کے سوا کوئی جامع تصنیف موجود نہ تھی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی بیداری اور اصلاحات پر فی الحال بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں وہابی تحریک کا کوئی تذکرہ نہیں آتا۔ حالانکہ سیاسی حیثیت سے قطع نظر یہ تحریک ہندوستانی مسلم معاشرہ کی سماجی مذہبی اصلاح کی نہایت اہم جدوجہد کی نشان دہی کرتی ہے۔

تحریک کی ابتدائی تاریخ بالخصوص سید احمد کی وفات تک کے زمانے سے متعلق جستہ جستہ معلومات مخطوطات، مسودات، پرانی اور نایاب کتابوں اور فارسی اردو انگریزی رسالوں میں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ ان بچے بچائے ذرائع معلومات کا جائزہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

سید احمد کے سوانح حیات پر قدیم ترین تالیف حضرت شہید کے بھانجے، شاگرد اور قریب ترین رفیق سید محمد علی کی "مخزن احمدی"[1] ہے اس میں اُن کی عرب سے مراجعت تک کا ایک عام بیان ہے اور بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے اسی سے استفادہ کیا ہے، یہ نواب وزیر الدولہ (۱۸۳۴ء

---

[1] اورنٹیل پبلک لائبریری (کتب خانہ شرقیہ پٹنہ) کا مخطوط مورخہ ۱۲۶۳ھ بقلم احسان علی۔ یہ اس تالیف کا قدیم ترین موجودہ نسخہ ہے جو سب سے پہلے ۱۲۶۱ھ میں لکھا گیا تھا۔ غلام رسول مہر کا یہ خیال (مذکورہ جلد نمبر ا صفحہ ۱۶) غلط معلوم ہوتا ہے کہ یہ تالیف ۱۲۸۳ھ میں مکمل ہوئی۔

والئ ٹونک کی فرمائش سے لکھی گئی اور انہیں کے نام پر معنون ہے۔ وزیرالدولہ اپنے والد نواب امیر خاں کے ساتھ وہابی تحریک کے ایک اہم سرپرست رہے۔ دراصل ٹونک وہابیوں کا ایک اہم مرکز رہا ہے، اور ریاست ٹونک کے قدیم کتب خانے میں اس موضوع پر مواد کا ایک قیمتی ذخیرہ موجود تھا۔ وزیرالدولہ خود بھی ایک کتاب مسمی وصایائے وزیری کے مصنف تھے جس میں سید احمد اور اُن کے بعض رفقاء کا تذکرہ ہے۔ اسے نواب محمد علی خان نے ۱۲۸۱-۸۲ھ میں مفید عام پریس آگرہ سے شائع کیا۔

سید احمد کا ایک اور سوانحی تذکرہ جعفر علی نقوی کی تاریخ احمدیہ ہے۔ مؤلف ایک اچھے کاتب تھے اور سید احمد نے ان کو اپنا صدر منشی اور دفتری کاغذات کا ناظم مقرر کیا تھا۔ اس حیثیت سے اُن کو وہابیوں پر لکھنے کا ایک مناسب موقع حاصل تھا۔ بہت سے واقعات میں جو انہوں نے بیان کیے ہیں انہوں نے خود حصّہ لیا تھا۔ وہ سید احمد کے ساتھ شمالی مغربی سرحد پر رہے ان کی شہادت کے بعد ہندوستان لوٹ آئے اور ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں یہ کتاب تالیف کی۔ قمر اس کتاب کے ایک مخطوطے کی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں نشان دہی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس میں بنگال میں ٹیٹومیر کی شورش کا ذکر بھی ہے، جو کسی اور فارسی تذکرے میں مذکور نہیں۔ بدقسمتی سے اس قیمتی مخطوطہ کا کوئی نسخہ مجھے دستیاب نہ ہوا۔

وقائع احمدی یا تاریخ کبیر ایک ضخیم تذکرہ ہے جس میں سید احمد کے بعض رفقاء کی متعدد سرگزشتیں جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب بھی نواب وزیرالدولہ کی سرپرستی میں تالیف ہوئی جنہوں نے سید احمد کے بہت سے رفقاء کو جمع کیا اور ان کے بیانات قلم بند کیے اس کتاب کی پہلی جلد ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں تمام ہوئی۔ اس کتاب کے کئی نسخے مختلف مقامات میں موجود ہیں، جن میں کتب خانہ ریاست رامپور بھی ہے۔ اس میں سید احمد کی زندگی کی اور سرحد کے معرکوں کی کچھ قیمتی تفصیلات ملتی ہیں، لیکن دراصل یہ روایات کا مجموعہ ہے اور خوش اعتقادی کے عناصر سے خالی نہیں۔

"تاریخ ہزارہ" میں ہزارہ اور اس سے ملحق علاقہ جات جموں و کشمیر میں سکھ حکومت کے قیام سے لے کر گلاب سنگھ کی تخت نشینی تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ضلع

کانپور کے ایک کالیستھ مہتاب سنگھ نے علاقہ ہزارہ کے پہلے انگریز ناظم الامور جیمس ایبوٹ کی فرمائش سے لکھی۔ مہتاب سنگھ نوکری کی تلاش میں سرحد شمالی و مغربی کو گیا تھا۔ اور کچھ عرصہ تک کنور کھڑک سنگھ، فتح سنگھ مان اور ہری سنگھ کے تحت خدمت کی تھی۔ سموت (۱۸۲۴ء) میں ہزارہ سرکار کے دفتر میں اُس کا تقرر ہوگیا، ۱۸۵۴ء تک تیس سال اس عہدے پر رہا۔ اسی زمانے میں ایبوٹ نے اُسے علاقہ ہزارہ کے حالات لکھنے پر مامور کیا۔ موجودہ نسخہ لندن کے تعلقاتِ ریاستہائے جمہوریہ کے دفتر کے کتب خانہ کی ملکیت ہے اور اس پر تاریخ ۱۸۵۴ء درج ہے۔ اس میں سید احمد اور سکھ جنرل شیر سنگھ کے درمیان اہم معرکۂ بالاکوٹ کا تفصیلی بیان ہے۔ اس کی وقعت اس حقیقت سے بڑھ جاتی ہے کہ یہ اُس شخص کی تحریر ہے جسے ۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۴ء تک کی پوری مدت میں جائے وقوع پر موجود ہونے کا نادر موقع حاصل ہوا، اور جسے مال گزاری سے متعلق تمام کاغذات دستیاب تھے۔ مؤلف کا دعوٰی ہے کہ اس نے تمام واقعات جو بیان کیے ہیں ان میں سے اکثر اس کے چشم دید ہیں۔ چونکہ یہ کتاب ایک انگریز کی سرپرستی میں لکھی گئی اس لیے مؤلف کے لیے آسانی سے ممکن ہوا کہ وہ اُس وقت تک اپنے آقاؤں کے دو دشمنوں کے درمیان جنگ کے متعلق غیر متعصبانہ رائے کا اظہار کر سکے۔ اب تک اس کتاب کی طرف کسی نے اعتنا نہیں کی تھی۔ مہر نے سید احمد کے سرحدی محاذات پر تمام ممکن معلومات کا جائزہ لینے پر بہت محنت صرف کی ہے اس ماخذ سے اُن کی نظر بھی چوک گئی۔

صراط مستقیم سید احمد کے اقوال و افکار کی بنیاد پر شاہ اسماعیل اور عبد الحئی کی مشترک تالیف ہے بعض لوگوں نے اسے وہابیوں کے قرآن کا نام دیا ہے۔ یہ سید احمد کی اساسی تعلیمات پر مشتمل ہے اور اس میں مسلمانوں میں مروجہ سماجی مذہبی اعمال و رسوم کا بیان بھی ہے۔ اسے تحریک کا سماجی مذہبی منصوبوں کا منشور تصور کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے مطبوعہ نسخے اور اُردو ترجمے بھی موجود ہیں۔ میں نے ایک نایاب نسخے سے استفادہ کیا ہے جو سید احمد کے پہلے خلیفہ شاہ محمد حسین کے ذاتی مطالعہ کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس نسخے کے آخر میں شاہ صاحب موصوف کو سید احمد کی بخشی ہوئی نایاب سندِ خلافت بھی موجود

ہے۔ حوالے کے لیے میں نے اس کتاب کا ایک مطبوعہ نسخہ استعمال کیا ہے۔

سید احمد اور ان کے بعض رفقاء کے مکتوبات کے کئی مجموعے ہیں۔ یہ مختلف مقامات میں موجود ہیں۔ سید احمد کے مکتوبات کا ایک بہت اہم نسخہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں موجود ہے۔ اس میں ایک تتمہ بھی ہے جس میں سرحد پر وہابیوں کی قائم کی ہوئی آزاد ریاست کا حال بھی مذکور ہے۔

اُردو میں مطبوعہ نسخوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

تواریخ عجیبہ یا سوانح احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری۔ وہ ایک دقیع وہابی تھے اور انبالہ کے مقدمے میں بغاوت کے الزام میں سزایاب ہوئے۔ ان کو جزائر انڈمان میں حبس دوام کی سزا ملی تھی۔ لیکن اٹھارہ سال قید میں گزارنے کے بعد وطن واپس آکر انہوں نے یہ کتاب لکھی۔ اسی میں سید احمد اور ان کے بعض رفقاء کی جامع سرگزشت بیان کی گئی ہے اس میں سید احمد کے بہت سے مکتوب کے متن بھی نقل کیے گئے ہیں جو مختلف اشخاص کو لکھے گئے تھے۔

محمد جعفر نے دو اور کتابیں بھی لکھیں: تاریخ عجیب معروف بہ کالاپانی اور تواریخ عجیب۔ ناموں میں یہ خفیف فرق قابل توجہ ہے۔ اصل میں یہ مادہ تاریخ اشاعت اول الذکر جو ۱۸۸۴ء میں لکھی گئی۔ اس میں مقدمہ انبالہ کی روداد اور جزائر انڈمان تک کے سفر میں قیدیوں پر مظالم کے واقعات درج ہیں جن کا کسی اور ذریعہ سے زیادہ علم دستیاب نہیں۔ آخرالذکر کتاب مولف نے دوران قید میں لکھی تھی اور یہ جزائر انڈمان کی جغرافیائی تصویرکشی کرتی ہے۔

سیرۃ سید احمد شہید مولف ابوالحسن علی ندوی۔ مہر کی جامع بسیط الذیل کتاب کی اشاعت سے قبل تک سید احمد کے سوانح حیات پر یہی ایک مفصل ترین تالیف تھی۔ یہ زیادہ تر فارسی مآخذ پر مبنی ہے اور وقت کی سیاسی حالت کی طرف اعتنا نہیں کی گئی ہے۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک مولفہ سید مسعود عالم ندوی۔ یہ زیادہ تر پٹنہ کے

---

[1] حیات سید احمد شہید اور مکتوبات سید احمد شہید کے نام سے نفیس اکیڈمی نے شائع کی ہے۔

وہابیوں کے کرداروں سے متعلق ہے۔ مولف نے فارسی و عربی مآخذ کے علاوہ کچھ انگریزی تصنیفوں اور سرکاری دستاویزوں سے بھی کام لیا ہے۔ موضوع کا طرزِ نگارش منطقی اور تاریخی ہے۔ اور سید احمد کے ساتھ وہ مفرط تعظیمی اسلوب جو بدقسمتی سے بعض اور تالیفات متذکرہ بالا کی تاریخی قدر و قیمت کو بہت گھٹا دیتا ہے بہت کم اختیار کیا گیا ہے۔ اُن دو مسئلوں پر بھی بحث کی گئی ہے جن سے بالعموم غفلت برتی گئی ہے۔ ایک تو ۱۸۵۷ء کی تحریک میں وہابیوں کا دخل۔ دوسرا نجدی وہابیوں کا ہندوستانی وہابیوں پر مفروضہ اثر۔

کئی تالیفات خاندان صادق پور کے ارکان کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم تذکرہ صادقہ مولفہ عبدالرحیم ہے جو جعفر تھانیسری کے ساتھ قید ہوئے اور انہیں کی طرح قید سے رہا ہونے کے بعد یہ کتاب لکھی۔ قائدین پٹنہ خصوصاً ولایت علی عنایت علی، یحییٰ علی اور احمد اللہ کے کارناموں پر مشتمل خاندان کا یہ سوانحی تذکرہ بہت کارآمد ہے۔ خاندان کی روایت کے مطابق اس کتاب کے پہلے مسودہ میں زیادہ مواد جمع تھا مگر مصلحت وقت اور بعض احباب کے مشورے سے مؤلف نے اشاعت سے پہلے حکومت کے خلاف اجزا خارج کر دیے۔ سب سے پہلے اسے مؤلف کے چھوٹے بیٹے نورالہدیٰ نے ۱۹۰۱ء میں شائع کیا۔ میں نے طبع دوم کا نسخہ استعمال کیا ہے۔ جو عبدالغفار صاحب مرحوم صادق پوری کے پاس تھا۔ وہ مؤلف کے قریبی رشتہ دار تھے اور تحریک کی تاریخ سے خاندان میں سب سے زیادہ باخبر تھے۔ ان کے مملوکہ نسخے میں ان کے ہاتھ کے بہت سے حواشی لکھے ہوئے ہیں[۱] جن میں ارکان خاندان اور مرکز پٹنہ کے نظم سے متعلق بہت ہی اہم تفصیلات ہیں۔ تیسرا ایڈیشن عبدالرحیم کے نواسے حکیم عبدالخبیر صاحب نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس ایڈیشن کے تتمے میں حکیم عبدالخبیر نے بعض امور پر مزید اطلاعات ضم کی ہیں[۲]

---

[۱] اس ایڈیشن میں کثرت سے الحاقات ہیں جو قیاسی اور غیر مصدقہ ہیں۔ اس کتاب میں مترجم نے ذیلی حواشی میں مناسب مقامات پر نشان دہی کر دی ہے [۲] یہ دوسرے ایڈیشن کا بالکل چربہ ہے اور اسی کے نقائص سے مملو ہے۔ اور پہلے ایڈیشن سے ویسا ہی مختلف۔ افسوس ہے کہ پہلا ایڈیشن ڈاکٹر قیام الدین احمد کو دستیاب نہیں ہوا۔ مترجم کے پاس موجود ہے۔

"رسالہ تعزیہ" یہ ولایت علی، عنایت علی اور فیاض علی کی کچھ تحریرات کا مجموعہ ہے جس میں کچھ دینی سماجی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ صراط مستقیم کی طرح یہ رسالہ بعض سماجی اور دینی مباحث پر وہابیوں کے نظریات کی توضیح کرتا ہے۔

مثنوی شہر آشوب از حکیم عبدالحمید۔ اس کے مصنف احمد اللہ کے بڑے بیٹے ہیں۔ اور خاندان کے سردار کی حیثیت سے ۱۸۶۵ء میں گھروں سے نکالے جانے کے بعد نظم کا سارا بار انہیں کے سر تھا۔ انہوں نے احمد اللہ کی سزایابی کے بعد خاندان کے مصائب کی داستان فارسی میں نظم کی۔ یہ یونانی دواخانہ پریس الہ آباد میں طبع ہوئی۔ میرے پاس اس نظم کا قلمی مسودہ بھی موجود ہے جو مصنف کے زیر مطالعہ تھا۔

دُرِّ مقال از عبدالحق آردی۔ یہ فارسی میں غزوۂ امبیلہ کی منظوم داستان ہے مصنف نے کئی سال شمالی مشرقی سرحد کے مرکز پر بسر کیے تھے۔ اس کے بعد ستھانہ کے سردار جبار شاہ کے ماتحت کسی عہدے پر مامور ہوئے، اس کے بعد وہیں پیوند خاک ہوئے۔ یہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں تصنیف ہوئی۔ (مہر جلد ۲ صفحہ ۲۵-۲۶) سید جبار شاہ کے مملوکہ ایک نسخہ کا ذکر کرتے ہیں وہ اس کتاب کی اشاعت کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ لیکن اس کا ایک مطبوعہ نسخہ پروفیسر محمد مسلم استاد سینٹ کولمباز کالج ہزاری باغ کا مملوکہ پٹنہ کالج لائبریری کے شعبہ مسودات میں محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حکیم عبدالحمید کے مساعی سے طبع ہوا جن کو اس کتاب کا ایک کرم خوردہ مخطوطہ مل گیا تھا۔ چونکہ بہت سا حصہ ضائع ہو چکا تھا اور خالی حصے صحیح طور پر پُر نہیں کیے جا سکے۔ اس لیے جیسا ناقص تھا ویسا ہی طبع کر دیا گیا[1]۔

---

[1] اصل یہ ہے کہ یہ ناقص مخطوطہ اوکینلی کو کہیں سے مل گیا تھا۔ اس کی اشاعت کے لیے اُس نے ۱۸۹۹ء کے قریب اسے صادق پور بھیج دیا تھا کہ صادق پور کے کسی عالم سے اس کے خلاؤں کو پُر کرا کے مخصوص حلقہ میں اشاعت کے لیے معدودے چند نسخے طبع کیے جائیں یہ کام حکیم عبدالحمید کے ذمہ کیا گیا تھا۔ اپنی طباعی سے انہوں نے جا بجا خلا پُر کر دیا مگر زیادہ حصہ خالی رہ گیا۔ وہی شائع کر دیا گیا۔ مالک مطبع میرے خالو تھے گو میں طفل مکتب تھا ایک نسخہ میں نے خلاف ہدایت ان سے لے کر رکھ لیا تھا (مترجم)

سید احمد اور وہابی تحریک پر غلام رسول مہر کی چار جلدیں جدید ترین اور اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع تالیف ہے۔ یہ چار جلدیں جو دو ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہیں ان کے مطالعہ سے مؤلف کی صبر آزما اور جانفشاں محنت اور خلوص ظاہر ہے۔ پہلی دو جلدیں مسمّے سید احمد شہید ایک ساتھ مجلد ہیں۔ باقی دو جلدیں جماعت مجاہدین و سرگزشت مجاہدین کے ناموں سے موسوم ہیں۔ مؤلف نے جن مآخذ کو استعمال کیا ہے۔ ان میں سے مواد کی ایک کثیر مقدار سے (جن میں سے بعض پر پہلی بار نظر ڈالی گئی ہے) استفادہ کیا گیا ہے مگر معاصر سرکاری دستاویزات پوری طرح کھنگالی نہیں گئیں۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک سے متعلق وہابی تحریک پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ مؤلف نے ۱۸۱۸ء سے ۱۸۴۷ء تک وہابی تحریک کا پورا جائزہ لیا ہے اس زمانے میں ۱۸۵۷ء کی تحریک ایک مہتم بالشان واقعہ تھا اور دوسری تحریک کے پہلو بہ پہلو اس پر بھی بحث کرنا تھی۔ پھر وہابی تحریک کی ناکامی کے اسباب یا مختلف میدانوں میں اس کی خدمات کا کوئی ذکر نہیں۔

ایک پرانے اردو ماہنامہ اشاعتِ سنتِ نبویہ (جلد ۴ ص ۱۱ مورخہ نومبر ۱۸۸۱ء) میں جو مطبع ریاض ہند امرتسر سے طبع ہوتا تھا وہابیت پر کسی گمنام اہل قلم کے تین مقالے شائع ہوئے تھے۔ پہلے دو میں اس دعوے پر کہ سید احمد کے پیرو وہابی ہیں قانونی دلائل سے بحث کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ لوگ فی الحقیقت حنفی مسلمان تھے۔ تیسرے مقالے میں ہندوستان میں وہابی تحریک کی مختصر تاریخ لکھی ہے جو مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے: (۱) ۱۸۲۳-۳۱ء سید احمد کے ابتدائی معرکے۔ (۲) ۱۸۳۱-۴۷ء ولایت علی اور عنایت علی کی کارروائیاں، پنجاب میں ان کی گرفتاری اور پٹنہ میں ان کے اخراج تک (۴) سرحد شمالی و مغربی کو ان کی مراجعت اور مابعد کی کارروائیاں۔

معارف کے پرانے شماروں میں بھی تحریک کے کئی پہلوؤں پر کارآمد مقالے بالخصوص مسعود عالم ندوی کے شائع ہوئے۔

انگریزی مطبوعہ مآخذ میں سے ہنٹر کی "آور انڈین مسلمانس" ایک تنہا قیمتی تصنیف ہے۔ تالیف ہذا میں اس پر علیحدہ بحث کی گئی ہے۔ جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، بمبئی، کلکتہ کی ابتدائی جلد میں بھی قابل ذکر ہیں۔ کلکتہ ریویو میں او کنیلی کے طویل معلوماتی مقالے بھی

اس موضوع کے طالب علموں کے لیے گراں قدر ہیں۔ جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی میں رہاتسیک نے عرب اور ہندوستان میں وہابیت کا ایک عام جائزہ پیش کیا ہے۔ شمالی مغربی سرحد پر وہابی مرکز کے خلاف فوجی معرکوں سے متعلق متعدد تحریریں ہیں، مثلاً ایچ ڈبلیو پیگٹ (کلکتہ ۱۸۶۷ء) کی شمالی مغربی سرحدی قبائل کے خلاف مہموں کی روداد، ایچ ڈبلیو بیلیو (لاہور ۱۸۶۴ء) یوسف زئیوں پر ایک عام رپورٹ، اور کرنل ایڈائی (لندن ۱۸۶۷ء) کی ستھانہ ان کے علاوہ کچھ فوجی حکام کی جنھوں نے وہابیوں کے خلاف مہمیں چلائیں، یادداشتیں اور سرگزشتیں ہیں یہ ساری تحریریں زیادہ تر وہابیوں کے خلاف کش مکش کے عسکری پہلو پر بحث کرتی ہیں۔

اُس زمانے کے انگریزی اور دیسی زبانوں کے اخبارات اور رسائل بھی تحریک کے بعض پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہنٹر نے ۱۸۶۴ء میں انگلش مین اور پایونیر میں عام "محمدنزم" (مسلمانی) اور انگریزی حکومت میں مسلمانوں کی معاشرتی حالت پر کئی مقالے شائع کیے۔ انگلش مین نے ۲ر مئی ۱۸۶۴ء کو مقدمہ انبالہ پر ہربرٹ ایڈورڈ ویز کے فیصلے پر ایک طویل تبصرہ کیا۔ وہابیوں کے خلاف مختلف فوجی مہموں کی روز بروز کی کارروائیوں پر اخبار بنگال ہرکارو میں مضامین شائع ہوتے رہے۔

مآخذ متذکرہ بالا کے جائزے سے ظاہر ہوگا کہ ان کا تعلق زیادہ تر تحریک کی ابتدائی تاریخ (۱۸۳۱ء تک) اور سرحد پر جنگوں سے ہے۔ لیکن یہ کتاب زیادہ تر حکومت ہند اور حکومت بنگال کی اُس وقت کی سرکاری رپورٹوں اور دستاویزوں پر مبنی ہے، جو اس تحریک کے تمام پہلوؤں، اس کے قائدوں، ان کی کارروائیوں اور ان کے خلاف حکومت کے طریق کار اور اقدامات سے متعلق قیمتی معلومات مہیا کرتی ہیں۔ اگرچہ جا بجا ان میں تعصب کی آمیزش بھی ہے، پھر بھی وہ اس موضوع پر نہایت کارآمد اور ٹھوس دستیاب مواد ہیں۔ یہ دستاویزات چھوٹے چھوٹے پرزوں پر یا حواشی پر پنسل سے لکھے ہوئے نوٹوں اور ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودات

لہ یہ فہرست جامع نہیں یہ دکھانے کے لیے کہ ان سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کا تعلق کس زمانے سے ہے، صرف چند اہم تحریرات سے اعتنا کی گئی ہے۔

سے لے کر طویل، موثق اور مطبوعہ یادداشتوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دراصل یہ ایک طرف مقامی افسروں جیسے مجسٹریٹوں، پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور کمشنروں اور دوسری طرف صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے درمیان مراسلات ہیں۔ ان میں کہیں فارسی اور اردو تحریرات یا رسائل کے ترجمے اور اقتباسات ہیں اور کہیں پولیس کے چھینے ہوئے وہابیوں کے نجی مراسلے۔ ۱۸۵۹ء تک یہ ساری دستاویزیں دست نوشتہ پائی جاتی ہیں جو یا تو پلندوں کی شکل میں محفوظ ہیں یا مجلد رجسٹر ہیں۔ لیکن اس تاریخ کے بعد سے وہ حکومت بنگال کی مطبوعہ روداوں کی جلدوں میں شامل ہیں [1]

کاغذات کے نجی ذخیرے بھی خصوصاً خاندان صادق پور کے بعض ارکان کے، کارآمد ثابت ہوئے، احمد اللہ کی گراں بہا لائبریری ۱۸۶۵ء میں خاندان کی اور املاک کے ساتھ ضبط کر لی گئی۔ مگر کچھ کاغذات بچ گئے۔ ان ژولیدہ و بوسیدہ کاغذات کے کریدنے سے کچھ اہم قیمتی دستاویزات کا نشان مل گیا، انہیں میں سے شاہ محمد حسین کی سند خلافت ہے۔ اس سے اہم تر نشانی سید احمد کا ایک مکتوب ہے جو انہوں نے خاندان صادق پور کے کئی ارکان کے نام مشترک طور پر لکھا ہے اور آدمی اور روپے کی وصولی پر تشکریہ ادا کیا ہے۔ اسی میں یہ ہدایت بھی ہے کہ کس طرح روپے سرحد شمالی مغربی کو دہلی کے راستے سے بھیجے جائیں جہاں ان کے ضبط ہونے کا کوئی خطرہ نہیں اس امر کا سید احمد کے کسی اور مکتوب میں ذکر نہیں۔

---

[1] ان دستاویزات کا مفصل ذکر اس کتاب میں جابجا کر دیا گیا ہے۔ اور فہرست مآخذ میں بھی ان کو درج کر دیا گیا ہے (تتمہ)

باب (۱)

وہابی تحریک کی بنا اور اس کے خاص پہلو

پس منظر: عہدِ تحریک میں ہندوستان کے سیاسی سماجی اور مذہبی حالات

مُغل سلطنت کا زوال: اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سب سے بڑا سانحہ سلطنت مغلیہ کا تدریجی انتشار اور پراگندگی تھا۔ آخری باقاعدہ زوال ابھی باقی تھا۔ مگر گزشتہ دو صدیوں سے جو روشنی چمک رہی تھی وہ جھلملانے لگی تھی اور نحوست کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس اختلال و انتشار کی رفتار صدی کے اختتام تک بہت تیز ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اصل مرکز سے تین جدا جدا اور بظاہر آزاد ریاستیں پیدا ہوگئیں۔ سنہ ۱۷۱۳ء میں دکن میں آصف جاہ نظام الملک نے سنہ ۱۷۲۳ء میں اودھ میں سعادت علی برہان الملک نے اور سنہ ۱۷۴۰ء میں بنگال میں علی وردی مہابت جنگ نے اپنی علیحدہ علیحدہ ریاستوں کی بنیادیں ڈالیں۔ ان صوبائی ریاستوں کی بنا اور استحکام سے مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس صورتِ حال نے ملک کے سیاسی میدان میں ایک خلا پیدا کر دیا جس کو پُر کرنے کے لیے تین مختلف متنازع طاقتیں مجتمع ہونے لگیں۔ مرہٹہ۔ سکھ اور انگریز۔ جو قابل اعتناء تھیں۔ اس وقت تک یورپ کی اور طاقتیں سیاسی زور آزمائی کے میدان سے پسپا ہو چکی تھیں اور کم و بیش انگریزوں کی برتری تسلیم کر لی تھی۔ اب انگریزوں کو باقی دو ملکی مدعیوں سے نمٹنا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف اور انیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہندوستان میں سیاست کی ہیئت کذائی یہی تھی۔

جنگِ پلاسی : دوسرا نہایت نمایاں سیاسی پہلو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی عزائم اور طاقت تھا بالخصوص مشرقی صوبہ جات بنگال اور بہار میں۔ دلی اور اس کے اطراف میں نزاع اور بدامنی کے ساتھ سیاسی ترکتاز کا مرکز دھیرے دھیرے مگر باقاعدگی کے ساتھ اس مشرقی حصہ ملک میں منتقل ہوتا جاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آئندہ سیاسی برتری کی بنیاد یہیں رکھی جا رہی تھی۔

نواب علی وردی خاں کی لائق اور نیم خود مختارانہ نوابی کے زیر اثر ان دونوں صوبوں کو مقابلۃً بہت کچھ صلح و امن دور خوشحالی نصیب تھی۔ بنگال سے مالگذاری کی معتد بہ باقاعدہ ترسیل گنتی کے اُن دقیع ذرائع آمدنی میں سے تھی جو متنزلزل مغلیہ سلطنت کے لیے رہ گئی تھی۔ لیکن بعض سیاسی حوادث نے جو ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی پر منتج ہوئے مالی طاقت کا یہ تنہا ذریعہ بھی معرض خطر میں پڑ گیا۔

اس جنگ کو بجا طور پر تاریخ ہند کا ایک یادگار واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا ایک واضح نتیجہ انگریزوں کا ملک میں ایک اہم سیاسی طاقت بن جانا تھا۔ میر جعفر ان کے ہاتھ میں عملاً ایک کاٹھ کا پتلا بن کر رہ گیا۔ اس جنگ کے فوراً بعد نواب کی ریاست کی لوٹ شروع ہوگئی فاتح انگریز بے بس نواب پر ہر قسم کے ناقابل برداشت مالی مطالبات عائد کرنے لگے اور اس کا خزانہ قریب قریب خالی ہوگیا۔ میر قاسم کو مسند پر بٹھایا گیا، زیادہ تر اس لیے کہ اس سے اُمید تھی کہ سابق نواب سے جس مال و دولت کے فراہم کرنے کا بہ جبر وعدہ لیا گیا تھا اور جسے وہ پورا نہ کر سکا تھا، یہ اسے پورا کر دے گا۔ مگر یہ نواب کسی اور خمیر کا بنا ہوا تھا۔ اور انگریز سرپرست کی خواہشات کا ویسا غلام نہ تھا جیسا اُس کا خسر تھا۔ گہری سازشوں اور ڈپلومیٹک گفت و شنید کا ایک سلسلہ جاری ہوگیا جو آخر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں اور ۱۷۶۵ء میں دیوانی حوالہ کرنے پر تمام ہوا۔ اس طرح ایک بار پھر اقتصادی بے چینی اور استحصال کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔

تجارت پر انگریزوں کی اجارہ داری

تجارت کے متفرق اقسام کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور بالعموم انگریز تاجروں کے حق میں مخصوص کر دینا اُس زمانہ کی اقتصادی پالیسی کی نمایاں اقتصادی استحصال سے نہایت مہیب وشدید غربت وافلاس پھیل گیا۔ اٹھارہویں صدی کی مشہور تاریخ بہار وبنگال مظفر نامہ کے مؤلف کرم علی نے اس کے تباہ کن نتائج کو جامع طور پر بیان کیا ہے۔

انگریزوں نے جمہور رعایا کے ایک اور اہم ذریعہ معاش یعنی مختلف اقسام کی اراضی پر بھی ضرب لگائی۔ یہ اراضی کی بازیابی کے لیے مسلسل کارروائیوں سے انجام دی گئی۔ یہ کارروائیاں تدریجی اور ممتد تھیں جو پورے صوبے پر حاوی تھیں اور جن کا مقصد تھا مالگزاری سے مبرا حق تصرف کی بازیابی اور دوبارہ لگان عائد کرنا۔ مغل شہنشاہوں اور صوبائی گورنروں اور دوسرے حکام اعلیٰ نے بہت سی معافیاں دے رکھی تھیں۔ صلے انعامات اور اعلیٰ عہدہ داروں کو تنخواہیں ادا کرنے کا یہ طریقہ عام تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ رعایتیں ایسے وسیع پیمانے پر بخشی گئی تھیں کہ جب انگریزوں نے بہار وبنگال کے مالیانہ کا نظم اپنے ہاتھ میں لیا تو پورے علاقہ کی مالگزاری بہت سے منتقل کر لی گئی۔ بلاشبہ اس کے نتیجے میں بڑا انتشار اور پراگندگی پھیلی۔ بہت سے لوگ جعلی وثیقوں اور سندوں سے معافیوں سے مستفید تھے۔" تاہم انگریز افسران بندوبست نے ایسی اراضی پر لگان لگانے کے جو طریقے اختیار کیے تھے وہ نہایت بے رحمانہ اور بے باکانہ تھے خود ہنٹر کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ" معافیوں کے لیے ہم نے ثبوت طلب کیے مگر جائدادوں کے قبضہ وتصرف سے متعلق کسی واضح قانون کی غیر موجودگی میں وہ اپنی جاگیروں کے حق میں ثبوت پیش نہ کر سکے۔ ان کے وثیقوں اور سندوں کو موسم کی خرابی اور دیمکوں نے غارت کر دیا ہے"[1]

قوانین بازیابی اراضی کے تحت بعض رودادوں کے معائنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض حالات میں جعلی معافیوں کو بجا طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا، مگر بیشتر صورتوں میں کارروائیوں کا مقصد قانون کے ہلکے سے نقاب میں معافی داروں کو بے دخل کرنا ہوتا تھا۔ ایسی کارروائیاں

---

[1] ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب OUR INDIAN MUSALMAN - اور انڈین مسلمان لندن ۱۸۷۱ء

ملک گیر معاشی مصیبت، سماجی انتشار اور سیاسی بے چینی کا باعث ہوئیں۔ ہنٹر نے نہایت رنج و افسوس کے ساتھ تبصرہ کیا کہ ان کے نتیجے میں جو گھبراہٹ اور نفرت پھیلی اس کا نقش دیہی دفتر تاریخ پر ہمیشہ کے لیے قائم ہوگیا[1] اس نے اس زمانہ میں وہابیوں کے خلاف مقدمات کے ذمہ دار افسر جیمس اوکینیلی کی رائے نقل کر کے ظاہر کیا ہے کہ یہ صورت حال مسلم قوم کے تنزل اور بے چینی کا دوسرا سبب تھی، اور بعد میں اسی نے ۱۸۵۷ء کی آتش فساد میں بہار میں ایندھن کا کام کیا[2]

یورپ کی تجارتی کمپنیوں کی آمد نے ملک کے قدیم اقتصادی نظام اور اقتدار کی جڑوں پر کاری ضرب لگائی۔ ان کے ورود نے تجارت کے نت نئے دروازے کھولے۔ پھر اس نے ایک جدید تاجر طبقے کو جنم دیا۔ اس مال دار، حریص اور ڈھیٹ طبقہ نے پرانے طبقہ شرفا (جو سماج کے مختلف طبقات میں ایک مدت سے عزت آبرو کے مالک تھے) کے اخلاف و ورثا کا مقابلہ کیا۔ سماجی امتیاز کا معیار خاندان نہیں بلکہ دولت پایا۔ اس نئے تجارتی طبقہ کے مفاد انگریزوں سے وابستہ اور اکثر و بیشتر انہیں پر دار و مدار رکھتے تھے اس لیے وہ اپنے محسنوں کے مفاد میں کام کرتے تھے یہاں تک کہ اپنے قومی مفاد کو بھی ان کے مفاد پر قربان کر دیتے۔ بنگال کے سیٹھوں کا خاندان اس حقیقت کی ایک مثال ہے۔ اس زمانہ میں یہ صورتِ حال ملک کی تاریخ پر بدنما دھبوں میں سے ایک ہے۔

اخلاقی انحطاط

یہ ایک تکلیف دہ اور قلب ہیئت کا زمانہ تھا جب کہ وسطی معاشرہ مر رہا تھا اور جدید عہد اس کی جگہ لینے والا تھا۔ اس زمانہ میں وہ تمام معاشرتی زوال و تخریبات رونما ہوئیں جو اس حالت کا لازمہ ہوتے ہیں، تمام اخلاقی اقدار پاؤں تلے کچل دیے گئے۔ ذاتی عیش و عشرت اور مقامی اعزاز کی خاطر عظیم قومی مصالح ٹھکرا دیے جاتے۔ مستقبل تاریک اور برے شگونوں میں آلودہ نظر آتا تھا اس لیے ہر شخص اس فکر میں رہتا تھا کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ

---

[1] ایضاً ص ۱۸۲

[2] کے کے دتا کی کتاب سیرۃ کنور سنگھ و امر سنگھ۔ پٹنہ ۱۹۵۷ء۔ ص ۹۱-۹۲

اٹھالے۔ ایک اوسط درجہ کے شریف آدمی کی زندگی کے لیے تعیش، مے نوشی اور رقص وسرود کی محفلیں لازمی جزو بن گئی تھیں، اور ان سے ادنیٰ تر طبقوں میں بھی ان سے نسبتاً پست تر پیمانے پر ان کی تقلید کی جاتی تھی۔ اُس زمانہ کی ادبیات بھی جن کی کثیر مثالیں ہمارے سامنے ہیں کاہلی اور عیاشی کے مروجہ عواطف ومیلانات مہیا کرتی تھیں۔ ہاں یہ یاس انگیز تصویر ذرا مدھم پڑ جاتی تھی تو اس حقیقت سے کہ اگلے زمانے کے کچھ لطیف جذبات جیسے جرأت ودلیری وفاشعاری اور شعور عزت وآبرو اب بھی لوگوں میں موجود تھے۔ اگرچہ اُن کا نشو ونما غلط طریقوں پر ہوتا تھا۔ چنانچہ دلیری معمولی معمولی جھگڑوں، خانہ جنگیوں پر، وفاداری چھوٹے چھوٹے مقامی معاملوں پر، استقلال واستقامت فرسودہ اور تباہ کن رسم ورواج سے چپٹے رہنے پر، سیر چشمی اسراف پر اور علم ودانش قدیم ذخیروں میں جدید معلومات کا اضافہ کرنے کی بجائے پرانے پرانے متنوں کی طویل الذیل شرحیں لکھنے پر صرف کی جاتی تھی۔

اشاعتِ اسلام میں صوفیائے کرام کا حصّہ

اس زمانے کی مذہبی زندگی اور بھی حسرت ناک تھی۔ ہندوستان میں اسلام کا نشو ونما زیادہ تر اگلے صوفی درویشوں کی جانفشانیوں کا نتیجہ تھا۔ ان کی جدوجہد کا سنہرا زمانہ چودھویں اور پندرھویں صدی تھا جب کہ ان خود فراموش بے غرض پرجوش مبلّغوں کے گروہ اپنے دین کی تبلیغ واشاعت کے لیے تمام ملک میں مارے مارے پھرتے۔ ان کے اخلاقی اور زاہدانہ طرز معاشرت، ان کی وسعت قلبی، انسان دوستی، محبت، خلق اور عوام کے مفت معالجہ واعانت نے دلوں پر قبضہ کرلیا اور مقامی باشندوں کی ایک کثیر تعداد کو ان کا معتقد بنادیا۔ یہ مبلّغین بڑے وسیع النظر تھے جن کی مثالی زندگی اور مخلصانہ خدمات ان کے دین کے اختیار کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنے میں بڑا حصہ رکھتی تھیں۔

امتداد زمانہ کے ساتھ وہ بھی رخصت ہوگئے۔ ان میں سے بعض کے نام پر صوفیانہ طریقے اور خانقاہیں قائم ہوگئیں۔ بیش قرار فیاضانہ عطیات سے یہ مرکز مالدار ہوگئے۔

اور صوفیوں کا سابق مبلغانہ جوش اور خدمت خلق کی سرگرمی بہت کچھ ٹھنڈی پڑ گئی۔ یہ خانقاہیں ہی تھیں جو اپنے ساتھ سامان اور رسومات کے ساتھ زیر نظر عہد میں ملک کی دینی زندگی پر حاوی تھیں۔

مذہبی بے راہروی

مختلف صوفیانہ طریقوں اور خانقاہوں کی تعلیمات کا ایک لازمی جزو معرفت و وصال حق کے لیے بیعت و ارادت کا اصول ہے۔ کسی پیر طریقت کے بغیر ان میں سے کوئی مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ مرشد پر کامل توکل اور تکریم اپنی جگہ کوئی بری بات تو نہیں مگر یہ اکثر غیر معقول حد تک عمل میں لائی جاتی تھی۔ وہابیوں نے اسے روحِ اسلام کے منافی قرار دیا جو پیغام الٰہی کو براہِ راست سمجھنے کے اصول پر زور دیتی ہے جو ارشاد قرآنی پر مبنی ہے اور جس کی توضیح و تکمیل احادیث صحیحہ سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ اسلام کے یہ دونوں ستون حدیث اور قرآن عربی میں تھے۔ جمہور اہل ہند اس زبان سے ناواقف تھے۔ اس صورتِ حال نے عوام الناس کو علماء کا محتاج بنا رکھا تھا۔ ہندوستان میں قرآن مجید کا پہلا فارسی ترجمہ مشہور حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ) نے کیا۔ حدیث اگرچہ ہندوستان میں اس سے بہت پہلے رونما ہو چکی تھی۔ لیکن حضرت عبدالحق (محدث دہلوی) نے سولھویں صدی ہی میں اسے روشناس کر دیا تھا۔

قوم کی دینی سماجی زندگی کے بعض حالات جو اُس وقت صورت پذیر تھے کتاب صراط مستقیم میں اور احوال کے ساتھ یوں واضح کیے گئے اور ان پر سختی سے تنقید کی گئی ہے :-

(۱) "صوفی لباس میں ملاحدہ کی بدعات میں جو اس زمانہ میں جاری ہو گئی ہیں ایک خدا کی شان اور اس کے احکام سے متعلق کلمات کفر کا استعمال ہے۔ طالب حق کو ان کے زبان پر لانے اور سننے سے پرہیز کرنا چاہیے اگرچہ ان کا کہنے والا نیکوکار آدمی سمجھا جاتا ہو اور خود بھی ایسے کلمات زبان پر نہ لانا چاہئیں۔ ایسی بے لگامی کبھی کوئی اچھا نتیجہ نہیں دکھا سکتی۔"

(۲) طریقہ وجودیہ[1] کے ملاحدہ کی دوسری بدعت جو لوگوں میں پھیل گئی ہے اور جو

---

[1] صوفیوں میں وجودیہ اور شہودیہ دو نمایاں گروہ ہیں۔ ہندوستان کے (باقی صفحہ ۱۴۱ پر)

صوفی طریقوں کے بڑے بڑے مرشدوں کے اقوال کے مطابق بتائی جاتی ہے وہ توحید وجودی یعنی وحدت الوجود کا ملحدانہ قول ہے۔ یہ صوفیہ اپنے آپ کو خدا کا جزو لاینفک یا واصل بخدا سمجھتے ہیں اور اس اتحاد و وسائل سے لذت کا احساس کرتے ہیں۔ وہ شیطان کے فریب یا خود فریبی سے اپنے آپ کو حقیقت آلہیہ کے باطنی علم کا امر شناس سمجھتے ہیں اور بیہودہ بکواس میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔"

(۳) ملحد صوفیوں کی ایک اور بدعت جو عام طور پر مسلمانوں میں پھیل گئی ہے وہ قضا و قدر کے مسئلہ پر بحث ہے۔ تقدیر پر اعتقاد دین اسلام کے اہم اعتقادات میں سے ہے اور شریعت کی رو سے واجب التسلیم ہے۔ اس لیے اس مسئلہ پر بحث و تحیص ناواجب ہے شریعت نے اس باریک اور عمیق موضوع پر مباحثہ سے منع کیا ہے' اس لیے تمام مسلمانوں پر اس کو کلیتہً مان لینے پر اکتفا کرنا اور اس سوال کی کرید میں طوفانی موجوں میں کودنے سے پرہیز کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔

(۴) صوفی مشرکوں کی بدعات میں سے جو ہمارے زمانہ میں بالخصوص ہندوستان میں رائج ہیں وہ انتہائی تعظیم ہے جو مرشد کے لیے اس حد تک بجالائی جاتی ہے کہ اسے درجہ خدائی یا نبوت تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس بارے میں معتدل حدود کو سمجھنا ضرور ہے۔ ایک مرشد بے شک راہِ خدا کو پہچاننے کا ذریعہ ہوتا ہے اور کسی رہبر و مرشد کے بغیر اس راہ حق کی دریافت مشکل سے ممکن ہوتی ہے۔ مگر مرشد ایسا ہونا چاہیے جو شریعت کے خلاف کوئی کام نہ کرے یعنی قرآن وحدیث پر پختہ ایمان کے ساتھ راہِ حق پر گامزن ہو[۱]"

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰) زیادہ تر صوفیہ وجودیہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ خدا کے وحدت الوجودی عقیدہ سے کسی قدر ملتا جلتا عقیدہ ہے۔ یہ ہمہ اوست کے قائل ہیں یعنی ہر شے خدا ہی ہے۔ دوسرے گروہ کا عقیدہ ہمہ از اوست ہے۔ اول الذکر کا عقیدہ ہے کہ خدا جزو اً ہر شے میں موجود ہے آخرالذکر خالق و مخلوق کے وجود میں امتیاز کرتا ہے۔

[۱] صراط مستقیم ص ۵۲-۵۳، ۵۷ تا ۶۱

(وہابی عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل فریضہ قرآن حدیث اور شرع کا اتباع ہے مرشد کا اتباع اسی حد تک کرنا چاہیے کہ اس کے اعمال شرع کے مطابق ہوں)

(۵) صوفی مشرکوں کی بدعات جو عوام کی نظروں میں خیر معلوم ہوتی ہیں ان میں سے ایک پرہیزگار اور نیکوکار بزرگوں کی قبروں پر بے ہودہ رسوم ادا کرنا ہے۔ اسی سلسلہ میں مُردوں سے اعانت اور مرادیں مانگنا ہے ایسی التجاؤں سے لوگ شرک میں آلودہ ہو جاتے ہیں..... اللہ تعالیٰ نے واجب کر دیا ہے کہ ہدایت وارشاد کا سلسلہ جاری رہے اور فیض انہیں سے حاصل کرنا چاہیے جو زندہ ہیں۔ اگر ایسا اتفاق ہو کہ کسی کو اپنے مقصد کے لیے کوئی زندہ شخص نہ ملے اُسے مزارات کی جاترا کے عوض قرآن وحدیث کی پیروی کرنا چاہیے جو تمام باریک مسائل کی کنجی ہیں۔"

(۶)" صوفی مشرکوں کی بدعات میں سے جو مسلمانوں کے ہر طبقے اور عوام الناس میں جاری ہیں نذر و نیاز بھی ہے (یعنی مُردوں کی رُوحوں کو آرام دینے کے لیے اشعار خوانی اور کھانے کی چیزیں چڑھانا) یہ شرک والحاد کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اصولاً یہ جائز ہے اور اس کی صحیح بجا آوری شریعت پر مبنی ہے، عوام الناس نے اپنے تصورات و تعصبات اس میں ملا جلا دیے ہیں، اور اخلاف نے نہ صرف اسلاف کی پیروی کی ہے بلکہ جو چیزیں پہلے سے موجود تھیں ان پر اضافہ کر کے حدود سے تجاوز کیا ہے۔ اس طرح اصول حسنہ پسِ پشت ڈال دیے گئے اور ان کی مذموم فروعات جو کاوش سے گھڑ لی گئی ہیں چل پڑی ہیں۔"

مکروہ رسوم ورواج

کچھ سماجی رسوم ورواج بھی جو اُس وقت جاری تھے بیان کیے گئے اور ان پر تنقید و تعریض کی گئی ہے۔

"شادی اور غمی کے مواقع پر جو مکروہ رسوم ہندوستان میں جاری ہیں ان کی جڑیں اتنی گہری اور مضبوط ہیں کہ طنز و تشنیع اور دشنام طرازی کے خوف سے ان کا اکھیڑنا نہایت دشوار کام سمجھا جاتا ہے۔ جہاں ان رسوم کو فرائض کی ادائیگی سے زیادہ اہم اور ان کے ترک کو شریعت کے ممنوعات و محرمات سے زیادہ دشوار سمجھتے ہیں۔ مثلاً ختنہ کے موقع پر جو دھوم

دھام منائی جاتی ہے۔ اس پر اتنا کثیر روپیہ صرف ہوتا ہے کہ اکثر ختنے ملتوی کر دیے جاتے ہیں اور جب ختنہ ہوتا ہے تو بچہ کافی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک شرمناک اور بے ہودہ بات ہے۔ اسی طرح منگنی اور شادیوں میں التواء ہوتا رہتا ہے۔ شادی میں زیادہ تاخیر سے ایک نوجوان کے لیے گناہ میں ملوث ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ غمی میں تو زیادہ التواء کی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔ لیکن قبروں کی تیاری اور تجہیز و تدفین کے رسمی افعال میں اتنی تاخیر ہو جاتی ہے کہ دوسرے ضروری کاموں میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ مرنے کے تیسرے اور چوتھے دن کے رسوم میں زر کثیر صرف کیا جاتا ہے۔ معاشرہ کے طنز و تشنیع اور دشنام کے خوف سے عوام اس حد تک مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان رسوم کی بجا آوری کی خاطر ان کو اپنی جائداد فروخت کرنا پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص نماز میں غیر حاضری سے اتنا ملزم نہیں ٹھہرایا جاتا جتنا کسی عرس کی غیر حاضری سے یا کسی شادی کی محفل رقص و سرود سے۔"
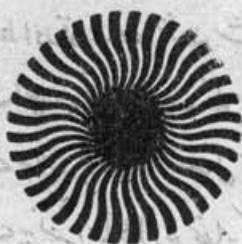
(ب) ہندوستان میں وہابیت کی بنا و ارتقاء

وہابیت کی بنا اور ارتقاء کو صحیح عینک سے دیکھنے کے لیے ہمیں ذرا پیچھے ہٹنا اور اسلام کے بعض نمایاں پہلوؤں، عہد بعہد ان کے ارتقاء اور اٹھارہویں صدی میں اسلامی دنیا پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا ہوگی۔

اسلام ایک طرز زندگی ہے جو ایک فرد اور جماعت کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے وہ محض رسوم و عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک طرز معاشرت پیش کرتا ہے اسلام قبول کرنے کے معنی ہیں اپنی روح اور روزمرہ زندگی کی تربیت و تہذیب، لفظ اسلام کے معنی ہیں (خدا کی مرضی پر) سر جھکا دینا اور فرمان بجا لانا۔ شروع شروع میں اصول اسلام ڈھیلی اور سہل زندگی میں جس سے قبل اسلام کے عرب خوگر تھے ایک عظیم تغیر رونما ہوا اور اس میں ایک حد تک اندرونی ضبط اور قوت برداشت شامل تھی۔ مگر جن لوگوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب تھی اور آپ کے مقرب صحابہ نے جو آپ کے اسوۂ حسنہ کے سرچشمہ سے سیراب ہوئے یہ تغیر پورا پورا قبول و اختیار کر لیا۔ جن لوگوں نے آپ کی پیروی کی ان میں بدقسمتی سے یہ تغیر اتنا کامل نہ تھا۔ کچھ قبل اسلام کے اور غیر اسلامی میلانات ان کے اندر کش مکش کرتے رہے اور آخر میں سطح پر آ گئے۔ یہ میلانات طرح طرح سے ظہور پذیر ہوتے رہے اور سلطانی طرز حکومت کی آرزو عربوں کے خلاف جو قرون اولیٰ میں اسلام کے مشعل بردار تھے نسلی و قبائلی ردِ عمل کی شکلوں میں اُبل پڑے۔

ایرانی اور ترک اثرات

اسلام کی سیاسی سرحدوں کی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ عربوں کی مڈبھیڑ غیر عرب اقوام اور مختلف نئی تہذیب و تمدن سے ہوئی۔ نئی نئی تہذیبی روایات کے انجذاب سے اس ابتدائی عہد میں اسلام کی روح

اور ترقی پر ایک گہرا اثر پڑا۔ اس لحاظ سے عربوں پر مادی طور پر خوشحال اور تمدنی طور پر ترقی یافتہ ایرانیوں کا اثر نہایت مہتم بالشان ہے۔ خلافت عباسی کے دور میں بہت سی ترقیات میں ایرانی اثر کے نشانات صاف نمایاں ہیں۔ ایک مکتبہ فکر کے مطابق تصوف جو ہندوستان کی دینی زندگی پر بھی چھایا رہا ہے ایرانی اثرات کے باعث تھا۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ایک اور اہم حادثہ سیاسی اقتدار کا عربوں سے ترکوں میں منتقل ہونا تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی میں جب اسلام ترکوں کے وطن وسطی ایشیا تک جا پہنچا تو انھوں نے اسلام قبول کر لیا نسبتہً تازہ تھا۔ اسلامی حکومت کے صدیوں کے دور میں عربوں میں جو کامل تغیر عادات وکردار پیدا ہو گیا تھا وہ ترکوں کے لیے ناممکن تھا۔ ایک زبردست نسلی ملت کی حیثیت سے ترکوں نے سیاست اسلام کی ڈوبتی ہوئی ناؤ تو منجدھار سے نکال دی لیکن اسلام کا روحانی و اخلاقی زخم ویسا کا ویسا ہی رہا اور مندمل نہ ہوا۔

اسلام ہندوستان میں ترکوں ہی کے ذریعے سے پہنچا۔ ان سے پہلے سندھ پر عربوں کے حملے جو بالکل بے نتیجہ تو نہ تھے ہندوستان کی مغربی سرحدوں تک ہی پہنچ کر رک رہے تھے۔ ان سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اسلام کے سیاسی فاتحین عرب نہ تھے بلکہ نومسلم ترک ہی تھے۔ اس لیے جو اسلام ہندوستان میں داخل ہوا وہ صرف یہی نہیں کہ غیر عرب اثرات سے متاثر ہو چکا تھا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ تھا کہ ہندوستان میں اس کا مقابلہ ایک ایسی مستحکم و منتقل تہذیب وتمدن سے ہوا جو نمایاں طور پر اس سے مختلف ومتضاد اور بہت زیادہ قدیم تھا۔ جب جنگوں کی گرد بیٹھ گئی تو ہندی و اسلامی تہذیب وتمدن کے درمیان باہمی تاثیر وتاثر عمل میں آنا شروع ہو گیا۔ اس لین دین کا صحیح گوشوارہ تیار کرنا تو دشوار ہے مگر اتنا واضح ہے کہ ہندوستان میں اسلام نئے ماحول سے بہت متاثر ہوا۔

مغل حکمرانوں کی دین سے بے نیازی

یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے اگرچہ اس کی کوئی معقول بنیاد نہیں، کہ ہندوستان کے مسلم حکمران اسلام کے حامی تھے اور اس کی اشاعت میں ان کا بہت کچھ ہاتھ تھا مگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ایک دینی حکومت کی کچھ رسمی نمائش اور ٹیم ٹام اور کسی

فوجی یا دوسری مصلحت سے کبھی کبھار اس پہلو کو نمایاں کر دینے کے باوجود درحقیقت سلطنت کی پالیسی خالصتہً سیاسی، لشکری یا دوسرے مصالح سے بنتی اور چلتی تھی۔ مغل سلطنت کے عروج و علو کے زمانے میں بھی مغل سلاطین خصوصاً اکبر کی مذہبی پالیسی کے بعض پہلوؤں سے نمایاں نارضامندی اور بے چینی کا احساس عام تھا۔ یہ بے چینی تنگ نظری کی بنا پر ہو سکتی ہے مگر تھی ضرور۔ یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ اسلام اپنی اصلی لنگر گاہ سے بہت کھسک گیا ہے اور اس کے اصلاح و احیاء کی ضرورت ہے۔ اور مذاہب کی طرح اسلام بھی ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی احیائی و اصلاحی تحریکوں میں اپنا حصہ رکھتا تھا۔ احیائی حرکت میں سب سے پہلے مسیح موعود کے ظہور کا عقیدہ شامل تھا جو زمانہ کے موجودہ سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مفسدات کا قلع قمع کر دے گا اور اسلام کو اس کی اصلی شان و شوکت پر لوٹا لائے گا۔ ایسی بعض تحریکوں میں اکثر سیاسی مقاصد بھی ملے جلے ہوتے تھے۔

حضرت مجدّد الف ثانی کی دینی خدمات

پہلا شخص جس نے اصلاح و احیائے دین کا جھنڈا ہندوستان میں بلند کیا سید احمد سرہندی تھا یہ مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور ہیں اور اکبر کے معاصر تھے۔ ہمیں ان کے دینی خیالات و نظریات کی تفصیلات سے یہاں بحث نہیں۔ پھر بھی ان کے بعض خیالات کا محض خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی مذہبی زندگی کا مرکزی نکتہ تصوّف تھا جس کا لوگوں کی زندگیوں اور دماغوں پر انتہائی تسلط تھا۔ تصوّف ایک مشرب ہے جو خدا سے رابطہ اور اس کی معرفت کے لیے باطنی جذبات کو بیدار کرنے کے عقیدے پر مبنی ہے یہ شریعت کے باطنی اور اندرونی پہلو پر زور دیتا ہے۔ خدا سے ربط و وصل طریقت پر چل کر کیا جا سکتا ہے جو روحانی ہدایت کے کئی مقامات پر مشتمل ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ طریقت نے شریعت سے زیادہ وقعت حاصل کر لی اور ہمہ اوست کا عقیدہ جو وحدت الوجود کے مشہور نظریہ کی شکل میں ہوا زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ حضرت مجدّد نے اس حقیقت پر زور دیا کہ باری تعالےٰ اپنی ذات سے موجود اور ظاہر و ثابت ہے۔ باقی تمام کائنات اس کی پیدا کردہ مخلوق ہے اور یہ کہ نجات خدا سے

رابطہ پیدا کرنے کے باطنی طریقوں کی بجائے شریعت کی پیروی سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ شریعت سے عالم بے اعتنائی اور روگردانی علماء کی چشم پوشی و غفلت کا نتیجہ ہے۔ ان کے ایمان و اعتقاد میں زور اور ہمت نہیں، اور اپنے سیاسی آقاؤں کو ان معاملات میں جن سے ان کی ذاتی راحت و عافیت کا تعلق ہے بہت کچھ ڈھیل اور آزادی دے رکھی ہے۔ اور یہ فعل قرآن و حدیث کے الفاظ کو نئے معنی پہنا کر، اور بدعت حسنہ کے نام سے نئی قسم کی بدعات جاری کر کے ممکن بنایا گیا ہے، جو بدعت ہوتے ہوئے بھی معصیت نہیں اس لیے جائز قرار دی گئیں۔ حضرت مجدد کی نظر میں بدعت بدعت ہی ہے۔ اس میں مدارج قائم کرنے کی گنجائش نہیں۔ حضرت مجددؒ اس معاملہ میں بہت متشدد تھے اور ان کے مکتوبات میں اس کا بہت ذکر ہے۔

سید احمد سرہندیؒ کا طریقہ کار ان کے زمانہ کے حالات سے متاثر و محدود تھا۔ ان کی جدوجہد انفرادی تھی۔ انہوں نے اپنی تمام تر طاقت مذہبی رسالوں کے لکھنے اور اپنے زمانے کے سربرآوردہ معاصرین سے مراسلت تک مرکوز رکھی۔ جدید ذرائع آمد و رفت و مراسلت کے فقدان اور غالباً وسیع تر مخالفت عوام کے عدم احساس نے ان کو بڑے پیمانے پر کسی عوامی تحریک کے قائم کرنے اور چلانے سے باز رکھا۔ مگر ایسے موانع کے باوجود ان کی تحریک نہایت معنی خیز تھی۔ اس نے پہلی بار طوفانی بہاؤ کو روک دیا اور ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے سیاسی عروج و سربلندی کے زمانے میں بھی جب کہ اس کی رگوں میں جوانی کی تیز نبض تڑپ رہی تھی۔ اسلام کے احیاء و اصلاح کی ضرورت کا اعلان کر دیا۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات اور مساعی کو کسی قدر بسط سے بیان کیا گیا اس لیے کہ وہ بہت حد تک اس تحریک کے مماثل ہیں جس کی دو صدی بعد ان کے ہمنام سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بنیاد رکھی۔ حضرت مجددؒ کے کاموں اور مساعی کو ان کے بیٹے اور خلفاء نے جاری رکھا۔

۶

حضرت شاہ ولی اللہ

بہر حال ان کے اصلی مشن کو شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے ہاتھ میں لیا جو اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے ذہنی سورماؤں میں سے تھے۔ اس صدی میں دو عظیم معاصر سلطنتوں، عثمانیہ اور مغلیہ کا عام زوال شروع ہو چکا تھا۔ اس زوال نے زمانہ کے بعض مسلم حقیقت شناس علما کے دماغوں کو اس مرض کے اسباب کی جستجو کی طرف مائل کر دیا۔ ان میں عرب کے محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے شاہ ولی اللہ نمایاں تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ابتدائی جمہوری روایت اسلامی کے برخلاف شہنشاہی طرزِ حکومت کا نفاذ اور اجتہاد کا اختتام اس افسوسناک صورت حال کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ انہیں دو علتوں نے مسلمانوں میں من حیث القوم خیالات کی آزادی اور نکتہ پردازی کو ماؤف کیا۔ اسلام بنی نوع انسان کو طرح طرح کی عدم مساوات سے نجات دلانے کی ایک انقلابی تحریک کے عوض کچھ بندھے ٹکے عقائد و رسوم میں منتقل و پابند ہو کر رہ گیا۔ ان کے خیال کے مطابق اسلام کی پوری عمارت کی تعمیر تو ہوئی تھی اس کے پیروؤں کے کردار و صفات پر، جو آگے چل کر قرآن و حدیث پر مبنی اخلاقی و روحانی اصول کے تابع ہو گئی۔ یہ عالی خیال بلند نظر و شائستہ افراد بنی نوع انسان کی ایک اخوت کے لیے ایک زبردست اور مضبوط نظام میں متحد و مجتمع ہو گئے۔ اعضائے رئیسہ میں جب فتور ہو گیا تو سارا جسم مضمحل اور ضعیف ہو گیا تھا۔ ان حالات میں سیاسی انحطاط اور معاشرتی تنزل لازمی تھا۔ اس لیے صرف اعلیٰ طبقہ کے چند افراد پر زور دینا کافی نہ تھا بلکہ من حیث المجموع پوری ملت کی اصلاح پر زور لگانا تھا، اسی لیے ایک ہمہ گیر عمومی تحریک کی ضرورت پیش آئی۔ فکر و خیال کی اہم پرواز و حرکت معنی خیز اور قابل غور ہے۔ اُس زمانہ کے اور حالات سے بھی اس احساس کی تائید ہوئی۔

میر قاسم و ٹیپو سلطان

اسی زمانہ میں سیاسی سمندر میں مسلم سیاسی عمائدین ورڈوبتا کی ڈوبتی ہوئی کشتیوں کو پھر ابھارنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ بہار میں میر قاسم اور دکن میں ٹیپو سلطان اپنی اور فرو گزاشتوں کے باوجود اس

سیاسی احیاء کے زندہ نمونے تھے۔ ان دونوں نے متفق الرائے ہو کر انگریزوں سے ان کے اعلیٰ فوجی نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی اپنی فوجوں کو مغربی طرز پر تربیت دلانے اور آراستہ کرنے پر زور دیا۔ مگر انھوں نے یہ نہیں سمجھا کہ کوئی فرد خواہ کیسا ہی ہمت ور مگر ایک ایسے گروہ کا سردار ہو جو نامنظم ہو اور کسی فرد کا وفادار ہو نہ کہ کسی اعلیٰ مقصد کا، اس قوم کے مقابلے میں جو اعلیٰ تنظیم رکھتی ہو اور ایک قومی مقصد کے جوش سے سرشار ہو، اس کی ناکامی لازمی ہے۔ ان کی ناکامی ان کی ذاتی کوتاہیوں کے سبب سے نہیں تھی۔ اصلی اسباب بہت گہرے اور دور رس تھے، اور وہ تھے ہندی مسلم معاشرہ کی تمام معاشری دینی جڑوں کو گھن لگ جانا۔ سیاسی کش مکش کی جو شاہی طبقہ کی سربراہی میں چل رہی تھی، ناکامی نے عوام کی توجہ شاہی سرداری سے ہٹا کر دینی احیاء و اصلاح اور ملت کی تنظیم نو کی طرف منعطف کر دی۔

یہ تھا اس تحریک کا سیاسی، سماجی اور دینی پس منظر۔ اس تحریک کے پیچھے عام معاشرتی مذہبی زوال اور سیاسی طاقت کا غیر مسلموں کے ہاتھوں میں چلا جانا اس تحریک کے سر اٹھانے کے وہ اسباب تھے۔ دراصل اس تحریک کے لازمی پہلو معاشرہ کا سدھار اور "یورپی کفار" سے آزادی کی بازیابی تھے [1] ان میں سے ایک کے حصول کے لیے مضرت رساں مذہبی بدعات سے احتراز اور دوسرے کے لیے جہاد کی طرف رجوع کرنا ضروری تھا جس کے فوائد اور برکات کا بار بار اعلان کیا گیا۔ اس جہاد کو بہر حال عام کش مکش اور جد وجہد کے وسیع مفہوم میں سمجھنا چاہیے نہ کہ دینی مفہوم میں۔

[1] مکتوب سید احمد شہید از مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی ص ۱۲۹

(ج) وہابیت کی کچھ نمایاں خصوصیتیں

سید احمد کا طریقہ محمدی اس زمانہ میں تصوف کے چار متعارف و مستقل طریقے رائج تھے۔ چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ[1]۔ سید احمد بریلوی بیعت لینے کی ایک جدید ترکیب پر کاربند تھے۔ پہلے مذکورہ طریقوں پر پھر محمدی طریقے پر جو انہوں نے خود مقرر کیا تھا بیعت لیا کرتے۔ وہ اس کی تشریح یوں کیا کرتے کہ شریعت کے دو پہلو ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ باطنی پہلو روحانی راحت کے حصول کے لیے روح کی تربیت و تادیب سے تعلق رکھتا ہے، اور مذکورہ صوفی طریقے ہی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ظاہری پہلو انسان کی روزمرہ کی زندگی میں صحیح اور دینی کردار بجا لانا اور محمدی طریقہ اسی کی نگہداشت کرتا ہے۔ اس طرح ان دونوں طریقوں میں بیعت لینا روح کی باطنی تربیت اور روزمرہ کے کام کاج، دونوں پر محیط و مشتمل تھا۔ اس انوکھے طریقہ بیعت کی تشریح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ صوفیانہ طریقے اگرچہ ابتداء کی سرمستی و سرشاری سے معرّا ہو چکے تھے پھر بھی عام دماغوں میں ان کی جڑیں گہری تھیں۔ لوگ انہیں طریقوں پر بیعت کے خوگر تھے۔ ان کا یک بیک ترک کامل ایک غیر عملی یا اَن ہونی سی بات ہوتی۔ طریق محمدی میں جو صحیح طرز معاشرت ملحوظ رکھا گیا تھا اس کی تفصیلات خود صراط مستقیم اور مختلف وہابی تحریروں میں کافی شرح و بسط سے درج ہیں۔ ان میں سے دو اصول بہت نمایاں ہیں۔ باری تعالیٰ پر جس کی صفات اشارۃً بھی کسی مخلوق سے منسوب نہیں کی جا سکتی ہیں۔ سختی سے بلا شرط و قید ایمان رکھنا اور اپنی شخصی زندگی میں عملی اخلاق پر کاربند رہنا۔

اصلاحی تحریک یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ سید احمد شہید نے جس وہابیت کا پرچار کیا تھا وہ کوئی علیحدہ مذہب نہ تھا جیسا

---

[1] نقشبندیہ کی ایک شاخ حضرت مجدد کی نسبت سے مجددیہ کہلاتی تھی۔

کہ بعض انگریز مصنفوں بالخصوص ہنٹر[1] نے اشارہ کیا ہے۔ وہ بار بار وہابی تحریک کو ایک مذہب بتاتا ہے جس کا پیغمبر سید احمد اور جس کا نیا قرآن صراط مستقیم ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہابیت دین اسلام میں خرابیوں کی اصلاح اور اس کی اگلی شان و عظمت کی بازیابی کی کوشش کے عوض ایک نیا مذہب ہے۔ جیسا کہ نابیور[2] — NIEBUHR اور ہنٹر نے غلط اشارہ کیا ہے۔ سید احمد بریلوی اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کوئی بھی پیغمبری کا مدعی نہ تھا یہاں عرب وہابیت پر اس کے بانی کے کردار سے متعلق ایک مستند مورخ (جے بی فلبی کی ARABIA مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۴۵ سے) کے تبصرہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا "محمد بن عبدالوہاب کی یاد اب تک ایک عرفی نام سے زندہ ہے جو اول اول اس کے مخالفین نے تحقیراً مشہور کیا اور بعد میں اس کے متبعین نے قبول کر لیا۔ گو آج تک وہ اپنے آپ کو اس نام سے موسوم نہیں کرتے، وہ اس مقصد کے لیے جس کی اس نے بنا ڈالی تھی اور اب تک زندہ ہے پچاس سال کی انتھک محنت و جانفشانی کے بعد وفات پا گیا۔ اس نے جس مشرب کی تعلیم دی اسے اسلام کی کوئی نئی تاویل قرار نہیں دیا۔ اس معلم نے کبھی پیغمبری کے رتبہ کا دعویٰ نہیں کیا۔" اگر محمد بن عبدالوہاب پیغمبر نہ تھا تو سید احمد تو اور بھی یہ رتبہ نہ رکھتے تھے۔

وہابی تحریک کی تعلیمات

وہابی اور مسلمانوں سے حقیقتاً مختلف نہیں۔ سوا اس کے کہ وہ بعض چیزوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

(۱) توحید۔ خدا موجود بالذات اور تمام کائنات کا خالق ہے۔ وہ اپنی صفات میں لاشریک ہے۔ روحانی بلندی اور نجات قرآن اور شریعت کے احکام کی پوری پوری بجاآوری

---

[1] "OUR INDIAN MUSALMNS" مولفہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر صفحہ ۵۱-۵۲

[2] CARSTEN NIEBUHR ڈنمارک کے ایک سائنسی مشن کا جدہ اور یمن میں سربراہ تھا۔ ۱۷۶۴ء میں یورپ واپس آ کر "تشریح" کے نام سے ایک کتاب شائع کی پہلا یہ یورپی ہے جس نے وہابیوں کے ظہور اور ترقی کی خبریں شائع کیں۔

میں مضمر ہے نہ کہ خدا کے وجود میں مخلوط ہو جانے کے متصوفانہ جذبات کے اُبھارنے میں۔

(۲) اجتہاد۔ مسلم کو جو حق تاویل دیا گیا ہے وہابی اس کے قائل ہیں اور اس حق پر عمل کرنے کی مصلحت پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چاروں بزرگ اماموں (امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام ابو حنیفہ) کے پیرو عملاً اس حق سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ محمد بن عبدالوہاب نے اس موضوع پر کئی رسالے لکھے ہیں جن میں اندھی تقلید کے حامیوں پر نکتہ چینی کی ہے۔

(۳) شفاعت۔ وہابی کسی کے لیے کسی درمیانی واسطہ کی خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ پرہیزگار ہو اور مقرب الٰہی سمجھا جاتا ہو شفاعت کے عقیدہ کے قائل نہیں۔ انسان خود خدا سے اپنی رگِ گردن سے زیادہ قریب ہے اور ہر شخص مختار ہے کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر اللہ کی عبادت کرے۔ وہ عمل پر زور دیتے ہیں۔ اصول اسلام پر زبانی اعتقاد کافی نہیں۔

(۴) بدعت۔ وہابی دورِ حاضر کے اُن تمام مذہبی اور سماجی اعمال و رسوم کی مذمت کرتے ہیں جن کی شریعت میں کوئی نظیر یا جواز موجود نہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قبر پرستی، پیروں کی تعظیم میں مبالغہ و افراط۔ شادیوں میں مہر کی انتہائی گراں رقوم۔ تقریبات جیسے ختنہ اور میلاد نبوی میں زیادہ دھوم دھام اور بیوہ کے نکاح ثانی کا امتناع وغیرہ وغیرہ۔

کچھ عمدہ اخلاق و عادت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اسلام کے پانچ ارکان، نماز، روزہ، حج زکوٰۃ اور جہاد کی پابندی پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید تو ہے ہی ان کے ساتھ اور نیکیاں بھی حاصل کرنا ہیں جیسے انکساری قناعت اور صبر و استقلال اور حرص و طمع، حسد اور غرور کی بیخ کنی۔ سید احمد کی تعلیمات میں آغاز کار سے ہی جہاد بھی، جب دین و معاشرہ کی حفاظت کے لیے کوئی اور صورت باقی نہ رہ جائے، ایک اہم رکن ہے [۲]

---

[۱] سر حافظ وہبہ نے اپنے مقالہ "اسلامک کلچر" دسمبر ۱۹۲۹ء میں وہابیت کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے [۲] صراط مستقیم ص۱۰۵ تا ۱۱۵

(د) نجدی اور ہندوستانی تحریکاتِ وہابیہ کا تقابلی موازنہ

وہابیت کا اتہام حضرت سید احمد رحمہ اللہ تعالے علیہ کا شان دار سفرِ حج ان کی زندگی کا ایک اہم اور فیصلہ کن واقعہ تھا۔ بعض انگریز مصنفوں نے زور دیا ہے کہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا سفرِ حج ان کی زندگی کا ایک انقلابی واقعہ تھا۔ ان کے خیال میں اسی دوران سفر میں ان کو عربی وہابیت سے زیادہ قریب کا رابطہ ہوا۔ اس کے عقائد سے بہت متاثر ہوئے اور ہندوستان میں ان کی اشاعت کی۔ ایسا ہی ایک مصنف (فلبی) لکھتا ہے "یہی زمانہ تھا جب کہ ایک شخص سید احمد بریلوی مکہ کے سفر سے ہندوستان کو وہ بیج لے گیا جس نے ۱۸۳۲ء میں ان کی شہادت کے بعد وہابیوں کو کوہِ سیاہ کا ردِ عمل بخشا اور اطراف تک اس کی گونج یا جھٹکا پہنچا دیا۔" ہندوستانی وہابیت پر ایک اور مشہور تر مصنف (ہنٹر) لکھتا ہے۔ سید احمد کے قیام مکہ کے دوران میں وہاں کے حکام کی توجہ ان کی تعلیمات کی ان بدو قبائلیوں کے خیالات سے مماثلت کی طرف منعطف ہوئی جن کے ہاتھوں مکہ کے مقدس شہر نے اتنے مصائب اٹھائے تھے۔ علانیہ طور پر ان کی تحقیر کی گئی اور شہر بدر کر دیے گئے۔ اس جور و تعدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندوستان آئے تو ایک مذہبی خواب بیں اور مشرکانہ بداعمالیوں کے مصلح کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ محمد بن عبدالوہاب کے معتقد و مرید کی حیثیت سے۔"

محمد بن عبدالوہاب

ان بیانات کی صداقت کے جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ عرب میں وہابیت کی رفتار کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ عرب میں وہابیت کا بانی محمد بن عبدالوہاب تھا جو ۱۷۰۳ء میں اعینہ میں پیدا ہوا[1] اس نے ابتدائی تعلیم بصرہ اور مدینہ میں پائی۔ اس زمانہ کا عرب معاشرہ سماجی و معاشی بداعمالیوں میں اس سے زیادہ نمایاں طور پر مبتلا تھا جتنا ہندوستان کا معاشرہ۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ عرب اسلام کا مولد تھا جس نے عربی معاشرہ کو زمانہ جاہلیت کے معاشرہ سے پاک کیا تھا یہ حالت زیادہ افسوسناک تھی۔ عہد قبل اسلام میں اور تقصیروں کے باوجود عربوں کے پاس ایک منظم تہذیب اور پختہ لٹریچر تھا۔ لیکن اب تو یہ چیز بھی باقی نہ رہی تھی۔

محمد بن سعود

محمد بن عبدالوہاب کی معاشرہ کی اصلاح کی ابتدائی کوششوں نے اس کو مقامی حکام کی خفگی اور عداوت کا مورد بنادیا جو اس کی جلاوطنی پر منتج ہوا۔ اس نے دارالیہ (نجد) کے ایک ہمسایہ حکمراں امیر محمد بن سعود کے دربار میں پناہ لی۔ ۱۷۶۵ء تک سعود نے نجد کا ایک بڑا حصہ فتح کر لیا تھا جس کا وہ دنیاوی حاکم بن گیا جب کہ محمد بن عبدالوہاب دینی پہلو کا نگران بنا۔ ان دونوں نے مل کر جو نظام حکومت قائم کیا وہ قرآن و حدیث کے احکام کی سخت اطاعت پر مبنی تھا۔ امیر محمد سعود نے اسی سال وفات پائی اور اس کا بیٹا عبدالعزیز اس کا جانشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی نظام حکومت محمد بن عبدالوہاب کی براہ راست نگرانی میں ۱۷۹۲ء میں اس کی وفات تک چلتا رہا۔

وہابی تحریک کا عروج

اس اثناء میں عبدالعزیز کی سرپرستی میں سیاسی توسیع جاری رہی۔ یہاں تک کہ پورے نجد پر قبضہ ہو گیا۔ حجاز پر بھی حملہ کیا گیا اور اپریل ۱۸۰۳ء میں مکہ کے مقدس شہر پر بھی قبضہ ہو گیا۔

---

[1] جے بی فلبی مذکور الصدر ص ۸

اسی زمانہ میں وہابیوں نے ان بلاد مقدسہ کو شرک و کفر کی بعض گندگیوں سے پاک کرنے کا تہیہ کر لیا اور اصلاح کی بعض حد سے بڑھی ہوئی پرجوش حرکات کا ارتکاب کیا جمہور مسلمانان ہند میں ان کو بدنام کر دیا۔ خلافت ترکیہ نے عرب کے بیشتر حصہ پر اُن کی بڑھتی ہوئی بالادستی کو تشویش ناک نظر سے دیکھا اور اپنے متصل ترکی صوبہ جات بغداد و بصرہ کے لیے ایک سیاسی خطرہ تصور کیا۔ ۱۸۰۳ء میں ایک ایرانی شیعہ نے عبدالعزیز کو قتل کر دیا۔ اُس کا بیٹا سعود بن عبدالعزیز اس کا جانشین ہوا۔ ۱۸۰۶ء میں ایک بار پھر اُس نے مکہ اور مدینہ پر قبضہ کر لیا جو پہلے ترک حکام نے اس کے قبضے سے نکال لیا تھا۔ سعود نے حجاز میں اپنی طاقت مستحکم کر کے اپنے دائرہ اثر کو شام، عراق اور خلیج فارس کے علاقوں تک وسعت دینے کی کوشش شروع کر دی۔

عثمانی خلیفہ کی مخالفت

اس وقت تک ترک حکام عرب طاقت کے اس احیاء کے سیاسی خطرے سے پوری طرح متنبہ ہو چکے تھے۔

عثمانی شہنشاہ نظری طور پر ملت مسلمہ کا دینی سردار اور خلیفہ اور بلاد مقدسہ مکہ و مدینہ کا محافظ و فرماں روا تھا۔ ان کا نکل کر وہابیوں کے قبضہ میں چلا جانا خلیفہ کے دینی و دنیوی اقتدار پر ایک ضرب تھی۔ ہندوستان میں انگریز حکام کے نزدیک بھی خلیج فارس میں وہابی اقتدار ایک شدید سیاسی خطرہ تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۹ء میں حکومت بمبئی کپتان ویں رانٹ اور کرنل (بعد میں جرنیل) سرلیونل اسمتھ کے ماتحت ایک بیڑا بھیجا جنھوں نے امام مسقط سے مل کر کارروائی کی اور وہابیوں کو شکست دی۔ ترکوں نے وہابیوں کی سرکوبی کے لیے مصر کے محمد علی پاشا سے بھی مدد لی۔ یہ ترکوں کی ایک باریک دو رُخی چال تھی۔ کیونکہ وہابیوں کو شکست دینے میں خود پاشا کی طاقت کے گھٹ جانے کا احتمال تھا۔

وہابیوں کی سیاسی طاقت کا خاتمہ

محمد علی پاشا نے ۱۸۰۹ء میں اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔ حجاز کو اصلی مہم محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا کے زیر کمان بھیجی گئی جو ۱۸۱۶ء میں سوئیز سے روانہ ہوا۔ اس اثنا میں ۱۸۱۴ء سعود

کا بیٹا عبداللہ باپ کا جانشین ہوا۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے ابراہیم پاشا سے شکست کھائی، گرفتار ہوا اور قسطنطنیہ بھیج دیا گیا جہاں سخت عذاب دینے کے بعد قتل کر دیا گیا، وہابی دارالحکومت لوٹ لیا گیا اور آگ لگا دی گئی[1] حکومت ہند نے اس موقع پر ابراہیم پاشا کو مبارکباد دینے کے لیے ایک خاص قاصد بھیجا۔ تاہم حکومت برطانیہ کو اس علاقہ میں جہاں مصریوں نے وہابیوں کو برقرار کر دیا تھا، مصریوں کے منصوبوں سے خدشہ پیدا ہو گیا اور کپتان جی ایف سیڈلر کو فوراً خرلیعہ DARIA جانے اور عرب کے نئے حکمرانوں سے ان کے منصوبوں پر گفتگو کرنے کے لیے تعینات کیا تاکہ ان کو خلیج فارس کے سواحل پر قدم جمانے کے کسی نئے عزم سے باز رکھا جائے[2]

اس طرح وہابیوں کی سیاسی طاقت تو ٹوٹ گئی مگر جن اخلاقی اور سماجی اصلاحات کی انہوں نے بنا ڈالی تھی وہ زندہ و پائندہ رہ گئی۔ یہاں ان کی تفصیل سے ہمیں بحث نہیں۔

ہندوستانی اور عربی وہابیت کا موازنہ

رہا ہندوستانی وہابیت پر عربی وہابیت کے اثرات کا سوال تو اس کی کوئی دستاویزی دلیل یا موثق ثبوت نہیں۔ حضرت سید احمد کی ابتدائی زندگی اس زمانہ میں گزری جب کہ عرب وہابیوں کی جدوجہد نجد تک محدود تھی۔ یہ لوگ عالمگیر روشنی میں بہت بعد میں نمایاں ہوئے۔ سید احمد کے سفر مکہ کا اکثر وہی موقعہ بتایا جاتا ہے جب کہ عربی اثر سے ان کا سابقہ ہوا اور متاثر ہوئے۔ اس سلسلہ میں ہنٹر کا قول اوپر نقل ہو چکا۔ لیکن اس امر سے قطع نظر کہ وہ بیان کو کسی دلیل سے ثابت نہ کر سکا، اس کے خلاف سید احمدؒ کے دوران قیام مکہ میں عرب کے بعض علماء میں ان کی کیا عزت اور احترام تھا، مثبت دلیل موجود ہے[3] مولوی عبدالحئی نے وہاں کے بہت سے مقامی علماء کی درخواست پر

---

[1] فلبی مذکور الصدر صفحہ ۱۰۲-۱۰۳ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۳ [3] غلام رسول مہر صفحہ ۲۳۲۔ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۶۶-۳۶۷

صراط مستقیم کا عربی میں ترجمہ کیا اور اس کے نسخے تقسیم کیے گئے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے۔ کہ سید احمدؒ کے سفرِ حج کے زمانے میں بلادِ مقدسہ ترکوں کے قبضے میں تھا۔ تمام نجدی وہابی شبہہ کی نظر سے دیکھے جاتے اور ان کی موجودگی گوارا نہ کی جاتی تھی۔ اس لیے ان سے ملنے جلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ سید احمدؒ مروّجہ سماجی دینی صورت حال کا مقابلہ کرنے اور غیر ملکیوں سے جہاد کرنے کی ضرورت کا احساس سفرِ حج سے پہلے کر چکے تھے۔ صراط مستقیم اس مسئلہ پر واضح دلیل ہے۔

نقطۂ مماثلت

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ دونوں تحریکوں کا مخرج و مبدا ایک ہی ہے قرآن و حدیث، دونوں کے درمیان کچھ مماثلتیں ضرور ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے ظہور کے وقت دونوں ملکوں میں ایک قسم کے حالات و کوائف درپیش تھے اور دونوں اسلام کے اصل اصول کو دوبارہ رائج و شائع کرنے کی ضرورت پر مُصر تھے جن میں بنیادی چیز توحید اور ترکِ بدعات پر زور دینا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کی التوحید اور شاہ اسماعیل کی تقویۃ الایمان ان بنیادی امور پر زور دینے میں متفق الخیال ہیں۔

نقطۂ اختلاف

مگر ساتھ ہی ان دونوں کے درمیان کچھ اہم نقاطِ اختلاف بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نمایاں طور پر ہندوستانی تحریک کا سیاسی پہلو ہے [۱] جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد پر زیادہ زور تھا۔ عرب میں دوسری صورت حال کی بنا پر یہ پہلو موجود نہ تھا۔ عرب میں سیاسی اقتدار ختم نہیں ہوا تھا اس لیے عرب کے وہابی زیادہ تر سماجی و مذہبی اصلاحات کے عَلم بردار تھے۔ ہندوستانی وہابیت کا دوسرا

---

[۱] آئندہ ابواب میں اس نقطہ پر زیادہ وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

طرۂ امتیاز ایک مرحلہ پہ مہدوی تحریک سے اس کا اتفاق تھا۔ مہدی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے کثیر لٹریچر فراہم کر لیا تھا اسی کے بعد سید احمد نے رحلت کی۔ مہدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما نہ ہوا۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ دونوں تحریکوں میں ظاہری تشابہ ایک مشترک ماخذِ استفاضہ اور یکساں حالات و کوائف کی موجودگی کا نتیجہ تھا نہ کہ ایک دوسرے کے تتبع و تقلید کا۔

باب ۲

سید احمدؒ بریلوی کی زندگی اور کارنامے

(۱) ابتدائی زندگی اور تبلیغی کام

سید احمدؒ بریلی کے سکونت گزیں ایک معزز و معروف مقدس خاندان کے فرد تھے۔ وہ سید محمد عرفان کے فرزند تھے اور صفر ۱۲۰۱ھ (نومبر ۱۷۸۶ء) کو پیدا ہوئے۔ سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق وہ دراز قامت، گورے چٹے، اور قوی الجثہ تھے۔ بھنویں ملی ہوئی، پیشانی کشادہ، ڈاڑھی گھنی اور بشرہ بشاش تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی۔ یہ خیال غلط ہے کہ انہوں نے متداول تعلیم زیادہ نہیں پائی۔ صراط مستقیم کے علاوہ جو انہیں کے افکار و اقوال پر مبنی ہے ہمیں ان کے لکھے ہوئے متعدد رسائل کا پتا ہے۔ ان کے مکتوبات کا موجودہ مجموعہ جن میں سے کچھ ان کے املا کرائے ہوئے ہیں ان کے علم اور قدرتِ زبان کا واضح ثبوت ہیں۔

سید احمدؒ کے والد کا انتقال ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ اس کے فوراً بعد وہ روزگار کی تلاش میں لکھنو گئے، وہاں سے دلی چلے گئے۔ جہاں شاہ ولی اللہؒ کے فرزند اور جانشین شاہ عبدالعزیزؒ سے ملے اور ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۶ء) کے قریب ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ وہابی تحریک کی بعض ممتاز خصوصیات اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

مخزن کے مولف سید احمد کی ابتدائی زندگی کے متعدد واقعات بیان کرتے جن سے بعض مروجہ رسوم و عادات مثلاً اولیاء پرستی، ان کے مزارات پر مراد طلبی اور پیروں کی غیر معتدل تعظیم و تکریم وغیرہ سے ان کا اکراہ اور اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) کے شروع میں دہلی سے بریلی لوٹے اور وہاں دو برس مقیم رہے۔ اسی زمانہ میں ان کی شادی

ہو گئی اور ایک لڑکی مسماۃ سارہ پیدا ہوئی۔ مختصر پیمانے پر وعظ و تبلیغ بھی شروع کر دی۔

فوج میں ملازمت

بریلی کے دو سال کے قیام میں سید احمدؒ نے زیادہ وقت اپنے مشن اور اس کی کامیابی کے طریقوں پر غور و فکر میں صرف کیا، شروع ہی سے غیر ملکوں کے اجنبی لوگوں کو شکست دینے اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعات کی غلاظتوں کو صاف کرنے کے لیے ایک نظام کے قیام کی (جو فوجی ہو تو مرجح ہے) کی ضرورت محسوس کی[1] یہ احساس ہی ان کو ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں دوبارہ دہلی لے گیا اور اسی نے پھر کچھ ہی بعد ٹونک میں نواب امیر خاں کی فوج میں شامل ہونے پر آمادہ کیا۔

سید احمدؒ کے بڑے بھائی سید ابراہیم پہلے سے نواب کی فوج میں تھے۔ سید احمدؒ کی پرہیز گاری اور علم و فضل کی بناء پر ان کو (فوج میں) پیش امام کے عہدے پر تعینات کیا گیا اس عہدے نے ضمناً ان کو یہ موقع بھی دیا کہ اپنے اخلاقی اثر سے کام لیں، فوجیوں تک اپنی تعلیمات پھیلائیں اور اس طرح ان کے اعمال و کردار میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ مولفِ مخزن نے اس زمانہ میں اُن کی زندگی کے بہت سے واقعات اور سپاہیوں کی زندگی اور اعمال پر ان کی تاثیرات کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانہ میں کئی فوجی آویزشوں کے دوران ان کے محاربات کی بسم اللہ ہوئی۔

فوج میں شمولیت کا مقصد

امیر خاں کی فوج میں ان کی شمولیت کی ان کے بعض معترضین نے غلط تعبیر کی اور نامنصفانہ رائے زنی کی ہے۔ امیر خاں کی فوج میں ان کے داخل ہونے کو ان کی مالی منفعت کی غرض پر محمول کیا اور الزام لگایا ہے مگر یہ بہرحال یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے مشن کے لیے

---

[1] مکتوب سید احمد۔ از مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی صفحہ ۱۰۲ - ۱۰۳

ایک فوجی نظام کی ضرورت کا فیصلہ کر چکے تھے وہ امیر خاں کی فوج میں اس لیے شریک ہوئے تھے کہ یوں یہ نظام ایک مسلّح اور تربیت یافتہ تنظیم بن سکتا تھا، اور اگر ان کے طرز فکر کے مطابق اس کا آغاز ہوتا تو یہ معمولی جھڑپوں اور خاص اپنی فوج کے قیام سے بہت بہتر تھا۔ اس طرزِ عمل کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے امیر خاں کے انگریزوں سے مجوزہ اتحاد و ایتلاف سے اختلاف کیا اور آخر کار انگریزوں سے ان کے ایتلاف کے بعد کنارہ کش ہو گئے۔ اگر سید احمد کی نیت صرف مالی منفعت ہوتی تو وہ امیر خاں کی نوکری سے علیٰحدہ نہ ہوتے۔ انگریزوں کا حلیف ہو جانے کے بعد امیر خاں سے سید احمد کی اُمید منقطع ہو گئی اور وہ پھر دلّی لوٹ گئے۔ وہاں کے قیام میں انھوں نے تبلیغ اور بیعت لینا شروع کر دی۔

شاہ اسماعیل و عبدالحئی کی بیعت

اُس زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد شاہ عبدالحئی اور بھتیجے شاہ اسماعیل نے سید احمدؒ سے بیعت کی۔ سید احمدؒ کے بعد یہ دونوں بزرگ اس تحریک کے نہایت اہم سربراہ تھے۔ دونوں بڑے پائے کے علمار تھے اور اُس زمانے کے سب سے بڑے صاحب ارشاد و تقوئے خاندان سے متعلق تھے۔ ان کے شمول نے تحریک کی وقعت کو بہت بلند کر دیا اور اس کے بعد کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ سید احمدؒ کے ساتھ ان کی عدیم المثال محبت و رفاقت اور ان کے ساتھ روز افزوں وفاداری اور تحریک میں جد و جہد ان کے مرتے دم تک جاری رہی۔ ان کے سوانح حیات علیٰحدہ و مفصل تذکرہ کے متقاضی ہیں [1] شاہ اسماعیل معروف بہ شہید مئی ۱۸۳۱ء میں جنگ بالاکوٹ میں سید احمدؒ کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ شاہ عبدالحئی ان سے پہلے ۱۸۲۶ء میں

---

[1] تنہا تالیف جو شاہ اسماعیل کی زندگی کا تفصیلی بیان دیتی ہے وہ مرزا حیرت دہلوی کی حیات طیبہ ہے مگر یہ زیادہ معتبر نہیں۔

وفات پا چکے تھے۔ یہ دونوں مشہور صراط مستقیم کے مشترک مؤلف تھے۔ شاہ اسماعیل بڑے کثیر التصنیف تھے۔ اور ان کے رسائل اور مکتوبات تحریک کے اغراض و مقاصد کی بہت واضح اور زور دار ترجمانی کرتے ہیں۔ تحریک کی مدافعت میں وہ قلم کے ویسے ہی مرد میدان تھے جیسے میدانِ جنگ میں تلوار کے سورما۔ جنگ شنکھیاری میں جہاں انہوں نے صرف ایک بہت بڑی سکھ فوج کا مقابلہ کیا اور بے مثال شجاعت کے کارنامے دکھائے۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے۔ شاہ اسماعیل مذہبی عقائد میں انتہاپسندی کا رجحان رکھتے اور ایک غیر مقلد تھے۔ شاہ عبدالحئی نسبتاً اعتدال پسند اور مقلد تھے یہ دونوں ایک دلچسپ تقابلی مطالعہ کے موضوع تھے۔ ایک جوشیلا زبردست دوسرا خاموش سادہ مزاج۔

تبلیغی دورے

دہلی میں مختصر قیام کے بعد سید احمد نے اپنے مرشد شاہ عبدالعزیز سے اجازت طلب کی کہ باہر کے لوگوں کی درخواست کی تعمیل میں جو بیعت کے خواہاں تھے مگر دلی نہ آ سکتے تھے سفر کو نکلیں۔ ان کی سیاحت زیادہ تر گنگا اور جمنا کے درمیان دوآبہ کے علاقہ اور سہارنپور، شاہجہاں پور، پھُلیت، رام پور، مکھنیشور اور بہت سے دوسرے مقامات پر مشتمل تھی یہ سفر جو دراصل ایک تبلیغی دورہ تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ہاتھ پر ایک انبوہ کثیر نے بیعت کی اور ان کے متبعین میں ایک عظیم الشان اضافہ ہوا۔

سید احمدؒ اپنا سفر تمام کر کے دہلی واپس آئے اور اس کے فوراً بعد اپنے وطن بریلی چلے گئے اور سفر حج کو روانگی تک وہیں مقیم رہے۔ وہاں ان کے ساتھ ان کے خاص رفقاء جیسے شاہ اسماعیل، عبدالحئی اور یوسف پھُلتی بھی تھے۔ بعد کے چند سالوں میں شمالی ہند کے بعض شہروں کی ویسی ہی سیاحت کی۔ ایسے ہی مختصر دورے میں ریاست اودھ کے وزیر نصیرالدولہ کی دعوت پر وہ لکھنؤ بھی گئے۔ عظیم آباد پٹنہ کے ولایت علی اس زمانے میں اشرف علی کے زیر نگرانی لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دونوں صاحب بیعت کے ارادے سے نہیں بلکہ زیادہ تر استعجاباً و امتحاناً سید احمد سے ملے۔ مگر وہ ان

کی شخصیت سے پہلے ایسے متاثر ہوئے کہ اسی وقت وہیں ان سے بیعت کر لی۔ ولایت علی کا یہ فعل بعد میں عظیم آباد پٹنہ کے خاندان صادق پور کی بیعتوں کا پیش خیمہ تھا۔ اور آگے چل کر تحریک کی تاریخ پر بہت دور رس اثر ڈالا۔

بیوگان کا عقد ثانی

اس زمانے میں سید احمدؒ نے مسلمانوں میں بیوگان کے نکاح ثانی کی مروجہ سماجی پابندی سے لاپروائی برت کر ذاتی مثال قائم کی۔ کچھ دن ہوئے تھے ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا۔ انہوں نے ان کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں میں یہ پہلا فعل تھا اور یہ ان کی جرأت ایمانی کا نتیجہ تھا۔ بعد میں سید احمد کی اس مثال کی خاندان صادق پور کے ارکان نے پیروی کی اور گرم جوشی سے رائج کر دیا۔ وہ بہار میں اس سماجی اصلاح کے سرگرم حامی رہے۔ اس زمانہ کی کارگزاریوں میں ایک اور مہتم بالشان کارنامہ صراط مستقیم کی تالیف تھا۔ جو اس تحریک کا سماجی و دینی منشور کہا جا سکتا ہے۔ اس تالیف سے سید احمد کے خیالات منظم نظریوں میں صاف نمایاں ہو گئے۔

سید احمدؒ کے تبلیغی سفر بظاہر دوسرے پیروں کے مروجہ سفروں کے مانند تھے جن میں بیعتیں لی جاتیں اور مذہبی اذکار ہوتے۔ مگر ان کے سفروں کی نوعیت اور تھی۔ ان سے ان کو عوام الناس سے میل جول کا موقع ملتا تھا۔ اور اُن برائیوں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا جن میں مسلم معاشرہ مبتلا تھا۔ یہ چند سال خاموش مگر ٹھوس منظم تبلیغی کام کے تھے۔ متبعین کے ایک منتخب گروہ کو آنے والی کش مکش کے لیے فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

اسی موقع پر سید احمدؒ نے سفر حج میں نکلنے کا عزم کیا۔ یہ فیصلہ کچھ غیر متوقع تھا کیونکہ وہ دوسرے سفر کے لیے کافی تیاریاں کر چکے تھے اور وہ تھا ہندوستان کے برطانوی علاقے سے ہجرت[1]۔ اس عزم کا ایک سبب شاید یہ تھا کہ اُس زمانے میں دین سے

---

[1] غلام رسول مہر جلد ۱ صفحہ ۱۸

سرتابی کے جو واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ان میں سے سفر حج کی راہ میں ڈاکہ زنوں کے ہاتھوں جان کے خطرے سے "تنسیخ حج کا فتوے" تھا۔ سید احمدؒ شاید چاہتے تھے کہ جیسے انھوں نے بیوگان کے نکاح ثانی کے لیے کیا تھا اسی طرح اس بدعت کو توڑنے کے لیے بھی ذاتی مثال قائم کریں۔

سیّد احمد کا سفر حج

انھوں نے مجوزہ قافلہ میں شرکت کے لیے تمام ملک سے رضا کار طلب کیے۔ ان رضا کاروں کو بریلی میں جمع ہونا اور وہاں سے کشتیوں پہ گنگا ندی سے کلکتہ جانا قرار پایا تھا۔ پورا گروہ چار سو افراد پر مشتمل تھا جو چھوٹے چھوٹے دستوں میں منقسم تھا۔ قافلہ آہستہ آہستہ گنگا سے سفر کرتا ہوا اس کے ساحلوں پہ اہم شہروں میں ٹھہرتا ہوا جہاں لوگوں کا بڑھتا ہوا ہجوم بیعت کے لیے جمع ہو جاتا، آگے بڑھتا گیا۔ راستے میں بہت سے عازمین حج آملے۔

یہ سفر شوال ۱۲۳۶ھ (۳۰ جولائی ۱۸۲۱ء) کی آخری تاریخ میں بریلی سے شروع ہوا۔[1]

افسوس ہے کہ ہمیں سید احمدؒ کے راہ میں مختلف مقامات میں قیام کی تاریخوں اور وقت کا علم نہیں۔ صرف بعض اہم مقامات مثلاً بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کی اقامتوں کی تاریخیں معلوم ہیں۔

چنانچہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ بریلی سے روانگی اور بعض معمولی اقامتوں کے بعد قافلہ بنارس پہنچا (۹-۱۱ ستمبر ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ ۱۰-۱۲ ۱۲۳۶ھ کو) بقرعید کا تہوار منایا گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ بھری برسات تھی اس لیے وہ پورے ایک مہینہ ٹھہر گئے۔ بنارس سے روانہ ہو کر وہ اسی روز زمانیہ پہنچے، وہاں ایک رات ٹھہر کر غازی پور پہنچے جہاں کئی روز رہے۔ اسی جگہ سے وہ بہار میں داخل ہوئے۔

سید احمد کی کلکتہ کی دوبارہ آمد و رفت میں بہار سے گزرنے کے دوران کے واقعات کسی قدر شرح و بسط سے بیان کیے گئے ہیں، اولاً اس لیے کہ تحریک کی تاریخ مابعد میں

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰

ان کی بڑی اہمیت ہے، ثانیاً اس لیے کہ سید احمدؒ کے مستند سوانح نگاروں نے ان میں سے بعض واقعات کے متعلق متضاد بیانات کے استقصا کی کوشش کی ہے۔

خاندان صادق پور کی شمولیتِ تحریک

اسی سفر اور اسی زمانے میں پٹنہ کے مشہور خاندان صادق پور کی بیعت ہوئی - یہ وہ خاندان ہے جس کی جدوجہد سید احمد کی شہادت کے بعد اس تحریک کی تاریخ پر حاوی و غالب ہے اور جس نے اپنی بے مثال تبلیغی جوش سے اس تحریک کو بنگال بہار اور دکن تک پھیلا دیا - اور یہ پٹنہ عظیم آباد ہی تھا جہاں سب سے پہلے آیندہ کش مکش اور آویزشوں کے لیے مجاہدوں کو بھرتی کرنے اور سرمایہ جمع کرنے کی غرض سے مستقل تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی - پٹنہ کے ورود سے پہلے سید احمدؒ نے گنگا کے دوآبہ کے علاقے میں کئی تبلیغی سفر کیے تھے اور بہت سے لوگوں نے ان سے بیعت کی تھی - لیکن اس وقت تک سید احمدؒ کی طرف سے کام آگے بڑھانے کے لیے کسی شخص کو باقاعدہ نائب یا خلیفہ مقرر کرنے کے متعلق کوئی واقعہ کسی تحریر میں مذکور نہیں - یہ واقعہ اوّل اوّل پٹنہ ہی میں ظہور پذیر ہوا - جہاں ایک سند کے ذریعے سے محمد حسین خلیفہ یا نائب مقرر کیے گئے - یہ سند اس قسم کی تنہا دستاویز ہے جو موجود ہے، جس نے خاص طور پر ان کو مجاز و مختار کیا کہ نئے آدمی بھرتی کریں اور اس تحریک کو عام طور پر بہار میں منظم کریں - اس تحریک کی تاریخ کے ایک باریک بیں مبصر نے ایک معنی خیز تبصرہ کیا ہے - "سید احمدؒ حج سے لوٹ کر پٹنہ میں سید محمد حسین اور مشتاقان جہاد کی ایک بڑی جماعت سے ملے - ان کے نائبین یا خلفاء کی ایک عام مجلس منعقد ہوئی اور ایک عرصہ سے سوچی ہوئی مہم (سرحد میں جنگ) میں مدافعت و اعانت میں آدمی اور روپے کی ترسیل کا ایک مستقل انتظام کیا گیا[1] اس تحریک کے ایک اور تذکرہ نگار[2] نے بھی سید احمدؒ کے سفر پٹنہ کے دوران میں ان کے

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱۰۱ ۱۸۷۰ء صفحہ ۸۲-۸۳ [2] جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ ۱۸۸۰ء صفحہ ۳۵۳

انتظامی کام کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "سید احمد پٹنہ میں ایک مرکزی تنظیم قائم کر کے گنگا کے کنارے کنارے چل کر کلکتہ پہنچے۔ اس طرح یہ امر واضح ہے کہ سرحد پر عملاً جنگ چھڑنے سے بہت پہلے خود سید احمدؒ نے پٹنہ کو تحریک کا پہلا منظم مرکز منتخب کر کے غیر معمولی امتیاز دے رکھا تھا۔ بعد کے چند سالوں میں پٹنہ کے وہابیوں نے اس اعتماد کی توثیق کر دی جو سید احمدؒ کو اُن پر تھا۔ اور انہوں نے تحریک کی تاریخ میں زبردست حصّہ لیا۔"

ولایت علی کی بیعت

خاندان صادق پور کے ایک رکن ولایت علی سید احمدؒ کے قیام لکھنؤ ہی کے زمانے میں ان سے بیعت کر چکے تھے۔ انہوں نے بیعت پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس نے ان کے طرز زندگی کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ وہ ایک کھاتے پیتے خاندان کے فرد اور اعلیٰ معیار معاشرت کے پروردہ تھے۔ مگر اس بیعت کے بعد وہ سید احمدؒ کے ساتھ بریلی جا رہے جہاں وہ ایک ادنےٰ اور معمولی رضا کار کی حیثیت سے کام کرتے تھے[1]۔ خاندان کا ایک پرانا ملازم پٹنہ سے ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بھیجا گیا، اپنے آقا کو ایک کچے مکان کی تعمیر میں مزدور کی طرح مصروف دیکھ کر پہچان نہ سکا اور حیرت زدہ رہ گیا۔

مظہر علی کی بیعت

ایک اور معزز شخص جو سید احمدؒ کے دورۂ پٹنہ سے پہلے ان کے شناسا تھے شہر پٹنہ کے مظہر علی تھے۔ ان کے قیام پٹنہ کے دوران میں سید احمدؒ ان کے گھر گئے جہاں ان کے اور افراد خاندان نے بیعت حاصل کی وہ بھی سید احمدؒ کے ایک نائب مقرر ہوئے بیعت کے ان دو مخصوص واقعات کے سوا سید احمدؒ کا پیام اب تک بنگال اور بہار کے کسی اور حصے تک نہیں پہنچا تھا اور شمالی ہند کے پیشتر کے سفروں میں یہ حصّے شامل

---

[1] غلام رسول مہر جلد ۱ ص ۱۶۹ و تذکرہ صادقہ ص ۱۱۱-۱۱۲

نہ تھے۔

مذہبی مذاکرے

سید احمدؒ کا اپنے دوروں میں بہار سے گزرنے اور وہاں قیام کرنے میں ایک ہی قسم کے حالات پیش آئے۔ مختلف مقامات میں مقامی لوگ ایک کثیر تعداد میں حاضر خدمت ہوئے اور بیعت سے مشرف ہوئے بعض مقامات پر مذہبی مذاکرے اور خطبے قائم ہوئے۔ بعض جوشیلے اور وفا شعار مقامی اور ذی اثر اصحاب منتخب ہوئے اور خلیفہ مقرر کیے گئے۔ جنہیں سید احمدؒ کی طرف سے بیعت لینے کا مجاز بنایا گیا، قافلہ آگے بڑھتا رہا اور یہ مقامی مرید نئے پیغامات پھیلاتے پھرے اور نئے نئے ممبر بناتے رہے۔

معتقدین میں اضافہ

اُس وقت کے حالات میں سید احمدؒ کے سامنے یہی ایک راستہ تھا۔ وہ کسی ایک جگہ زیادہ عرصہ تک ٹھہر نہ سکتے تھے اس لیے وہ اپنا پیغام عوام الناس کے وسیع تر حلقوں میں جوان کے دورے کی راہ سے دُور واقع تھے۔ یہ کام مقامی خلیفوں کے سپرد کر دیا گیا تھا جو کافی احتیاط اور توجہ سے منتخب کیے جاتے تھے۔ یہ امر تحریک کو پھیلانے اور معتقدوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو ہم خیال بنانے میں مقامی خلیفوں کی بے خطا اور کامیاب کوششوں سے عیاں ہے۔ یہ گویا گنگا کی تمام وادی میں بیج بوئے گئے تھے جو چند سالوں میں ایسے حیرت ناک طور سے پنپنے والے تھے۔

بکسر میں قیام

بہار کے اندر سید احمدؒ کی جماعت کا پہلا پڑاؤ بکسر میں ہوا جہاں مقامی قاضی نے کچھ دن قیام کرنے کی درخواست کی۔ آس پاس کے گاؤں خصوصاً چوسا بڑا سے لوگ کثیر تعداد میں آئے اور بیعت کی۔ بعد میں یہ مقام تحریک کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

ایک رات بکسر میں ٹھہر کر وہ چھپرہ چلے گئے۔ وہاں بھی مختصر قیام رہا۔ دوسرا پڑاؤ داناپور میں ہوا جہاں بہت سے مقامی لوگ اور ایسے لوگ بھی جو چھاؤنی کے علاقے میں ملازم تھے ان کے ورود کے منتظر تھے۔ ان کی ایک ٹولی سید احمدؒ کے استقبال اور داناپور تک لانے کے لیے بنارس جا پہنچی تھی۔ یہاں وہ نسبتاً زیادہ عرصہ تک ایک ہفتہ ٹھہر گئے۔ دو معزز مقامی اشخاص شیخ علی جان اور محمد صدر الدین نے اپنے خاندان کے ساتھ بیعت کی۔ مولانا اسماعیل و عبدالحئی نے کئی خطبے دیے جن کی تاثیر سے بہت لوگوں نے راہ ہدایت اختیار کی۔

پھلواری شریف میں مذہبی مباحثہ

اسی داناپور کے قیام کے دوران میں سید احمدؒ نزدیک کی ایک مشہور خانقاہ پھلواری شریف میں تشریف لے گئے۔ اس وقت اس کے سجادہ نشین شاہ نعمت اللہ تھے۔ پہلے شاہ اسماعیل اور بعض دوسرے اصحاب ملنے گئے۔ ان کے بعد سید احمدؒ، عبدالحئیؒ، عبدالحق اور کچھ دوسرے اصحاب پہنچے۔ شاہ ابوالحسن فرد خلف و جانشین نعمت اللہ نے ان کی پرتکلف ضیافت کی دوسرے دن عبدالحئی شاہ اسماعیل کے ہمراہ پھر خانقاہ آئے اور مذہبی مباحثہ منعقد ہوا۔ سید احمد اور شاہ اسماعیل علمائے پھلواری شریف کے علم و دانش سے متاثر ہوئے اور اس خانقاہ کو اکثر مروجہ بدعات سے پاک پایا۔

پھلواری شریف کے اس ورود کی تاریخ میں کچھ اختلاف آرا ہے۔ سیرۃ سید احمدؒ شہید کے مؤلف اس ملاقات کو حج سے مراجعت کے دوران میں بتاتے ہیں۔ غلام رسول مہر کا بھی کہنا ہے کہ انہیں سید احمدؒ کے پھلواری شریف جانے کی کوئی شہادت نہیں ملی ہے سوائے ان کی مراجعت حج کے دوران کے۔ مگر وہ سید احمدؒ کے بیرونی سفر سے متعلق کچھ خاندان کے کاغذات اور روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ آخر الذکر بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سید احمدؒ کی ملاقات سے متعلق اصلی کاغذات اور اس موقع پر جو مذہبی مذاکرے ہوئے وہ خانقاہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور دیوان ابوالحسن فردؔ کے مرتب نے ان سے کام لیا تھا۔ اس دیوان کے تتمہ میں فردؔ کے سوانح حیات درج ہیں۔

اور سید احمدؒ کے ورود پھلواری کے واقعات کے ساتھ عبدالحق کا نام بھی مذکور ہے جو سید احمدؒ کے ہمرکاب تھے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عبدالحق مدینہ سے یمن چلے گئے اور سید احمدؒ کے ساتھ نہیں لوٹے، اس لیے بظاہر یہ ورود سفر میں جاتے ہوئے ہوا[1] نہ کہ واپسی میں)

پھلواری کے بعد دوسرا پڑاؤ پٹنہ میں ہوا جہاں قافلہ دو ہفتے ٹھہرا وہ مدرسہ گھاٹ پر اترا جو شہر پٹنہ کے مشہور مدرسہ سیف خاں کے سامنے ہے۔ نذیر حسین محدث کے سوانح نگار[2] انہیں سے روایت کرتے ہیں کہ قافلہ گول گھر کے قریب شہر کی مغربی سرحد پر اترا تھا اور اس کے قریب کے میدان (لان) میں نماز پڑھی گئی۔ اس جماعت میں ایک جم غفیر شریک نماز تھا جس میں نذیر حسین بھی شریک تھے۔ بہر حال اس مسئلہ پر مؤلف مخزن احمدی کی شہادت زیادہ معتبر ہے کیونکہ وہ خود اس قافلہ کا ایک فرد تھا اور اس کی کتاب اس واقعہ کے صرف بیس سال بعد تالیف ہوئی، حالانکہ دوسری کتاب اس کے بہت بعد تالیف ہوئی۔ اس کے علاوہ مدرسہ گھاٹ شہر کے مرکز میں واقع ہے اور گول گھر شہر کی بیشتر آبادی مشرقی حصہ میں آباد تھی جسے اب پٹنہ سٹی کہتے ہیں۔ شہر کا مغربی اضافہ بہت بعد کی توسیع ہے۔ سید احمد رحمہ اللہ تعالیٰ زیادہ تر اسی مشرقی حصہ میں ٹھہرتے اور کام کرتے تھے۔ اس لیے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ قافلہ مدرسہ گھاٹ پر اترا ہو گا جہاں شہر کے علاقے میں جانا مخالف سمت گول گھر سے جانے سے سہل تر اور قریب تر تھا۔ بہر حال یہ بالکل ممکن ہے کہ پٹنہ کے قیام کے دوران میں لان میں نماز باجماعت ہوئی ہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قافلہ گول گھر ہی میں کشتیوں سے اترا ہو۔

پٹنہ میں سید احمدؒ کے پہلے ورود کے حالات میں جو ایک طرف سید احمدؒ کے دو

---

[1] غلام رسول مہر ص ۲۰۷

[2] فضل حسین مؤلف حیات بعد الممات۔ آگرہ سنہ ۱۹۰۸ء ص ۲۵-۲۸

معتبر تذکرہ نگاروں، اے ایچ ندوی اور غلام رسول مہر نے اور دوسری طرف جعفر تھانیسری اور عبدالرحیم نے بیان کیے ہیں نمایاں اختلاف ہے۔

خاص نقطۂ اختلاف یہ ہے آیا سید احمدؒ سے خاندان صادق پور کی بیعت اُن کے پہلے ورود میں ہوئی یا ان کے مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد دوسرے ورود میں۔ اس نقطے پر سید احمدؒ کا معاصر اور معتبر تذکرہ نگار مولف مخزن خاموش ہے۔ ندوی اور مہر دونوں اس وقوع کو پہلے ورود میں بتاتے ہیں۔ مگر جعفر تھانیسری اور عبدالرحیم کا بیان ہے کہ اگرچہ خاندان صادق پور کے دو معمر افراد شاہ محمد حسین اور فتح علی سید احمدؒ کے پہلے ورود میں ان سے ملے مگر ان کے مختصر قیام کی وجہ سے بیعت نہیں کی تھی۔ یہ بعد واپسی سفر حج انجام پائی۔ ان دونوں مؤلفوں نے جو وجہ بتائی ہے وہ کچھ عجیب سی ہے کیونکہ سید احمدؒ وہاں دو ہفتے قیام پذیر رہے۔ اتنے عرصے میں آسانی سے بیعت ہو سکتی تھی۔ ایک ممکن تاویل خود ولایت علی کی اس وقت پٹنہ میں غیر موجودگی ہو سکتی ہے۔ مؤلف تذکرہ صادقہ کے بیان کے مطابق ولایت علی اس سے پہلے سید احمدؒ کے عظیم مشن اور پٹنہ کو مجوزہ روانگی کے بارے میں اپنے خاندان کو لکھ چکے تھے اور ان سے بیعت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر جب سید احمدؒ پہنچے تو ولایت علی پٹنہ میں نہ تھے[1] شاید اسی لیے اس معاملہ کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ جب ولایت علی کو

---

[1] ولایت علی کی سید احمدؒ کے قافلے اور اپنے گھر سے غیر حاضری بجائے خود ایک معمہ ہے۔ تذکرہ صادقہ کے بیان کے مطابق لکھنؤ میں بیعت کرنے کے بعد وہ سید احمدؒ کے ہمراہ بریلی جا رہے۔ بہرحال وہ سید احمدؒ کے اس قافلے میں موجود نہ تھے جو بریلی سے چلا تھا۔ نہ وہ اس وقت پٹنہ ہی میں تھے۔ اس لیے قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بریلی میں رہنے کے بعد وہ اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے لکھنؤ واپس چلے گئے جہاں سے وہ سید احمدؒ سے ملاقات کے بعد یک بیک رخصت ہو گئے تھے۔

یہ معلوم ہوا تو ان کو بڑی مایوسی ہوئی۔ سید احمد کی مراجعت کے وقت تک ولایت علی پٹنہ واپس آچکے تھے اور انہوں نے اور شاہ محمد حسین نے پٹنہ سے آگے بڑھ کر مونگیر میں ان کا استقبال کیا اور اپنے صادق پور کے مکان میں ان کو ملنے آئے جہاں ان دونوں نے اور مولوی الٰہی بخش نے علیحدہ علیحدہ ان کی ضیافت کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید احمدؒ کے پہلے ورود کے وقت ولایت علی کی غیر موجودگی ہی اس وقت بیعت کے عدم وقوع کا باعث ہوئی۔

اس کے علاوہ اس امر خاص میں عبدالرحیم کی شہادت زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے وہ اسی خاندان کے فرد تھے اور اگرچہ وہ اس واقعہ کے سولہ سال بعد پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے تعلقات ان اصحاب سے بہت قریب کے تھے جنہوں نے سید احمدؒ سے بیعت کی تھی اپنے خاندان کے افراد کی جو اس تحریک کی تاریخ میں سربرآوردہ تھے تذکرہ نگاری میں ایسے مسئلہ پر غلطی نہیں کی ہو گی۔ اس کے علاوہ مہر یا ندوی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ کوئی خاص سبب بتایا ہے نہ ذریعۂ واقفیت کا اظہار کیا ہے۔

تبت کے کچھ مسلمانوں سے ملاقات

سید احمدؒ کے پٹنہ میں اقامت کے دوران ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ تبت کے کچھ باشندوں کی ایک ٹولی سے ملاقات ہوئی جس میں چھ مرد اور تین عورتیں تھیں۔ یہ سب علازم سفر حج تھے مگر خرچ کے کم ہو جانے سے پٹنہ میں رکے ہوئے تھے۔ سید احمدؒ نے ان کو سمجھا دیا کہ حج ان پر واجب ہے جو اس کے سفر کی استطاعت رکھتے ہوں اور چونکہ ان کو مالی تنگی لاحق ہے وہ اپنے وطن واپس جائیں (انہوں نے ان کو یہ صلاح بھی دی کہ ان کی (سید احمدؒ کی) تعلیمات اپنے ملک میں شائع کریں) انہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کی مراجعت وطن کے لیے روپے دیے گئے[1] انہوں نے ان کو تبت میں اپنے مشن کی تبلیغ کا مجاز بھی کیا۔

---

[1] مہر جلد صفحہ ۲۰۹-۲۱۰۔ سیرۃ صفحہ ۲۱۸-۲۱۹

قصبہ باڑھ اور سورج گڑھ میں قیام

پٹنہ کے بعد دوسرا پڑاؤ قصبہ باڑھ میں ہوا۔ آس پاس سے بہت لوگوں نے آکر بیعت کی۔ ان میں سے جن کے نام لیے گئے ہیں خواجہ مولا بخش، خواجہ افضل علی، واجد علی خاں۔ شیخ سوہن اور اکرام الحق تھے۔

سید احمدؒ باڑھ کے بعد سورج گڑھ (ضلع مونگیر) پہنچے جہاں سید اور پٹھان خاندان کے بہت سے افراد سکونت رکھتے تھے۔ وہاں بہت سے سربرآوردہ لوگوں نے بیعت کی ان میں سے ایک عنایت حسینؒ تھے جو بہت بعد کے زمانوں تک وہابی فنڈ میں چندہ دیتے رہے۔ آس پاس کے گاؤں اکبر نگر، اُرین اور بیلتھو کے بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔

راج محل میں قیام

سید احمدؒ سورج گڑھ سے مونگیر آئے اور وہاں ایک روز ٹھہرے۔ وہاں کے ایک معزز مختار زکی الدین نے بھی بیعت کی۔ پھر قافلہ بھاگل پور آیا[1] اور وہاں سامان اور رسد کی خریداری کے لیے ایک روز ٹھہرا۔ بہار میں آخری پڑاؤ راج محل میں ہوا ایک شخص محمدی انصاری جس نے پہلے میرٹھ میں بیعت کی تھی سید احمد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے گاؤں جانے کے لیے آمادہ کیا جو راج محل سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہاں

---

[1] مخزن: بھاگل پور میں ملا شہباز کے مشہور مزار کے موجودہ سجادہ نشین کے ماموں صادق صاحب کی شہادت کے مطابق سید احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی جماعت براری گھاٹ پر ٹھہری رہی۔ صرف مولانا اسماعیل سجادہ نشین سے ملنے خانقاہ آئے کہ اپنے مشن کی تبلیغ کریں۔ مگر شاہ صاحب راضی نہ ہوئے اور قافلہ آگے بڑھ گیا۔ خانقاہ کے کاغذات میں یہ ذکر موجود ہے۔

[2] ان کشتیوں میں دوسرے مسافر بھی تھے۔ یہ بزرگ (باقی ص۷۳ پر ملاحظہ ہو)

اس کے تمام افرادِ خاندان نے بیعت کی۔ ان میں سربرآوردہ منشی شاہ محمد، منشی رؤف الدین مخدوم بخش، حسن علی، فضل الرحمٰن اور عزیز الرحمٰن تھے۔ شاہ محمد سفرِ حج میں سید احمد کے ساتھ ہو گئے۔

کلکتہ میں قیام و روانگی

سید احمدؒ راج محل سے چل کر (صفر ۱۲۳۷ھ مطابق ستمبر ۱۸۲۱ء کو) مرشد آباد اور کٹوا (ضلع بردوان) میں مختصر قیام کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ میں ان کا قیام سب سے طویل تھا (تین ماہ سے زیادہ۔ وہاں بھی مضافاتی گاؤں اور دُور دراز مقامات جیسے سلہٹ اور چاٹگام سے لوگ بیعت کے لیے حاضر ہوئے۔

کلکتہ سے روانگی کے وقت قافلہ ۷۵۰ افراد تک پہنچ چکا تھا۔ یہ دس ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر ایک ٹولی ایک ایک سردار کے ماتحت کر دی گئی تھی۔ متفرق ٹولیاں علیحدہ علیحدہ کشتیوں پر سوار ہوئیں۔ پوری جماعت گیارہ کشتیوں میں پھیل گئی۔ سید احمدؒ نے ان کا صرف کرایہ تیرہ ہزار روپے ادا کیا۔ اس میں سے زیادہ تر مختلف مداحوں اور متبعین نے بطور تحفہ عطیہ پیش کیا تھا۔

مراجعت ہند

حج ادا کرنے کے بعد سید احمدؒ ہندوستان لوٹے۔ وہ بمبئی میں اُترے اور چند دن وہاں مقام کر کے اُسی جہاز سے صفر ۱۲۳۹ھ (مطابق اکتوبر ۱۸۲۳ء) کو کلکتہ پہنچے جہاں دو ماہ سے زیادہ ٹھہرے۔ ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو وہ اپنے وطن بریلی پہنچے۔ واپسی میں وہ پھر اُن جگہوں

ڈاکٹر اختر احمد اورنیوی پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی کے پردادا تھے۔

لہ ملحوظ رہے کہ محمد بن عبد الوہاب ۱۷۹۲ء میں وفات پا چکے تھے۔ سید احمدؒ کی ان سے ملاقات خارج از بحث ہے (مترجم)

میں ٹھہرے جہاں پہلے جا چکے تھے۔ ان میں مونگیر بھی تھا جہاں کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ مقامی بندوق ساز کارخانے توپ بندوق اور آتشیں اسلحہ کے لیے مشہور تھے۔ وہاں سے متعدد بندوقیں طمنچے اور چار نالی توپیں خریدیں۔ ولایت علی اور محمد حسین جو سید احمدؒ کے استقبال کے لیے وہاں منتظر تھے اُن کو پٹنہ لے آئے۔

احمد اللہ کا عقد

پٹنہ میں ولایت علی نے سید احمدؒ کو اپنے گھر مدعو کیا۔ وہاں بھی خاندان کے تمام افراد نے بیعت کی۔ تیسرے روز احمد اللہ کے والد الٰہی بخش نے اپنے بیٹے کی تقریب شادی میں سید احمدؒ کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ خود سید احمدؒ نے نکاح پڑھایا۔ اس تقریب میں ایک عظیم الشان ضیافت کی گئی جس میں آٹھ سو سے نو سو آدمیوں نے حصہ لیا۔ احمد اللہ کا اصلی نام احمد بخش تھا مگر سید احمد نے دوبارہ ان کا نام احمد اللہ رکھا اور اسی نام سے وہ ہمیشہ مشہور رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا اصل نام ولی بخش تھا۔ انہوں نے بھی بیعت کی اور نیا نام ولی اللہ رکھا گیا۔

خاندان صادق پور کی اہمیّت

خاندان صادق پور کے ارکان کی بیعت ان کے انفرادی اور خاندانی مستقبل کے لیے ایک نقطۂ انقلاب تھا۔ تحریک کے مقاصد کی تکمیل اب اُن کی تمام توجہات اور طاقتوں کا مرکز بن گئی۔ وہ شمالی و مغربی سرحد کے دُور دراز سنگلاخ علاقوں میں فوجی خدمات بجا لانے کے جرأت طلب خطرناک جدوجہد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس تحریک کے بعض اوّلین اور اہم متبعین کے مختصر سوانح حیات علیحدہ علیحدہ بیان کیے گئے ہیں۔ اس مقام پر سید احمد کے اول خلیفہ یا نائب شاہ محمد حسین کے حالات ایک باقاعدہ سند یا فرمان کی بنا پر جو اس قسم کی تنہا دستاویز ہے اب تک موجود ہے۔

شاہ محمد حسین خلیفہ اوّل

شاہ محمد حسین شہر پٹنہ کے شاہ محمد معز کے بیٹے تھے اور ۱۲۰۳ھ (۸۹-۱۷۸۸ء) میں پیدا

ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے چچا شاہ محمد کریم سے حاصل کی اور ان سے بیعت بھی کی۔ بعد میں اپنے پہلے مرشد کی اجازت سے سید احمد کے ہاتھ پر بھی بیعت کی۔ ان کی شادی دیورہ (ضلع گیا) کے غلام مجتبیٰ کی دختر سے ہوئی۔ اس شادی کے ذریعے سے وہ بھاگل پور کے مشہور و معروف بزرگ ملا شہباز[1] کے خاندان سے بھی مربوط ہو گئے۔ وہ سید احمدؒ کے اوّلین خلفاء میں سے تھے۔

سندِ خلافت

وہ نایاب سند جو سید احمدؒ نے ان کو دی تھی اس کی ایک نقل اب بھی موجود ہے۔ اس کے کچھ ضروری اجزا کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اُن لوگوں کو جو راہِ خدا کے جویاں ہیں بالعموم اور اُن لوگوں کو جو حاضر و غائب سید احمدؒ کے دوست ہیں بالخصوص، معلوم ہو کہ جو لوگ بیعت کے ذریعے سے مقدس نفوس کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مرید ہو جاتے ہیں ان کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے اور یہ موقوف ہے اس کے رسول کے احکام کی پیروی پر۔ جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ رضائے الٰہی کا راستہ شریعت رسول کے اتباع کے بغیر بھی مل سکتا ہے وہ باطل پر ہے اور فریب خوردہ ہے۔ اس کا دعوٰے غلط اور ناقابل التفات ہے۔ شریعت نبوی دو باتوں پر قائم ہے۔

اول کسی مخلوق سے خالق کی صفات منسوب نہ کرنا۔

دوم۔ ایسے رسوم و اطوار سے احتراز جو رسول اللہ اور ان کے خلفاء کے زمانے میں رائج نہ تھے۔

پہلی شرط کے معنی ہیں (۱) عدم اعتقاد اس بات پر کہ فرشتے، ارواح پیر و مرشد، استاد، طالب علم، پیغمبر یا ولی کسی مشکل کو رفع کر سکتے ہیں (۲) ان ہستیوں میں سے کسی

---

[1] بھاگل پور کے ایک مشہور ولی اللہ، شاہجہاں کے معاصر تھے۔ ان کا قائم کردہ مدرسہ آج تک موجود ہے۔

کو کسی خواہش یا مراد کے حاصل کرنے کے لیے مدد طلب کرنے سے اجتناب (۳) اس بات سے انکار کہ ان میں سے کسی کو مدد دینے یا ضرر کو دفع کرنے کا اختیار ہے (۴) خدا کی قدرت میں ان کو ایسا ہی مجبور و بے خبر سمجھنا جیسا اپنے آپ کو —— بلکہ ان کو محض اللہ کا حبیب سمجھنا اور ان کو رضائے حق کی راہ کا محض راہنما سمجھنا۔

دوسری شرط بدعت یعنی مذہب میں کسی جدت طرازی کو دخل نہ دینے کے معنی میں (۱) معاشرت میں ان تمام عبادات اور رسوم و عادات پر سختی سے پابند رہنا جو عہد نبوی کے معمولات تھے (۲) ایسی بدعات سے احتراز کرنا جیسے رسوم شادی، تعظیم قبور، قبروں پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرنا، مُردوں کی برسیوں میں صرف کرنا، تعزیہ سازی وغیرہ (۳) جہاں تک ممکن العمل ہو ان رسوم کو بند کرنا....

"وہ سب لوگ جو اللہ کے طالب ہیں ان کے لیے مناسب ہے کہ ان باتوں کو اپنے سامنے رکھیں اور ایک دوسرے سے مل کر ان پر عمل کریں اور یہ عمل بالخصوص شاہ محمد حسین کے تعاون سے کریں جنہوں نے مجھ سے بیعت کر کے اس کا اقرار کیا ہے اور جن کو میں نے یہ ساری باتیں پوری طرح بتا دی ہیں۔ اور ان کو اختیار دیا ہے کہ وہ تم سے بھی ایسے اقرار لیں اور میری جگہ یہ پاکیزہ عادات و اطوار تمہیں سکھائیں۔ اس لیے شاہ محمد حسین موصوف کو مناسب ہے کہ ان احکام کو اختیار کریں جو ان کو بتا دیے گئے ہیں، اپنے جسم و جان سے خدا کی طرف رجوع کریں، اور ان احکام کے ظاہر و باطن پر عمل کر کے شرک و بدعات کی ہر گرد کو جھاڑ دیں جو اُن کے دامن پر پڑی ہو۔ اور لوگوں کو راغب کریں کہ ان سے بیعت کر کے عہد و اقرار کریں۔ خدا کرے میں اور میرے سارے رفقا اس گروہ میں شامل ہو جائیں جو توحید کے معتقد اور شریعت کے متبع ہیں۔"

مہر

احمد ۱۲۳۵ھ

سند خلافت کی مہر کی تاریخ میں اختلاف

متذکرہ مہر میں جو تاریخ درج ہے وہ سید احمدؒ کی مراجعت حج کے دوران پٹنہ کے ورود کی عام تسلیم کردہ تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ شوال ۱۲۳۶ھ میں بریلی سے روانہ ہوئے تھے۔ پٹنہ کے اس ورود سے پہلے کبھی ان کا محمد حسین سے ملنا کہیں مذکور نہیں۔ اس لیے ۱۲۳۶ھ (۲۱-۱۸۲۰ء) کے اختتام سے پہلے ان کے بیعت لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں یہ ذکر بھی بے موقعہ نہ ہو گا کہ سید احمدؒ کے پھلواری شریف جانے کی تاریخ بھی مولانا فرد کے سوانح نگار[1] نے ۱۲۳۳ھ تحریر کی ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو یہ سند کی تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے، کیونکہ اگر سید احمدؒ اپنے بیرونی سفر میں ۱۲۳۳ھ میں پھلواری شریف گئے تو مراجعت رجب کہ محمد حسین نے بیعت لی، ۱۲۳۵ھ میں ہوئی ہو گی۔ مخزن کے زیادہ معتبر بیان کے مقابلے میں اس تاریخ کو قبول کرنے میں دشواری یہ ہے کہ فرد کے سوانح حیات بہت بعد کی تالیف ہے اور اس میں سید احمدؒ کے ورود کی جو تاریخ مولف نے درج کی ہے اس کی کوئی سند نہیں لکھی۔ بہر حال مخزن اور وقائع میں جو تاریخ مذکور ہے اسے زیادہ معتبر ماننا ہو گا۔ اس صورت میں سندِ خلافت کی تاریخ ۱۲۳۵ھ کی تاویل و توثیق کس طرح ہو؟

تاریخوں کی اس نامطابقت کی ایک ممکن تعبیر یہ حقیقت ہے کہ بعض ذاتی مہروں میں تاریخ کندہ ہوا کرتی تھی اور یہ کندہ تاریخیں دوسرے سال کے شروع ہوتے ہی اور اکثر کئی سال بعد تک بدلی نہ جاتی تھیں۔ اس طرح مہر اور متن کی تاریخوں میں فرق ہو جایا کرتا تھا۔

شاہ محمد حسین کی خدمات

شاہ محمد حسین نے تحریک کی تنظیم نَو کا کام نہایت تن دہی سے شروع کر دیا۔ انہوں نے

---

[1] حکیم شعیب ص ۱۸

شہر کی متعدد مساجد میں نماز جماعت اور خطبہ باقاعدہ جاری کر دیا۔ انہوں نے شہر کی بہت سی غیر آباد مساجد مع مسجد تیموہیاں کو آباد کر دیا[1] وہ سید احمدؒ کی تعلیمات کے خاص خاص پہلوؤں کی تبلیغ و توضیح کیا کرتے اور ان میں سے بعض پر عمل کر کے ذاتی مثالیں قائم کرتے۔

۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں ساٹھ سال کی عمر میں حج کو گئے اور دو برس میں واپس آئے انہوں نے ۷۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی بیوی کا انتقال ہوا ان کے چھ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے چار الٰہی بخش کے بیٹوں سے اور دو دوسروں سے بیاہی گئیں۔ دینیات میں عالم فاضل ہونے کے علاوہ انہیں فوجی تربیت بھی حاصل تھی۔ وہ ممتاز شہسوار اور قادر انداز سپاہی تھے۔ وہ شاعر بھی تھے (ہاشمی تخلص کرتے تھے) فارسی اور اردو میں شاعری کی تھی۔

پٹنہ سے چل کر سید احمدؒ نے مرزا پور بنارس اور الٰہ آباد کے مختصر دورے کیے آخر اپریل ۱۸۲۴ء میں وہ بریلی واپس آئے۔ اس طرح سفر حج اور مراجعت وطن تک تین سال صرف ہوئے اور مجموعی صرفہ ایک لاکھ روپے کے قریب ہوا[2]

ہجرت کی تیاری

سید احمدؒ اپنی مراجعت کے بعد تقریباً دو سال اپنی زندگی کے ایک سخت ترین سفر کی تیاریوں میں دل و جان سے مصروف رہے۔ یعنی برطانوی ہندوستان کی حدود سے نکل کر شمالی مغربی سرحد کے آزاد قبائلی علاقوں کو مہاجرت (جہاں سے ان کو اپنی کش مکش اور آویزش کا آغاز کرنا تھا۔ درمیانی وقفہ سید احمدؒ کے بعض ممتاز نائبین کے تبلیغی دوروں پہ صرف ہوا۔ وہ آس پاس کے علاقوں میں دورے کرتے اور اپنے مشن کے اغراض و مقاصد بیان کرتے اور ہجرت میں شرکت کے لیے رضاکار تلاش کرتے۔ رضاکاروں کی ایک کثیر تعداد جو سید احمدؒ سے بریلی میں آملی اور بعد میں شمالی مغربی سرحد میں رضاکاروں کی مسلسل آمد سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی مساعی بہت کامیاب ہوئیں۔

---

[1] مقامی وہابی اب تک وہاں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ [2] مہر جلد ۱ صفحہ ۲۴۱

(ب) مہاجرت اور شمالی مغربی سرحد کی جنگی مہمیں

مجاہدین کی روانگی

حج سے واپسی کے بعد سید احمدؒ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کی سرحد کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ اس بخت آزما سفر کے لیے تمام سامان مکمل کر لینے کے بعد وہ جنوری ۱۸۲۶ء (جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ) کو بریلی سے روانہ ہوئے۔ وہ دلماؤ۔ فتح پور، گوالیار اور ٹونک کے راستے سے چلے۔ گوالیار کے دوران قیام میں مہاراجہ دولت رام سندھیا نے اپنے محل پر مدعو کر کے ان کی ضیافت کی۔ سندھیا کے برادر نسبتی ہندو راؤ سے طویل گفت گو رہی۔ پھر سرحد سے بھی سید احمدؒ نے ہندو راؤ کو ایک معنی خیز خط بھیجا۔ نوابانِ ٹونک امیر خاں اور ان کے صاحبزادے وزیر الدولہ سید احمدؒ کے سرگرم متبع تھے۔ اور تحریک کی مختلف جہت سے مدد کی تھی۔ سید احمدؒ ٹونک سے نکل کر راجپوتانہ، سندھ اور بلوچستان کے ریگزاروں سے ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۲۶ء میں پشاور پہنچے۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے سیاسی حالات

احمد شاہ ابدالی کے تسلط کے بعد شمالی مغربی سرحد پر تراج کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کے بیٹے اور پوتے تیمور شاہ اور زمان شاہ کی پے در پے حکومتیں اندرونی نااتفاقیوں بغاوتوں اور فنا و زوال کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ پلیندا خاں بارک زئی کے زمان شاہ کے ہاتھ سے قتل نے طاقتور اور با اثر بارک زئی کو دشمن بنا لیا تھا۔ مقتول سردار کا بیٹا فتح خاں زماں شاہ کے بھائی محمود شاہ سے جا ملا جو کابل پر حکمرانی کر رہا تھا۔ دونوں مل کر زماں شاہ پر حملہ آور ہوئے اور اُسے شکست دی۔ اُس کے بھائی شاہ شجاع نے محمود شاہ سے کچھ دن جنگ جاری رکھی۔ آخر کار انگریزوں کے پاس پناہ لی۔ انگریزوں نے اس کو پنجاب میں بسا دیا جہاں اُسے

اُس کا بھائی زماں شاہ بھی مل گیا۔ دونوں کو انگریزوں نے سیاسی پناہ اس لیے دی تھی کہ مناسب وقت آنے پر افغانستان میں قدم جمانے کے لیے ان کے اثر سے کام لیا جا سکے۔ محمود شاہ کی کامیابیاں زیادہ تر فتح خاں کی مدد اور تعاون کی بدولت تھیں اس لیے فتح خاں کو حکومت کے معاملات میں زبردست اثر حاصل تھا۔ محمود کے بیٹے کامران کو جس نے فتح خاں کو قتل کرایا تھا یہ بات ناپسند تھی۔ فتح خاں کے بھائی جو برادران بارک زئی کے نام سے مشہور تھے اور حکومت کے مختلف علاقے جن کے سپرد تھے باغی ہو گئے اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ صرف ہرات اور اس کے کچھ مضافات محمود شاہ کے قبضے میں رہ گئے۔ ان بارک زئی سرداروں میں سب سے مشہور یار محمد خاں، پیر محمد خاں، سلطان محمد خاں اور عظیم خاں تھے۔ سید احمدؒ کے ساتھ ان کا متحدہ تعاون اور بعد میں مخاصمت آگے چل کر بیان کی جائے گی۔ ان سرداروں میں یار محمد اور سلطان محمود علاقہ پشاور کے حکمران اور رنجیت سنگھ کے باجگزار تھے۔ دل سے سکھوں کے علاقہ سرحد پر قبضے کے خلاف تھے لیکن ان کی اندرونی رقابتیں اور باہمی حسد وکینہ سکھوں کے خلاف مل جل کر کام کرنے میں مانع تھے۔

پنجاب کے سیاسی حالات

کپتان الگزینڈر برنس کی سفارتِ کابل کے دوران اس کے سیاسی مراسلات، پنجاب کی سیاسی حالت اور اس زمانے میں سندھ کے مغرب سکھوں کی حالت سے متعلق قیمتی اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔

باہمی قبائلی جنگ وجدال کے سبب سے ایک مدت کے انتشار، بدنظمی اور کمزوری کے بعد پنجاب کا زیادہ تر حصہ رنجیت سنگھ کے مضبوط قبضے میں آ گیا تھا۔ انگریزوں سے اس کے تعلقات دوستانہ تھے اور باہمی سیاسی مفادات کے رشتوں سے منسلک تھے۔ موٹی اور صاف بات یہ تھی کہ ہندوستان کے شمالی مشرقی سرحدوں پر روس کی چڑھائی کے خطرے

---

[1] جے ڈی کننگھم کی تاریخ سکھ ص ۲۱۴-۲۵۶

سے رنجیت سنگھ کے ماتحت ایک مضبوط اور پائیدار حکومت اس خطرے کی تنہا روک تھی۔ رنجیت سنگھ بھی اس فرضی خطرے کے عمل میں آنے سے اپنے قرار و قیام کے خطرے سے واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ انگریزوں[1] کی مدد کے بغیر اس خطرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ معاہدہ امرتسر مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء کی رو سے رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے صلح و ائتلاف قائم رکھنا اور ستلج کے بائیں کنارے پر زیادہ لشکر نہ رکھنا اور سِس ستلج کے امان دادہ سرداروں کے خلاف یورش نہ کرنا منظور کر لیا تھا۔ اس کے صلے میں اس کو ستلج کے پار علاقے میں توسیع کا کھلا میدان دیا گیا تھا۔ رنجیت سنگھ انگریزوں سے کھلی آویزش کے خطرات سے واقف تھا، اس لیے زندگی بھر معاہدات کی دفعات کا احتیاط سے پابند رہا۔ اگرچہ فریقین کے اپنے اپنے حلقۂ اثر کی توسیع کے لیے دونوں میں بہت کچھ بدگمانیاں موجود تھیں۔

ماورائے ستلج کا علاقہ متفرق پٹھان سرداروں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بٹا ہوا تھا جن کا حلقۂ اثر اور وفاداری ہمیشہ بدلتی رہتی اور نہایت پیچیدہ، وقتی و عارضی ہوا کرتی۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور برادران بارک زئی مذکور الصدر تھے۔ باقی اگرچہ برائے نام سکھوں کے ماتحت یا زیر دست تھے لیکن ہمیشہ ان کے ساتھ "مارو اور بھاگ جاؤ" (گوریلا) کی چال چلا کرتے تھے۔ اس علاقے پر سکھوں کا قابو کسی پائدار سول (ملکی) حکومت سے زیادہ فوجی قبضے کی قسم کا تھا۔ جب جب قبائلیوں سے ٹیکسوں یا جرمانوں کی تحصیل کے لیے کوئی مہم بھیجی جاتی تو یہ قبائل اپنی مخفی پناہ گاہوں میں جا رہتے اور سکھ ان کے گاؤں کو آگ لگا کر اور برباد کر کے انتقام لیتے۔ ان جفاکش جنگ آزمودہ قبائلیوں کی جنگی صلاحیت بہت اچھی تھی اور شاید سید احمد کا اس علاقے کو اپنی جدوجہد کا صدر مقام منتخب کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ اس علاقے میں مع کشمیر سکھوں کی سیاسی طاقت کی توسیع کا راستہ پیچ در پیچ اور لڑائیوں اور سازشوں سے مملو تھا۔

---

[1] ایم گریگور کی تاریخ سکھ ص ۲۰۳-۲۰۴

سرحدی سرداروں کے نام خطوط

سید احمدؒ نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کئی سرداروں کے نام مسلسل خطوط لکھ کر اپنے مشن میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ ان خطوط کے مضامین اور منشا یہ جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور تحریک کے اس رُخ کی اطلاع کے اولین ذریعے ہیں علیحدہ نظر و بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ بعض سرداروں کے پاس خاص قاصدوں کے وفد کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً مراسلات کے سلسلہ کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ان سرداروں میں حسب خواہ دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک نظام عمومی سے وابستہ ہو کر سکھوں کے دست برد سے اپنے وطن اور زمین کی بازیافت بے شبہ ایک دل خوش کن خیال تھا۔

سید احمدؒ کی لڑائیاں زیادہ تر اُن علاقوں میں جو اب اضلاع ہزارہ، پشاور پر مشتمل تھے اور سوات اور بُنیر کے ملحقہ قبائلی علاقوں میں لڑی گئیں۔ یہ لڑائیاں دو قسموں پر تقسیم کی جا سکتی ہیں (۱) سکھوں کے خلاف (۲) ان مقامی سرداروں کے خلاف جو غدار ہو گئے تھے۔ آسانی کے لیے ان پر ترتیب زمانی سے بحث کی گئی ہے۔

جنرل بدھ سنگھ کی پیشقدمی

پشاور میں مختصر قیام کے بعد سید احمد بڑوسی علاقے یوسف زئی[1] جا رہے اور ہشت نگر میں ٹھہر گئے۔ اس علاقے میں ان کی آمد نے بڑا سیاسی جوش و خروش پیدا کر دیا جس نے سکھ دربار کو چونکا دیا۔ جنرل بدھ سنگھ کے ماتحت جو رنجیت سنگھ کا چچازاد بھائی اور بہترین

---

[1] یوسف زئی کا رقبہ پشاور اور آمب کی شمالی پہاڑیوں کی وادیوں تک وسیع تھا اور ان میں طاقتور افغان قبائل سکونت پذیر تھے۔ ان میں سے قبیلہ خودخیل کا سردار فتح خاں پنجتاری رقبہ میں اور سکھ حکومت کی مخالفت میں سب سے نمایاں تھا۔ سکھ اپنی فوج کا ایک باقاعدہ دستہ اٹک کے شمال میں متعین کر کے اس علاقے کو قابو میں رکھتے تھے[2] ضلع پشاور کا یہ پرگنہ آٹھ گاؤں پر مشتمل ہے، جس گاؤں میں سید احمدؒ نے اقامت کی وہ چارسدہ تھا۔

سکھ جنرلوں سے تھا۔ دس ہزار فوج کے ساتھ حالات کے جائزہ کے لیے روانہ کیا گیا۔ یہ سکھ جنرل دریائے سندھ پار کر کے دریائے کابل تک جا پہنچا۔ اگر اسے پار کر لیتا اور سیما (وادی) کے رقبہ میں داخل ہو جاتا تو قبائل میں عام گھبراہٹ پیدا ہو جاتی۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ اُس سے دریا کے اُس پار ہی اُلجھا جائے۔

سکھوں سے پہلی جھڑپ : سکھوں سے پہلی جھڑپ نوشہرہ کے قریب ایک مقام اکوڑا پر ہوئی۔ بدھ سنگھ کی کمان میں سکھ فوج کی بہت کثیر تعداد تھی اس لیے شب خون مارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ حملہ ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو ہوا جس میں سکھوں کے ۵۰۰ سپاہی کام آئے[1] مگر وہابیوں کی اس ابتدائی کامیابی کے باوجود سکھوں نے پھر دھاوا کر دیا اور وہابی پسپا ہوئے۔

حریص زرقبائل : اس کے کچھ ہی بعد ہنڈ کا سردار کھادے خاں سید احمدؒ سے آملا، بیعت کی، اور اُن کو ہنڈ آنے کی دعوت دی جہاں ان کی جماعت کے قیام کے تمام انتظامات کر دینے کا وعدہ کیا۔ اُس وقت تک سید احمدؒ نے اپنی جدوجہد کے لیے کسی مستقل مرکز کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ معرکہ اکوڑا کے بعد سے وہ نوشہرہ میں اقامت گزین تھے۔ چنانچہ انہوں نے کھادے خاں کی درخواست مان لی اور ہنڈ کو چار ہے جو اُس علاقے میں ان کی جدوجہد کا پہلا منظم مرکز بنا۔ کھادے خاں نے اور سرداروں کے ساتھ حضرو پر شب خون مارنے کے لیے مشورہ کیا۔ یہ سکھوں کی ایک اہم تجارتی منڈی تھی ان سرداروں کا اصل مقصد جیسا کہ بعد میں ظاہر ہو گیا لوٹ مار اور لالچ تھا۔ سید احمدؒ کے مقاصد اور تھے اور اعلیٰ و ارفع تھے۔ وہ اور ان کے متبعین مجوزہ حملہ سے بے تعلق ہو گئے بہرحال قبائل اپنے منصوبے کے ساتھ آگے بڑھے اور قبائلی طرز کا ایک دھاوا منظم کیا۔ سکھوں نے ان کا مقابلہ کر کے بھگا دیا۔ یہ پسپائی ایک ناقابل تلافی تباہی ہوتی اگر سید احمدؒ کے متبعین اس پسپائی میں سہارا نہ دیتے اور ان قبائلیوں کو بہت زیادہ جانوں کے اتلاف

---

[1] ایل گریفن کی تالیف "رنجیت سنگھ" آکسفرڈ ۱۸۹۲ء ص ۲۱۱

سے نہ بچاتے۔ یہ واقعہ سید احمدؒ کی سرگزشت سے براہِ راست تعلق تو نہیں رکھتا مگر اس لیے یہاں اس کا ذکر کیا گیا کہ یہ سید احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی جنگی مہمات کے منصوبے میں نقطۂ انقلاب کا حکم رکھتا ہے انہوں نے بڑے دُکھ اور مایوسی کے ساتھ اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ یہ قبائلی جو اِن سے آملے تھے ان کی نیت نہ اتنی صاف تھی نہ مطمع نظر میں وسعت و خلوص تھا۔ ان میں سے اکثر کا مقصد حقیر اور ذلیل تھا۔ وہ صرف تاخت و تاراج اور لوٹ مار کے خواہاں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سید احمدؒ کی تمام جد و جہد میں یہ ایک زہر ثابت ہوا۔ سید احمد کے جاں نثار متبعین کے گروہ جنہیں "ہندوستانی مجنون" کا لقب دیا گیا اور ان حریص زر قبائلیوں کے مطمع نظر اور نیتوں کے فرق نے ہمیشہ سید احمدؒ کے فوجی موازنہ و مقائسہ کو تحس نحس کر کے رکھ دیا۔ ناچار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تحریک کی پوری سیاسی اور فوجی نگرانی اور اختیار خود سنبھال لیں۔ اس کے معنی تھے ایک غایت درجے کا فنی مذہبی و سیاسی فیصلہ، یعنی امامت کا اعلان۔

امامت کا اعلان

اسلامی قانون کی رُو سے جہاد کی نگرانی و رہنمائی کے لیے ایک امام کا انتخاب ضروری تھا امام کو چند صفات سے متصف ہونا چاہیے جن کی تفصیلات سے ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں سرحد کی فوجی صورتِ حال ایک ایسے ہادی کی متقاضی تھی جسے کامل اور مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ چنانچہ ۱۲ر جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ (فروری ۱۸۲۷ء) کو سید احمدؒ امام منتخب کیے گئے مسلمانانِ ہندوستان کے نام ایک گشتی چٹھی ارسال کی گئی جس میں جنگِ خضرو تک کے تمام واقعات کا خلاصہ اور اُن حالات کی شرح تھی جو امام کے انتخاب کے متقاضی تھے۔ یہ چٹھی[1] ہندوستان کے مختلف مراکز میں روانہ کی گئی۔ اس مکتوب میں سید احمد نے لکھا تھا" اس صورتِ حال میں سب سے عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں مواقع (اکوڑا و حضرو) پر مجاہدین

---

[1] مکتوبات سید احمد منقول سوانح صفحہ ۲۵۰ و ۲۴۸ - ۲۵۰

نے ایک بے سر کی فوج کا سا برتاؤ کیا اور کوچ کرنے اور لڑنے میں بھی غیر منظم طریقہ برتا۔ اس لیے اُس وقت وفادار متبعین، سادات، علمائے شریعت، اشرفا و عمائدین اور جمہور مسلمانان میں سے جو لوگ حاضر تھے۔ سب نے فیصلہ کیا کہ امام کے انتخاب کے بغیر جہاد کی کامیاب تنظیم اور بے اعتقادی و پراگندگی کا دفعیہ ناممکن ہے۔" بعض علماء اس تحریک کی تنقیص پر آمادہ ہوگئے اور گھر واپس جا کر اس فیصلے کو خود مختارانہ اقتدار پر قبضہ کرنے سے تعبیر کیا لیکن جیسا کہ بیان ہوا تحریک کی اصل غرض کے لیے یہ ضروری تھا، ورنہ یہ غرض معمولی فروعی جھگڑوں کی کھینچ تان میں کھو کر رہ جاتی۔

قبائلیوں کی بیعت

امامت کے اعلان کے ساتھ متعدد معتمد سرداروں اور اسّی ہزار قبائلیوں نے بیعت کی۔ پشاور علاقے کے کمان دار برادران بارک زئی نے بھی خطوط کے ذریعے بیعت کی اور اطاعت وتعاون کے پیغام بھیجے۔ سید احمدؒ کے بعض متبعین شروع سے ہی ان دونوں بھائیوں کے خلوص نیت پر شبہہ کرتے تھے۔ مگر سید احمدؒ نے ان کی زبان پر اعتماد کر لیا۔ انھوں نے تصور کیا کہ یہ سردار برسوں کے داخلی جھگڑوں اور سکھوں کے ہاتھوں شکستیں کھا کھا کر احساس کمتری اور کسی معین مقصد کے عام فقدان کے احساس میں مبتلا تھے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف فتح یابی حاصل کرنے کے لیے آپس میں متحد و منظم ہو جانے کے بعد ان میں عام خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی اور ان کی متزلزل اطاعت مضبوط ہو جائے گی۔

سردارانِ پشاور کی علیحدگی

پشاور کے سردار اور دوسرے قبائلی سرداروں کے ایک جلسے میں طے پایا کہ قبائلیوں اور ہندوستانیوں کی متحدہ فوج کے ساتھ سکھوں کے خلاف اقدام کیا جائے۔ چنانچہ وہ نوشہرہ کی طرف چل پڑے جہاں اُس وقت تک بدھ سنگھ نے اپنی چھاؤنی لگا رکھی تھی پھر شیدو کی جنگ میں پشاور کے سرداروں نے جن کو بدھ سنگھ نے ورغلا کر اپنی طرف ملا لیا

تھا۔ سید احمدؒ کے ساتھ غداری کی اور ان کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد ہندوستان سے آدمیوں اور سامان کی آمد میں زیادہ وقفہ ہو جانے سے فاقہ اور پریشانیوں کی نوبت آگئی۔ سید احمدؒ نے اپنا پہلا صدر مقام ہُنڈ ترک کر دیا اور کچھ عرصہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ پنجتار میں[1] جا ٹھہرے۔ اسی ابتلا کے زمانے میں ولایت علی کے چھوٹے بھائی طالب علی نے شیدو کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور اٹھارہ سال کے نوجوان تھے چنگلائی میں وفات پائی۔

قبائلی علاقوں میں تبلیغی دورے

جنگ کے بعد سید احمدؒ نے آس پاس کے قبائلی علاقے بیز اور سوات کے تبلیغی دورے کیے۔ انہوں نے لوگوں کو رغبت دلائی کہ ان کے مشن میں شریک ہوں اور اس علاقے میں جو سماجی و مذہبی بدعات پھیلی ہوئی ہیں ان سے تائب ہو جائیں۔ انہوں نے چترال، کشمیر، بخارا اور دوسرے ہمسایہ علاقوں کے حکمرانوں کو بھی خطوط لکھے۔ ان کو ہزارہ کے علاقے کے سردار کی طرف سے بھی تعاون کی سلسلہ جنبانی اور پیغام وصول ہوا جس میں مشہور سکھ جنرل ہری سنگھ نلوا اور گورنر ہزارہ کی ظالمانہ حکومت سے بے چینی کا اظہار تھا۔ ہزارہ کشمیر کی سرحد پر واقع ہے اور اگر اس پر قبضہ کر لیا جائے تو کشمیر کا راستہ کھل جائے۔

کشمیر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ

سید احمدؒ کے نقشۂ جنگ میں کشمیر کی نمایاں جگہ تھی۔ اس پر قبضہ ہو جانے سے ان کو کثیر سامان، مسلمانوں کی جمہوری آبادی اور قدرتی مدافعت کا ایک مضبوط خطہ ہاتھ آجائے گا جو سکھوں کی تاخت و تاراز سے محفوظ ہو گا، اور بعد کی فوجی کارروائیوں کے لیے ایک پائدار بنیاد

---

[1] یہ مردان کے شمالی مغرب میں خودو خیل قبائلی علاقے کا صدر مقام اور فتح خاں کا مستقر تھا۔ پرانے شہر کو انگریزوں نے ۱۸۵۸ء کی مہم میں کاملاً تباہ کر دیا تھا۔ موجودہ شہر بعد میں آباد ہوا۔

ہو گی۔ اس سے پہلے ہی کاشغر کے شاہ سلیمان کے نام ایک خط میں اشارہ کیا تھا کہ وہ پشاور کے سرداروں کو ٹٹولنے کے بعد کشمیر کی طرف بڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اُس اعانت کے وعدے کا بھی ذکر کیا تھا جو انہیں اس طرف بڑھنے کی صورت میں چترال کے حاکم اور دوسرے سرداروں سے وصول ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے پکھلی کے علاقے میں شاہ اسماعیل کے زیر کمان ایک دستہ بھیج دیا اور خود پنج تار میں ٹھہر گئے۔ شاہ اسماعیل نے اس علاقے میں کامیابی کے ساتھ تبلیغ و نشر اور فوجی معائنہ و تجسس کے کام انجام دیے اور اس سلسلے میں امب اور ستھانہ کا دورہ بھی کیا۔ انہوں نے سکھوں کی بعض فوجی چوکیوں پر بھی کئی اچانک دھاوے کیے۔ ان میں سے شنکیاری کی وہ جھڑپ جس میں اپنے مختصر سے فاقہ زدہ دستے سے سکھوں کی زیادہ زبردست فوج کو شکست دے کر تتر بتر کر دیا بہت مشہور ہے۔ اس زمانے میں ان کی جدوجہد ۱۸۲۷ء کے ربع آخر تک جاری رہی۔

درانی سرداروں کا مخاصمانہ رویّہ

مگر اس کے فوراً بعد سید احمدؒ نے ان کو واپس بلا لیا۔ اس واپس طلبی کا سبب واضح نہیں۔ شاید سید احمدؒ چاہتے تھے کہ درانی سرداروں کے خطرے سے نمٹا جائے جو ہندوستان سے آنے والے رضاکاروں کے قافلوں کو دق کیا کرتے اور عام طور پر قبائل کو ان کے خلاف اُکساتے رہتے۔ اس کے فوراً بعد سید احمدؒ دسمبر ۱۸۲۷ء کو) خاہار منتقل ہو گئے۔ یہ زیریں سوات میں دریائے سوات کے مشرقی کنارے پر ایک اہم شہر ہے۔ یہیں ۲۴ فروری ۱۸۲۸ء کو عبدالحیؒ کی وفات واقع ہوئی۔

اس درمیان میں درانی سرداروں کی مخاصمت بڑھتی گئی۔ سید احمدؒ سے ائتلاف کے معاہدے میں یہ لوگ مخلص ثابت نہ ہوئے۔ سید احمدؒ کو ان سے معاملہ کرنے میں ایک نازک صورت پیش آئی جو قسمت کی افسوس ناک ستم ظریفی سے خالی نہیں۔ انہیں لوگوں سے کہ جن سے تعاون کی امید تھی اور جن کی خوش حالی اور ترقی کے وہ خواہش مند تھے ان کو بہت ناپسند تھا۔ مگر درّانی سرداروں کے عثمان زئی کی طرف بڑھنے سے اُن کا ہاتھ قوی تر

ہو گیا - انہوں نے اس متوقع خطرے کا مقابلہ کرنے اور آئے دن کی شرارتوں کی اس بنیاد کے ہمیشہ کے لیے استیصال کے لیے خیبر کے علاقے کے بعض قبائل کے تعاون سے درانی سرداروں کے مرکز پشاور پر قبضہ کر لیا - کچھ قاصد جن میں پٹنہ کے مظہر علی بھی شامل تھے ان کے پاس ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے روانہ کیے گئے - عثمان زئی کی جنگ (مئی ۱۸۲۸ء) میں درانی سرداروں کو شکست ہوئی - مگر پشاور کی طرف پیش قدمی قبائلیوں کی بد عہدی کے سبب سے جن سے اعانت کی امید تھی ایک بار پھر ملتوی کرنا پڑی -

پنجتار میں دینی اجتماع

قبائلی سرداروں کی بار بار بد عہدی اور سماجی مذہبی مفسدات کے جاری رہنے کے پیش نظر سید احمد کو یقین ہو گیا کہ مقامی لوگوں کے چال چلن میں اخلاقی و مذہبی اصلاح جاری کرنا لازمی ہے - اس کے بغیر یہ لوگ تحریک کے صحیح معنی کبھی نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ تحریک کے مخلص وفادار ہوں - چنانچہ پنج تار میں (فروری ۱۸۲۹ء) ایک عظیم مذہبی مجمع منعقد ہوا جس میں اوروں کے ساتھ فتح خاں پنجتاری، زیدا کے اشرف خاں اور کھادے خاں بھی موجود تھے - تمام حاضرین سے از سر نو اس مضمون کا عہد لیا گیا کہ وہ اپنی اپنی قلمرو کو شریعت کے مطابق چلائیں گے اور مروجہ رسوم و عادات جیسے شراب نوشی، خاندانی جھگڑے، سود خوری، کثرت ازدواج، متوفی مورث کی بیوی اور بچوں کی اس کے بھائیوں میں تقسیم وغیرہ ختم کر دیں گے - اسلام کے فرض احکام جیسے صوم و صلوٰۃ پر بھی بہت زور دیا گیا - مگر اس خصوص میں کامیابی کی وسعت محدود رہی -

فتح ہنڈ

اب پنج تار سید احمدؒ کی جد و جہد کا صدر مقام ہو گیا تھا ہنڈ کے کھادے خان کو یہ ناگوار ہوا - اس انتقال مکانی کو اس نے اپنی تحقیر تصور کیا - وہ سید احمدؒ کے بعض اور کاموں سے غیر مطمئن تھا - ہندوستان سے آنے والی رضا کاروں کی جماعت کو جس کو اس

کی قلمرو سے گزرنا پڑتا تھا ستانا شروع کیا۔ اس نے سید احمدؒ کے دو اہم اور زبردست حامیوں
اشرف خاں اور فتح خاں سے بھی چھیڑ خانی شروع کی۔ آخر میں اس نے جنرل ونٹیورا سے
نامہ و پیام شروع کیا جو سکھ دربار کی طرف سے مالگزاریاں وصول کرنے کو سرحد بھیجا گیا
تھا۔ کھادے خاں نے اس کو پنجتار پر حملہ کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ مگر یہ حملہ کامیاب نہ ہوا۔
اس کے فوراً بعد سید احمدؒ نے بالآخر کھادے خاں سے نبٹنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ بعد میں
ہونے والی ہنڈ کی جنگ (اگست ۱۸۲۹ء) کھادے خاں نے شکست کھائی اور مارا گیا۔

یار محمد کا خاتمہ

یہ شدید اقدام سید احمدؒ کی مرضی کے خلاف کیا گیا۔ مگر کھادے خاں کی مسلسل زیادتیوں
اور سینہ زوریوں اور دشمنوں کے ساتھ اس کے ساز باز نے کوئی اور چارہ کار باقی نہ
چھوڑا تھا۔ چونکہ اسے دو سال بعد پشاور کی فتح کے وقت وقوع پذیر ہونا تھا، اس لیے
سید احمدؒ نے ہنڈ کا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے سے انکار کیا۔ اس کے برخلاف
ان کی خواہش تھی کہ یہ نظام کھادے خاں کے کسی قرابت دار کو منتقل کر دیا جائے۔
مگر ان قرابت داروں نے یار محمد خاں کے ساتھ الحاق کی کوشش کی مگر وہ بھی سید احمدؒ
کی پالیسیوں سے رضامند نہ تھا۔ اس نے وہابیوں کی موجودگی سے جسے وہ ان وادیوں
کو سید احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے زیر اثر آ جانے کا موجب سمجھتا تھا نجات حاصل
کرنے کا ایک عمدہ موقع تصور کیا۔ یار محمد نے ہنڈ کے غیر مطمئن سرداروں سے مل کر
سید احمدؒ کے خلاف چڑھائی کی۔ مگر ان حلیفوں نے شکست کھائی اور یار محمد جنگ
زیدہ (ستمبر ۱۸۲۹ء) میں مارا گیا[1] پشاور میں ونٹورا کا مالیانہ اور مشہور گھوڑی لیلیٰ
کے جس کا رنجیت سنگھ سخت دلدادہ تھا۔ مطالبہ کے مشن پر ناگہانی آمد نے اسے وہابیوں
کے ہونے والے حملے سے بچا لیا[2]

---

[1] قہر۔ جلد ۲ صفحہ ۳۵-۲۶-۳-۵۲-۱۱۲-۱۳۶ [2] ایم گریگور جلد ۱ ص ۱۹۷

تسخیرِ کشمیر کے منصوبہ کی ناکامی

سید احمدؒ کا ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ کشمیر کو آزاد کرا کے اسے اپنا مستقل مستقر بنا دیں۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے شاہ اسماعیل کو جائزہ کی مہم پر ۱۸۲۷ء میں ہزارہ میں تعینات کیا گیا۔ مگر سیما (دادی) کے علاقے کے سرداروں کی مخالفت نے ان کو فی الوقت اس مہم کو ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا۔ یار محمد کی شکست کے بعد سید احمدؒ کے قدم وادیوں میں ایک حد تک مضبوط ہو گئے تو انہوں نے کشمیر کی طرف پھر توجہ مبذول کی۔ جنگ زیدہ کے فوراً بعد ہی ان کو کشمیر کے ایک مقامی سردار سے یہ پیغام موصول ہوا کہ تربیلا میں سکھوں کی فوجی چوکی میں کوئی موجود نہیں اور آسانی سے اس پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سید احمدؒ کھابل کی طرف بڑھے جہاں کے مقامی سردار نے ان سے آملنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر سکھ کمانڈر ہری سنگھ کو مجوزہ حملے کی بُو مل گئی اور فوراً تربیلا واپس آگیا۔ اس طرح حملہ کی تجویز دھری کی دھری رہ گئی۔

سردارانِ ستھانہ کا ایثار

کھابل کی اقامت کے دوران میں سید احمدؒ کی ملاقات ستھانہ کے سید سرداروں سے ہوئی۔ اس مقام کو سرحد پر وہابیوں کا اہم ترین مرکز ہونا مقدر تھا۔ سید خاندان وہابیوں کی محبت اور وفاداری میں ثابت قدم رہا اور اپنی تمام مادی املاک پر ان سے قربان کر دی۔ خود غرضی اور تعصب و تنگ نظری کی پھیلی ہوئی فضا میں ان کی یہ وفاداری اور

لہ ستھانہ بنیر کے علاقے یعنی دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ یہ سادات کے ایک مقدس خاندان کا مقام تھا یہ لوگ سرحد پر وہابیوں کے بڑے سرگرم معاون سرپرست تھے۔ بعد میں یہ وہابی جدوجہد کا صدر مقام بن گیا۔

اور جان نثاری ایک روشن مثال تھی۔ سید اکبر شاہ جس سے سید احمدؒ کی پہلے سے خط و کتابت تھی آپ سے ملنے کھابل آیا اور ستھانہ میں آپ کو مدعو کیا، جہاں پہنچ کر اس کے خاندان والوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس نے سید احمدؒ کو مقامی سرداروں کے تعصب و تنگ نظری اور تلون مزاجی سے مطلع کر دیا اور مشورہ دیا کہ ان پر اعتماد نہ کریں۔

پائندہ خاں کی شکست و اطاعت

اس اثنا میں امب کے سردار پائندہ خاں تناولی کی طرف سے پیغامات وصول ہوئے جن میں سید احمدؒ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا گیا تھا۔ اس کا کردار بھی انقلابی حوادث سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کی گدی نشینی بھی اس علاقے میں سکھوں کی آمد کے ساتھ ہی عمل میں آئی۔ اور ان کے مقابل اپنی گدی پر مضبوطی سے جما رہا۔ وہ بہادر اور جری تھا مگر ایک چالاک موقع شناس دشمن کے مقابلے میں برسوں مسلسل اور غیر مساوی جنگوں نے اس کے لطیف پہلوؤں کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ اور اسے ہر چیز اور ہر شخص سے مشتبہ بنا دیا تھا۔ اس کی ریاست کشمیر کے ایک فوجی اہمیت کے راستے پر واقع تھی، اس لیے سید احمدؒ کشمیر کی طرف مجوزہ پیش قدمی میں اس کی حمایت حاصل کرنے کے خیال سے اُس سے ملے۔ شاہ اسماعیلؒ کے زیر کمان پہلے ایک ہراول دستہ بھیج دیا گیا۔ پائندہ خاں نے بہر حال امب کے راستے سے کشمیر پر دھاوا کرنے کی تجویز سے اس لیے اختلاف کیا کہ ایسا کرنے سے سکھ خلاف ہو جائیں گے۔ ایسے شخص کی طرف سے جس نے ساری زندگی سکھوں سے علانیہ لڑنے میں گزاری ہو یہ عذر سخت حیرت ناک تھا۔ آخر سید احمدؒ نے زبردستی ادھر ہی سے گزرنے کا فیصلہ کر لیا، اور امب کی جنگ میں پائندہ خاں کو شکست ہوئی۔ تو ایک عہد نامہ مورخہ مارچ ۱۸۳۰ء کی روح سے وہ صرف دستہ دینے ہی پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ تعاون پر بھی راضی ہو گیا۔ دریائے سندھ کا مشرقی علاقہ اسی کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا اور کشمیر اور پشاور کی فتح کے بعد جاگیریں دینے کا وعدہ بھی کر لیا گیا۔ امب کے سردار سے یہ شرائط قبول کرا کے سید احمدؒ نے کشمیر کی طرف بڑھنے

کی تیاریاں شروع کر دیں کشمیر سے متصل وادی کاغان میں کوئی کے ضامن شاہ سے بھی مدد اور تعاون کی پیشکشیں موصول ہوئیں۔ پھلیرا کی طرف بڑھنے کی رائے ٹھہری۔ یہ دستہ سید احمدؒ کے بھتیجے سید احمد علی کی کمان میں تھا۔ سکھوں نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ بھاری نقصان ہوا جس میں دستہ کے سردار بھی شامل تھے (۱۸۲۹ء)

رنجیت سنگھ کی پیشکش : سید احمد کی کارروائیاں اس وقت تک لاہور دربار میں خاصی پریشانی کا باعث ہو چکی تھیں چنانچہ رنجیت سنگھ نے شیر سنگھ الارڈ اور ونٹورا[1] کے ماتحت ایک فوج روانہ کی۔ ساتھ ہی سید احمدؒ کے پاس ایک وزیر سنگھ اور عزیز الدین[2] شامل تھے اس نے دریائے سندھ کے پار کا علاقہ سید احمد کو پیش کیا، اس شرط پر کہ وہ دریا کے جنوب و مشرق اپنی ترکتاز موقوف کر دیں۔ مگر سید احمدؒ نے یہ پیشکش نامنظور کر دی کیونکہ اس کی رو سے ان کو اپنے اصل ارادہ یعنی انگریزوں کے خلاف اقدام میں تعدیل و تخفیف سے کام لینا پڑتا۔

اس وقت تک پنج تار سے آمب تک سارا علاقہ سید احمدؒ کی حلیفی میں تھا۔ یا ان کے قبضے میں محفوظ تھا۔ مگر مذہبی و سماجی اصلاح کے اقدامات نے سرداروں اور جاگیرداروں

---

[1] یہ دونوں بھاڑے کے یورپی سپاہی ۱۸۲۲ء میں رنجیت سنگھ کی ملازمت میں داخل ہوئے اول الذکر کو رسالے کی کمان دی گئی اور آخر الذکر کو پیدل فوج کی، ان کی تنخواہ پچاس ہزار سالانہ مقرر ہوئی۔ یہ ماہر سپاہی تھے اور سکھ فوج میں حربی تربیت اور نمایاں مہارت کا ذریعہ و آلہ یہی تھے۔ ونٹورا VENTURA - کی ملازمت الارڈ ALLARD کی علیحدگی کے بعد تک جاری رہی انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد معاہدہ میں یہ شرط بھی داخل کی گئی کہ انگریزوں کی اجازت کے بغیر کوئی یورپی یا امریکی سکھ فوج میں نہیں رہے گا (ایم گریگور جلد ۱ ص ۱۹۰-۱۹۱)

[2] فقیر عزیز الدین رنجیت سنگھ کے وقیع ترین درباریوں اور مشیروں میں سے تھے اور اکثر اہم خفیہ مشن پر بحیثیت سفیر باہر بھیجے جاتے تھے۔

میں بے چینی پیدا کر دی۔ وادیوں کے بعض سرداروں نے عُشر (۱/۱۰ دہ یک) کی موجودہ رقم بھی ارسال نہیں کی۔ لہٰذا بقایا عُشر کی تحصیل اور احکام شریعت کی پابندی عاید کرنے کے لیے ایک مہم روانہ کی گئی۔ یہ بہت حد تک کامیاب رہی۔ مگر ہوتی مردان کے احمد نے مخالفت کی لیکن جب اس کو قلعہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا جہاں سلطان محمد خاں سردار پشاور اور یار محمد کے بھائی کے ساتھ سید احمدؒ کے خلاف فوج کشی کے لیے ساز باز شروع کی۔

سلطان محمد کے دل میں اپنے بھائی یار محمد کی موت کے بعد سے اس کے فاتح کے خلاف ایک تلخی مخفی تھی۔ اس سے کچھ دن پہلے وہابیوں کے ایک چھوٹے سے دستہ پر جو قلعہ ہنڈ پر قابض تھا حملہ کر دیا تھا۔ پھر اُس نے سید احمدؒ کے مستقر پنج تار پر جو اس وقت غیر محفوظ تھا حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ بہرحال سید احمدؒ ہزارہ واپس آئے اور سلطان محمد واپس چلا گیا۔ احمد کے بہکانے سے وہ ایک بار اور سید احمدؒ کے خلاف نکلا۔ چنانچہ مایار کی جنگ، سلطان محمد کی شکست اور بعد میں پشاور پر دھاوا اور قبضہ یہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے وقوع میں آئے (اکتوبر ۱۸۳۰ء)

سلطان محمدؔ سے حسن سلوک

فتح پشاور کے موقع پر سید احمد کا کردار بے غرضانہ بلند نظری کی ایک روشن مثال ہے وہ پشاور پر قبضہ کر کے اپنی چھوٹی سی فرماں روائی کی بنیاد ڈال سکتے تھے۔ مگر ان کا مقصد مختلف اور بلند تر تھا۔ اس نے پشاور کی حکومت سلطان محمد کو واپس کر دی۔ اس فیصلہ نے ان کے رفقاء میں اُس وقت بھی بے اطمینانی پیدا کی اور اس کے بعد سے دوسرے بھی اس پر نکتہ چینی کرتے آئے۔ اگرچہ بعد کے واقعات نے سید احمدؒ کے متبعین کی بے اطمینانی کا استصواب کیا۔ مگر ان کا فیصلہ ماحول اور حالت وقت کے لحاظ سے بالکل درست اور ان کے اعلیٰ اغراض و مقاصد کے مطابق تھا۔ کوئی اور طریق عمل سلطان محمد کے ساتھ طویل عداوت پر منتج ہوتا اور ایسی تباہ کن اور دیرپا جنگ کا

سلسلہ چھڑ جاتا جو اصل مقصد کو پسِ پشت ڈال دیتا۔

پشاور میں دینی حکومت کا قیام

حکومت پشاور پھر قائم ہو گئی۔ سید احمدؒ کے متبعین میں سے چند اشخاص حکومت کو احکام شرع کے مطابق چلانے کے لیے پشاور میں متعین کیے گئے۔ مظہر علی پشاور کے قاضی مقرر ہوئے اور بہار کے چند اور اشخاص کا ایک گروہ جس میں قمرالدین بھی تھے ان کے ساتھ متعین ہوا۔ مایار کی جنگ اور پشاور کی تسخیر وہابیوں کے اثر اور سید احمدؒ کی زندگی میں سیاسی توسیع کی نشان دہی کرتی ہے۔ بڑے بڑے عالی مرتبت مقامی سرداروں کی سرکوبی کی گئی۔ اور اب سید احمدؒ اطمینان سے سکھوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کر سکتے تھے۔

مجاہدین کے خلاف سازش

مگر وہابیوں پر ایک سخت مصیبت نازل ہونے والی تھی۔ رقبۂ اثر کی وسعت کے سبب سے وہابیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مختلف جگہوں میں جن میں پشاور بھی تھا، تعینات کر دی گئی تھیں۔ سلطان احمد اور بعض اور قبائلی سردار اپنی فطرت کے مطابق خفیہ طور پر انہیں لوگوں پر حملہ کرنے کی سازش کر رہے تھے جنہوں نے اپنی عالی حوصلگی اور سیرچشمی سے انہیں ان کا اقتدار واپس دلایا تھا۔ عوام الناس کو وہابیوں کے خلاف اکسانے کے لیے بعض سماجی اصلاحات جو نافذ کی گئی تھیں اور ان کے خلاف بعض بے بنیاد بناوٹی الزامات سے کام لیا گیا۔ تمام جگہوں میں جہاں جہاں وہابیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مقرر تھیں ایک خفیہ، ناگہانی انقلاب کا انتظام کیا گیا۔ ابتدا پشاور سے کی گئی جہاں مظہر علی قاضی شہر اور دوسروں کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح اور ٹولیوں پر حملہ کر کے فریب سے قتل کر دیا گیا۔ چند آدمی جو بچ گئے تھے یہ داستانِ غم سنانے کو پنج تار پہنچے۔ سید احمدؒ اس سے پہلے اسی قسم کی حرکات سے اپنی بے نفسی سے ہمیشہ اس امید پر چشم پوشی

کرنے اور معاف کر دینے کی کوشش کرتے رہے کہ شاید وہ ان کو راہ راست پر لے آسکیں گے اور اخلاقی ترغیب اور مذہبی تعلیمات سے برضا و رغبت ان کا تعاون حاصل کر سکیں گے۔ مگر یہ انتہائی دغابازی ان کے لیے بھی برداشت سے زیادہ ثابت ہوئی۔

مظفر آباد پر حملہ

۱۸۳۰ء کے آخر میں سید احمدؒ آخری بار پنج تار سے رخصت ہو کر وادی کاغان کے شمال کو چلے گئے۔ دوسرے سال اوائل جنوری میں وہ راج دواری پہنچے۔ یہ حربی نقطہ نظر سے ایک اہم جگہ تھی۔ پکھلی کی وادی کے تمام درّے نظر آتے تھے۔ اس کے فوراً ہی بعد تنکیاری سے کچھ بالاتر ایک درہ بھوگرمنگ جو سکھوں کی ایک فوجی چوکی تھی فتح ہو گیا۔ اس جگہ کے ایک برخاست کردہ سردار زبردست خان کی اطلاع پر کہ وہ غیر محفوظ ہے ایک اور دستہ مظفر آباد بھیج دیا گیا۔ اس دستہ نے چھاؤنی کے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور سکھوں کی چھوٹی سی ٹولی پر بھی جو بھاگم بھاگ مظفر آباد واپس پہنچی تھی اور گڑھی میں پناہ لے رکھی تھی، حملہ کیا گیا مگر قبضہ نہ ہو سکا کیونکہ مقامی حلیف زبردست خاں اوروں کی طرح آخری گھڑی میں ڈگمگانے لگا۔ سید احمدؒ نے اس دستے کو بالاکوٹ بلوا لیا جہاں وہ اپریل ۱۸۳۱ء کو آ گئے تھے۔

شیر سنگھ مظفر آباد پر حملہ کی خبر سُن کر فوراً پشاور سے واپس آ گیا۔ لیکن یہ سُن کر کہ وہابیوں نے اُسے چھوڑ دیا ہے اس نے پہلے گڑھی حبیب اللہ پر مورچہ سنبھالا، پھر بالاکوٹ کی طرف بڑھ گیا جہاں سید احمدؒ خود موجود تھے۔ بظاہر وہ پوری وہابی طاقت کا جو وہاں موجود تھی مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ سید احمدؒ نے بھوگرمنگ، راج دواری، مظفر آباد وغیرہ سے اپنے تمام منتشر دستے بالاکوٹ بلوا لیے تھے جو ان کی زندگی کی آخری جنگ کا منظر بننے والا تھا۔

باب ۳

جنگِ بالاکوٹ اور فرائضی تحریک

(۱) جنگِ بالاکوٹ

منظورہ[1] اور وقائع کے بیانات کی بنیاد پر غلام رسول مہر نے اس مشہور جنگ کے مفصل حالات مرتب کیے ہیں۔ یہ حالات اس وقوعہ سے متعلق مکمل ترین اور معتبر ترین ہیں۔ پھر بھی یہ دونوں مآخذ بعض جزئیات خصوصاً جنگ کے آخری چند گھنٹوں کے وقوعات، سید احمدؒ کی شہادت، ان کی نعش کی شناخت اور تدفین وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں بتاتے۔ اور یہ خاموشی قدرتی بھی ہے۔ اس لیے کہ اُن کے اکثر رفقاء جو ان کے ہمدوش لڑ رہے تھے شہید ہو چکے تھے جو چند افراد بچ رہے تھے اپنے مشاہدات کو ذہن میں تازہ و مجتمع کرنے کو جمع ہوئے وہ بہت بعد میں۔ اس کے علاوہ ان میں سے کسی کا بیان چشم دید نہیں۔

جنگ بالاکوٹ کے متعلق اہم دستاویز

خوش قسمتی سے اس واقعہ کی سکھوں کی ایک غیر شائع شدہ روایت ہمیں دستیاب ہو گئی ہے۔ یہ رنجیت سنگھ کے دربار کے ایک وقائع نویس کی رپورٹ میں شامل ہے لدھیانہ

---

[1] منظورہ اور وقائع کے مختصر نام گزشتہ اوراق کے حواشی میں بار بار آئے ہیں۔ منظورہ سے مراد ہے منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء مرتبہ سید جعفر علی ساکن مجھولا میر ضلع گورکھپور۔ یہ بالاکوٹ کے مجاہدین میں سے تھے۔ ۱۲۸۸ھ (مطابق ۱۸۷۱ء) میں وفات پائی۔ وقائع سے مراد وقائع احمدی ہے جو ۱۲۷۶ھ کی تالیف ہے۔ اس کے ناقص مخطوطات سے مہر صاحب نے اپنی کتاب سید احمد شہید میں استفادہ کیا ہے۔ مولف کا نام مذکور یا موجود نہیں (مترجم)

کے پولیٹیکل اسسٹنٹ سی آر ویڈ نے ان رپورٹوں کے اقتباسات حکومت ہند کو بھیجے تھے۔ اور آخر میں اس واقعہ کا نہایت قیمتی بیان جو تواریخ کے مولف مہتاب سنگھ نے دیا ہے، اور پھر ۱۸۵۴ء میں تالیف ہوئی اور جو ۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۴ء تک ریونیو افسر کی حیثیت سے ہزارہ متعین تھا، ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔

سطور ذیل میں مَیں نے پہلے وقائع اور منظورہ کی بنیاد پر جعفر نے جو حالات لکھے ہیں ان کی تلخیص کی ہے پھر تواریخ ہزارہ اور وقائع نویس کی رپورٹ میں مندرج روایات کا پورا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ ان تینوں ذرائع کے تقابلی مطالعہ سے ان اہم واقعات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔

بالاکوٹ کا محل وقوع

شیر سنگھ اور سید احمدؒ کی فوجیں دریائے کنہار کے پار ایک دوسرے سے مقابل ہوئیں۔ بالاکوٹ کا گاؤں دریا کے مغربی کنارے پر ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ شیر سنگھ کی فوج کا پڑاؤ بالاکوٹ سے تھوڑی دور مشرقی کنارے پر تھا۔ شیر سنگھ دو راستوں سے بالاکوٹ پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ بالاکوٹ کے بالمقابل مشرقی کنارے سے، دریا پار کر کے (۲) پچھلی کی طرف سے بالاکوٹ کے مغربی پہاڑ پر چڑھ کر بالاکوٹ پر چڑھائی کر کے۔ اس نے پہلا راستہ اختیار کیا۔

سید احمدؒ کی فوجی حکمت عملی

مٹی کوٹ پہاڑی کے دامن اور بالاکوٹ کے آباد حصہ کے درمیان کھیتوں کا ایک نشیبی علاقہ تھا۔ سکھوں کے اقدام کو روکنے کے لیے اس نشیبی علاقہ میں بہت پانی چھوڑ دیا گیا تھا اور اسے دلدلی بنا دیا گیا تھا، سید احمدؒ نے پہاڑی پر جانے والی پوشیدہ پگڈنڈیوں کی نگرانی کے لیے ایک مختصر سا دستہ تعینات کر دیا تھا۔ مگر یہاں بھی غداری اپنا کام کر گئی۔ پوشیدہ پگڈنڈیوں کا پتا سکھوں کو بتا دیا گیا اور کسی کمک کے پہنچنے سے پہلے محافظ دستہ

کو اچانک زیر کر لیا گیا۔ وہابیوں کے نقشۂ جنگ پر یہ بہت بڑی ضرب تھی، کیونکہ اس کے فوراً بعد سکھ تمام پہاڑی پر چڑھ دوڑے جو بالاکوٹ پر سایہ افگن تھی۔ جب جنگ کی صبح طلوع ہوئی سید احمدؒ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سکھوں کو پہاڑی سے نیچے اترنے اور دلدلی کھیتوں سے گزرنے دیں۔ جب سکھ ہانپتے ہوئے بلندی پر پہنچیں جہاں مکانات واقع تھے اُس وقت وہابی فائر شروع کرنے والے تھے۔ اُس وقت کے حالات کے پیش نظر یہ بہترین تدبیر تھی جو اختیار کی جا سکتی تھی۔ جب سکھ پہاڑی سے اُترنے لگے تو وہابی منصوبہ کے مطابق اپنی جگہ پر جمے رہے۔ اس کے بعد سید احمدؒ خود ابتدا کر کے اپنے رفیقوں کے ساتھ پہاڑی کے دامن کی طرف جھپٹ پڑے۔ اب جنگ شروع ہوئی۔ وہابیوں کی مختصر فوج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہوگئی۔ جنگ جم کر ہوئی اور دست بدست۔ سید احمدؒ پہاڑی کے دامن میں بہادری سے لڑتے ہوئے گر گئے۔ کسی نے اُن کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا جو مجاہدین ان کے ساتھ لڑ رہے تھے وہ ان کے ساتھ شہید ہو گئے۔

جنگ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بروز جمعہ واقع ہوئی۔

سید احمد کی شہادت

جنگ کے بعد شیر سنگھ نے اپنے دشمن کی لاش کی تلاش کی۔ اس کے سامنے ایک بے سر کی لاش لائی گئی جو سید احمدؒ کی بتائی گئی۔ اس نے اس کی شناخت کرانے کی کوشش کی۔ بعد میں سر بھی مل گیا اور شیر سنگھ نے ان کی لاش کو دریا کے کنارے دفن کرا دیا۔ دوسرے دن لوٹتے ہوئے اس نے دریا کو عبور کیا اس کے دوسرے دن بعض اکابیوں نے جو پیچھے رہ گئے تھے لاش کو قبر سے نکال لیا اور دریا میں پھینک دیا۔ سر اور دھڑ بعد میں دریا کے اُلٹے رُخ پر دو مختلف جگہوں پر پائے گئے اور سر گڑھی حبیب اللہ میں اور دھڑ تلہٹا میں دفن کر دیے گئے۔ اُس منحوس دن کے واقعات کی پوری پوری تحقیقات کے بعد بالاکوٹ میں موجودہ قبر کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ مگر یہ متیقن نہیں کہ یہ قبر ٹھیک اسی مقام پر واقع ہے جہاں سے دھڑ کھود کر نکالا گیا تھا۔

تواریخ ہزارہ کی روایت

تواریخ ہزارہ میں یہ واقعات یوں بیان کیے گئے ہیں:-

"غدارانہ قتل کے بعد سید احمدؒ نے پنج تار چھوڑ دیا، اور

حبیب اللہ خاں گڑھی والا اُن کو راج دواری لے گیا جو سکھوں سے بیزار تھا۔ سید احمدؒ پہلے بھوگر منگ پھر وادیٔ کاغان چلے گئے۔ انھوں نے ظاہر کیا کہ وہ کشمیر کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں اور کشمیر کے علاقے میں حبیب اللہ خاں اور دوسرے مقامی سرداروں کو جاگیریں بھی بانٹنا شروع کر دیں۔

سید احمدؒ کے کشمیر کی طرف بڑھنے کی خبر سُن کر رنجیت سنگھ گھبرایا اور شیر سنگھ کو آٹھ ہزار فوج اور توپوں کے ساتھ سید احمدؒ کے اقدام کو روکنے کے لیے متعین کیا۔ شیر سنگھ کی فوج میں اور سرمایہ دار یہ تھے! سردار تارا سنگھ کالیان والا، سردار شیام سنگھ، سردار پرتاپ سنگھ اٹاری والا، سردار رتن سنگھ گرجاکھیا، سادھو سنگھ کنہال، رتن سنگھ کونگلو وزیر سنگھ رنگھری کلیا، گورمکھ سنگھ لمنا، اور جوالا سنگھ پھدانا (لہرعیہ؟) کا چچا لکھمیر سنگھ۔ یہ فوج یوسف زئی علاقہ کا معاملہ سربراہ کرنے میں مصروف ہوئی۔ مالگزاری اور گھوڑوں کی تحصیل کے بعد شیر سنگھ ہزارہ سے گزر کر پکھلی کے گاؤں تنکیاری میں خیمہ زن ہوا۔ سید احمد اُس وقت تنکیاری سے ۲۰-۱۶ میل پر بھوگر منگ میں تھے۔ سکھ سرداروں نے فیصلہ کیا کہ ان کی ذمہ داری سید احمدؒ کو دربار کے علاقے میں فساد پھیلانے سے روکنا ہے۔ وہ اس وقت بھوگر منگ میں تھے۔ جو سردار ہری سنگھ کی جاگیر تھا، اور وہی ان سے نپٹے گا اور خود ان کو مظفر آباد چلا جانا چاہیے۔ سردار ماہن سنگھ نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور بتایا کہ پہلے سید احمد سے نپٹے بغیر مظفر آباد کی روانگی ایک غلطی ہوگی۔ مگر اُس کی رائے مسترد کر دی گئی چنانچہ شیر سنگھ مظفر آباد چلا گیا اور محصور قلعہ کو آزاد کرا لیا۔ نجف گڈھ گھوڑی والا شیر سنگھ سے مل گیا اور مظفر آباد کا تنہا حاکم بنا دیا گیا۔"

سکھوں کی بدحواسی

اسی اثناء میں سید احمدؒ بالاکوٹ چلے گئے جو درۂ کنہار میں ایک اہم گاؤں تھا۔ مقامی لوگ آئے اور ان کے مرید ہوئے۔ مہاں سنگھ نے جو ایک چھوٹے سے دستے کے ساتھ پیچھے رہ گیا تھا شیر سنگھ کو لکھا کہ سید احمدؒ کے لوگ مالیانہ وصول کر رہے ہیں اور مقامی لوگ ان کے ساتھ ہیں، پھر وہ (مہاں سنگھ) اس دستے کی مدد کیسے کرے؟ اس پر شیر سنگھ نے مہاں سنگھ کو حکم دیا کہ وہ اپنے وزیر

سنگھ رنگھری کلیا، سادھو سنگھ کنھال اور زتن سنگھ کو نکلو کے دستے لے کر گڑھی حبیب اللہ کی طرف پیچھے ہٹ جائے۔ ان سب کی مجموعی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی۔ بالاکوٹ سے مغرب چند میل پر گڑھی پہنچ کر مہاں سنگھ نے قلعہ فتح گڑھ کی مرمت شروع کر دی۔ مرمت جاری ہی تھی کہ ایک افواہ پہنچی کہ سید احمدؒ کے لوگ دریا عبور کر کے اچانک حملہ کرنے والے ہیں۔ سکھ بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے خندقیں کھودیں اور اُن کو خاردار جھاڑیوں سے گھیر لیا اور توپیں چھوڑ چھوڑ کر نرسنگھے پھونک پھونک کر اور آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر شور غل مچا دیا۔

شیر سنگھ کی گڑھی حبیب اللہ کی جانب پیشقدمی

اُسی وقت انہوں نے ایک تیز رو قاصد بھیج کر اپنی حالت زار کی خبر دی اور اسی رات کمک طلب کی۔ شیر سنگھ نے فوراً اپنی فوجوں کو گڑھی حبیب اللہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ دوسری صبح کو پریشان حال لوگوں نے جنہوں نے رات سخت اضطراب میں گزاری تھی کمک کی صفوں کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔

آئندہ سولہ دنوں میں قلعہ کی پوری مرمت ہو چکی تھی۔ اس کے بعد سکھوں نے اپنا ڈیرا بالاکوٹ سے چھ میل پرے دریا کے مشرقی کنارے پر منتقل کر دیا۔

دونوں فوجوں کے کماندار اپنی اپنی چھاؤنیوں سے جن کے درمیان ندی بہہ رہی تھی ایک دوسرے کا بغور نظارہ کر رہے تھے۔ شیر سنگھ وقتاً فوقتاً اپنے افسروں کے ساتھ گھوڑے پر بالاکوٹ کے مقابل جا کر دوربین سے دشمن کا ملاحظہ کرتا۔

سید احمد کی ایک جنگی چال

ایک روز سید احمدؒ ایک چال چل گئے۔ انہوں نے اپنی جائے قیام کے سامنے کچھ غلّے کے دانے بکھروا دئے جن کے چگنے کو چڑیوں کا ایک بڑا جھنڈ اُس جگہ جمع ہو گیا۔ ساتھ ہی انہوں نے سکھوں کی چھاؤنی کے پاس ندی کے پار پانسو سپاہی بھیج دیے کہ جنگلوں میں جا چھپیں۔

جب شیر سنگھ نے دشمن کے کیمپ کے روزانہ ملاحظہ کے دوران دوربین سے دوسری طرف چڑیوں کے ایک بڑے جھنڈ کو منڈلاتے دیکھا تو سمجھا کہ وہابی شاید اس جگہ کو چھوڑ کر

کہیں اور منتقل ہو گئے۔ اُس نے ایک نگراں ٹولی کو دوسری طرف دیکھنے اور رپورٹ کرنے کو بھیج دیا۔ سید احمد نے جن سپاہیوں کو اُدھر گھات لگانے کو بھیجا تھا انہوں نے اُس ٹولی کو گھیر لیا۔ اس میں سے صرف دو آدمی ندی تیر کر پار ہوئے اور اپنی دُرگت سنائی۔

سکھ فوج کا ماٹی کوٹ پر قیام

شیر سنگھ نے پھر مشورہ کیا کہ سید احمدؒ پر کس طرح حملہ کیا جائے۔ طے پایا کہ فوج کا ایک حصہ تو اپنی جگہ پر رہے اور ایک ہزار توپچیوں کا محفوظ دستہ قلعہ اُری کے تھانے وار ٹیک سنگھ کے ساتھ کیمپ کی حفاظت کرے۔ بقیہ فوج نے ایک محفوظ مقام پر ندی پار کی اور باسپان سے گزر کر ماٹی کوٹ کی پہاڑی پر جم گئی۔

ہزارہ اور شنکیاری کے محفوظ دستے بھی ایک اور دستے سے ٹمری ہو کر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہابیوں کی وہ چھوٹی سی ٹولی جو چوٹی کو جانے والے پوشیدہ راستے کی حفاظت کے لیے تعینات تھی مغلوب کر لی گئی اور اس میں سے تین چار شہید ہو گئے، باقی بھاگ نکلے سید احمدؒ نے ایک امدادی ٹولی بھیجی جو اتنی دیر سے پہنچی کہ اس چھوٹی سی حفاظتی ٹولی کی کوئی مدد نہ کر سکی، وہ لوٹ آئی۔ سکھوں نے پہاڑی کی چوٹی پر رات گزاری۔

چوٹی پر پہنچ کر سکھوں کو ایک سخت پریشانی کا سامنا ہوا۔ کہیں پانی دستیاب نہ تھا مگر ان کی خوش قسمتی سے بادل کڑکا اور اُن کے کیمپ پر اولے برسے۔

دوسری صبح کو حملہ شروع ہوا۔ پہلے فیصلہ ہوا کہ ایک چھوٹے سے دستے سے چوٹی کی حفاظت کی جائے چنانچہ ہزارہ کی فوج کے ساتھ مہاں سنگھ اور جوالا سنگھ پھدانا کے چچا لکھمیر سنگھ وہابیوں پر حملہ کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ بقیہ فوج چوٹی پر رہے اور حالات کے مطابق کمک بھیجتی رہے۔ جب حملہ آور ٹولی نیچے اتری شیام سنگھ اٹری والا نے کہا کہ فتح کی (اگر حاصل ہوئی) رپورٹ کرتے ہوئے یہ اچھا نہیں معلوم ہوگا کہ صرف یہی دوسردار لڑے تھے، نہ شکست کی رپورٹ میں یہ اچھا معلوم ہوگا۔ علاوہ بریں اگر انہوں نے شکست کھائی تو بچے ہوئے آدمیوں کا دشمنوں کے مقبوضہ علاقے سے ہو کر لاہور تک پہنچنا ناممکن ہے اس لیے ان کا ایک ساتھ حملہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔

آغازِ جنگ

ماٹی کوٹ پہاڑی کے دامن میں کچھ نشیبی زمین تھی، اس کے بعد ایک بلندی پر بالاکوٹ کا گاؤں واقع تھا جس میں سید احمد اور ان کے رفقا تیر کمان اور زنبورک لیے تیار بیٹھے تھے۔ فریقین کے درمیان توپ اندازی کا تبادلہ شروع ہوا۔ سکھ کشمیر سے ایک توپ اٹھا لائے تھے۔ انہوں نے اسے نصب کر کے گولے برسانے شروع کر دیے۔ صبح سے دوپہر تک گولوں کا تبادلہ تیزی سے جاری رہا۔ مہاں سنگھ اور جوالا سنگھ دونوں سرداروں کے علم بردار وہابیوں کے گولوں سے مقتول ہوئے۔ اور جھنڈے گرنے لگے۔ دوسرے سکھ ان کو اٹھانے کو جھپٹے۔ ان جھنڈوں کو گرتا دیکھ کر بالاکوٹ میں جتنے وہابی تھے باہر نکل آئے۔ سید احمد رحمتہ اللہ علیہ اور خود مولوی اسماعیل نے حملے کی رہنمائی کی، اور اس نشیبی زمین کی طرف جھپٹے جو فریقین کے درمیان واقع تھی۔ اور چلائے کہ دشمن پسپا ہو رہا ہے اور تم کو حملہ کر دینا چاہیے۔ اور وہابی بھی اس پہاڑی کی طرف بڑھے جہاں سردار اتر سنگھ کلیاں والا اور گورمکھ سنگھ لمنا کی سپاہ ایک طرف جمی ہوئی تھی۔ مہاں سنگھ اور کنور شیر سنگھ کی سپاہ بھی وہاں آ پہنچی اور جنگ میں شریک ہو گئی۔

سکھوں کی پسپائی

سکھوں نے پہلے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ شیر سنگھ نے اپنی تلوار کھینچ لی اور چاہتا تھا کہ خود میدان جنگ میں گھس پڑے لیکن مہاں سنگھ اور دوسروں نے اسے تنہا جانے کو منع کیا۔ لیکن اس نے ان کا کہا نہ مانا اور سکھوں کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے سکھوں کو گالیاں دیں ان پر پتھر پھینکے اور پھر میدانِ جنگ میں دھکیل دیا۔

مجاہدین کی شہادت

اس نے شیام سنگھ اور پرتاپ سنگھ کے پاس قاصد بھیج کر توپیں چلانے کا حکم دیا اور دوسرا قاصد اسی پیغام کے ساتھ اتر سنگھ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ اس نشیبی زمین میں خلیفہ سید احمدؒ کے ساتھ ۱۸۷ وہابی گر گئے۔ چار سو ہندوستانی بھی جو سید احمدؒ پر جان چھڑکتے تھے گر گئے۔ سید احمد کی نعش میں داہنے ہاتھ اور سینہ پر بائیں پستان

کے نیچے گولی کے نشانات تھے۔

بقیہ وہابیوں نے جن کی تعداد کوئی اسی ہو گی تین بار اپنے سردار کی نعش اٹھا لانے کی کوشش کی مگر سخت گولہ باری کے سبب سے ناکام رہے۔ آخر ایک وہابی ان کا سر کاٹ کر اٹھالے گیا (یہ بالکل ناقابل قیاس ہے۔ مسلمان لاش کے مسخ اور قطع و برید کو گناہ سمجھتے ہیں۔ سید احمد کا کوئی متبع اپنے عزیز از جاں سردار کی نعش کے ساتھ یہ سلوک روا نہ رکھ سکتا تھا) اس شخص کے گولی لگی اور سر کو لے کر آگے بڑھنا ناممکن دیکھ کر اس نے اس کٹے ہوئے سر کو سرسوں کے انبار میں چھپا دیا۔

سکھ گاؤں میں داخل ہوئے اور سید احمد اور دوسرے لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ آٹھ زنبورک، ایک ہاتھی، دس گھوڑے اور دس خچر پکڑ لیے گئے۔

سید احمدؒ کی لاش کی شناخت

شیر سنگھ نے میدان جنگ کے معائنے میں سید احمدؒ کی نعش دیکھی اور اسے کسی معزز کی نعش سمجھ کر اپنے کیمپ میں لے گیا اور اپنے آدمیوں سے اس کی شناخت کا انتظام کرنے کو کہا۔ نواب خاں تناولی کو جو دو تین برس سید احمدؒ کے ساتھ رہ چکے تھے شیر سنگھ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ سر کے بغیر شناخت دشوار ہے لیکن بتایا کہ سید احمد کے جسم پر کچھ امتیازی نشانات تھے۔ ان کے پاؤں کے سب ناخن ناقص تھے۔ چنانچہ کفن ہٹانے پر سب ناخن ناقص پائے گئے۔ پھر بھی کچھ شبہ باقی رہ گیا تھا۔ اس اثناء میں عالم خاں تناولی ایک ملازم نے آگے بڑھ کر کہا کہ "میں سید احمدؒ کے سر کا پتا بتا سکتا ہوں اگر پچیس روپے کا انعام عنایت ہو۔" شیر سنگھ نے جھٹ اسے پچیس روپے دے دیے اور ۲۵ سوار اور ۲۵ پیادے اس کے ہمراہ تعینات کر دیے۔ اس نے چھپایا ہوا سر بتا دیا۔ جب سوار سید احمدؒ کا سر لیے واپس جا رہے تھے سکھ سپاہی اسے غلطی سے وہابی سوار سمجھ کر مسلح ہونے لگے۔ بعد میں جب ان کی شناخت ہو گئی تو سب نے چین کی سانس لی۔ سر دھڑ کے پاس رکھ دیا گیا، نواب خاں تناولی کو پھر بلایا گیا اور انہوں نے ٹھیک ٹھیک شناخت

کر لی۔ نعش چند مسلمانوں کے حوالہ کر دی گئی جو سکھ فوج کے نوکروں میں سے تھے۔ وہ تمام رات قرآن شریف پڑھتے رہے اور دوسرے دن نعش کو شیر سنگھ کی اجازت سے کنہار ندی کے کنارے ایک قبر میں دفن کر دیا۔ دوسرے دن شیر سنگھ رخصت ہو گیا اور دو سردار مہاں سنگھ اور لکھمیر سنگھ کو حکم ہوا کہ اپنی زیر نگرانی سارا سامان گڑھی حبیب اللہ کو منتقل کر دیں، اور تمام فوج ندی عبور کرے تو یہ بھی اسی کے پیچھے چلے جائیں۔ شیر سنگھ کی عدم موجودگی میں ان دونوں سرداروں نے آپس میں یہ سازش کی کہ سید احمدؒ نے اپنی زندگی بھر ان کو بہت تکلیفیں دیں، اب اگر ان کی میت کو قبر میں رہنے دیا جائے تو مسلمان اسے ایک مرکز پرستش بنا لیں گے، اس لیے بہتر یہ ہو گا کہ اسے قبر سے نکال کر ندی میں پھینک دیا جائے۔ سات آٹھ نہنگ بھی پاس ہی کھڑے تھے۔ دونوں سرداروں نے ان کو پچیس روپے دیے اور کہا کہ اگر تم خلیفہ (سید احمدؒ) کی نعش کو قبر سے نکال کر ندی میں پھینک دو تو یہ بڑے پُن (ثواب) کی بات ہو گی۔ انہوں نے فوراً تعمیل کی اور نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ندی میں پھینک دی۔ اس کے بعد دونوں سردار نوشہرہ کی طرف کوچ کر گئے۔ اس کے بعد شیر سنگھ کے ساتھ لاہور میں داخل ہوئے۔

خلیفہ[1] سید احمدؒ اور کنور شیر سنگھ کے درمیان جنگ، ۲۰ بیساکھ ۱۸۸۸ء میموت مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی[2]

(تمام شد بیان تواریخ ہزارہ)

---

[1] اس کتاب میں سید احمدؒ کو خلیفہ ہی سے ملقب کیا گیا ہے۔ (مترجم)

[2] درحقیقت مسودہ میں ۱۸۳۷ء درج ہے۔ بے شبہ یہ کاتب کا سہو ہے۔ کیونکہ بکرمی سمبت سال ۱۸۸۷ء جو ساتھ ہی درج ہے ۱۸۳۰ء سے مطابقت رکھتا ہے نہ کہ ۱۸۳۷ء سے۔

وبڈ کی روایت

وبڈ نے ولیسوبا چھاؤنی سے ۱۷ مئی ۱۸۳۱ء کو ایک مراسلہ میں وقائع نویس کی رپورٹ مورخہ ۱۰ مئی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:-

"کنور شیر سنگھ اور بھیمن سنگھ (دھیان سنگھ) گورنر کشمیر کے مراسلات اس مضمون کے پہنچے ہیں کہ سید احمدؒ کے دوبھہ میں دشوار گزار پہاڑیوں میں ہونے کی اطلاع ملنے پر ان لوگوں نے اپنے بڑاؤ سے چل کر ان پر حملہ کر دیا۔ ریاست کی فوجیں ان پہاڑیوں کے انحکامات اور دروں سے ناواقف تھیں اس لیے ان کو شکست ہو گئی اور تین سو آدمی ہلاک اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ اس لیے آویزش کو جاری رکھنا ناممکن دیکھ کر وہ سات آٹھ کوس پیچھے ہٹ گئیں اور چھاؤنی قائم کی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا ارادہ فوراً حملہ کرنے کا تھا مگر ان کی چھاؤنیوں میں غلہ بہت گراں ہو گیا تھا۔ ایک روپے میں ۵ سیر بکے۔ یہ خبر سُن کر مہاراجہ نے اپنے نجومیوں سنکرناتھ اور دو دسودن کو بلا بھیجا اور حالات بتا کر ان سے احکام نجوم سے یہ معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی آیا کنور شیر سنگھ اپنے مجوزہ حملہ میں کامیاب ہو گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم حساب لگا کر عرض کر دیں گے۔"

وبڈ نے مزید لکھا کہ متذکرہ اطلاع بھیجنے کے بعد دربار میں خطوط موصول ہوئے جن میں مذہبی دیوانوں کی کامل شکست کا اعلان کیا گیا تھا: "سید احمدؒ نے ایک مستحکم مقام بالاکوٹ میں چھاؤنی ڈالی تھی۔ شیر سنگھ وہاں جا کر حملہ آور ہوا۔ سید احمدؒ نے اپنی جگہ چھوڑ کر حملہ کا مقابلہ کیا اور مغلوب ہو گئے۔ سید احمدؒ کی نعش کی شناخت کی گئی اور سکھوں نے اس کو جلا دیا۔"

وقائع نویس کی رپورٹ

بعد میں موکریان چھاؤنی سے ایک خط مورخہ ۱۸ مئی ۱۸۳۱ء میں وقائع نویس کی ایک اور رپورٹ مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۳۱ء یوں نقل کی: "کنور شیر سنگھ کا ایک مراسلہ موصول ہوا کہ

سید احمدؒ نے دو تین ہزار آدمی کے ساتھ جن میں زیادہ تر گاؤں کے کسان تھے بالاکوٹ میں نالے کے پار پڑاؤ کیا۔ وہ اکتوبر ۸ تاریخ کو دوپہر کے وقت گاؤں کے بعض زمینداروں کی مدد سے پرتاپ سنگھ اٹاری والا، رتن سنگھ گرجاکھیا اور دوسرے سرداروں کی فوجیں نے کہ جن میں پانچ ہزار آدمی تھے اور ایک پایاب نالہ پار کر کے دشمن کو اچانک آلیا، اور اس کو ہر طرف سے گھیر کر کاٹھیوں سے تلواریں کھینچ لیں اور سید کو اس کے پانسو آدمیوں سمیت قتل کر دیا اور اس کے خیموں، سامان، ہاتھی، متعدد پرزوں اور آلات، اور تلواروں پر قبضہ کر لیا۔ اس کی فوج کے باقی لوگوں نے بھاگ کر جانیں بچائیں۔"

تواریخ ہزارہ کی روایت جس کی طرف کوئی اعتنا نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ یہ منظورہ اور وقائع اور بعد کی دوسری شدہ کتابوں کے بعض مبہم مقامات کی توضیح کرتی ہے۔

یہ پیگٹ اور ہیسن کے بیان کی توثیق کرتی ہے کہ سکھوں نے وہابیوں کے پہلے حملے کے دوران کیا کیا پسپائیاں اور آفتیں جھیلیں۔

یہ سید احمدؒ کے محفوظ مقام سے نکل کر نشیبی زمین میں ماٹی کوٹ کے دامن کے نزدیک سکھوں سے ٹکر لینے کے اچانک اور عجیب فیصلے کی توضیح بھی کرتی ہے۔ غالباً یہ سکھوں کے دوگرتے ہوئے جھنڈوں کا منظر تھا جس نے وہابیوں کو یہ سمجھ کر کہ سکھ پسپا ہوا چاہتے ہیں شدت سے حملہ آور ہونے کی ہمت دلائی۔

مہر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلے منصوبے کا فوری طور پر ترک کر دینا حیرت انگیز تھا، اور سید احمدؒ کے بعض رفقاء کا خیال تھا کہ وہابیوں کی شکست کا سبب یہی ہوا۔ لیکن مہر نے ان کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے اور یہ رائے قائم کی ہے کہ منصوبہ غالباً اس لیے ترک کیا گیا کہ سکھ جنوب سے بھی چڑھائی کرنے لگے اور دریا پار سے بالاکوٹ پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ تواریخ ہزارہ میں ان دونوں واقعات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اگرچہ وہ ہر جہت سے جنگ کی تفصیلات سے بہت معمور ہے۔ مہر خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کا متذکرہ مفروضہ واقعات پر مبنی تو نہیں مگر صورتِ حال کی تشریح کے لیے بہت زیادہ قرین قیاس ہے مگر

تواریخ ہزارہ میں دوسرا سبب بیان کیا گیا ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔

منظورہ اور وقائع سے ظاہر ہے کہ دونوں فوجیں دریا کے پار کچھ دیر تک ایک دوسرے سے مقابل رہیں۔ مگر یہ مآخذ ٹھیک وقت نہیں بتاتے۔ منظورہ سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ شیر سنگھ کے آنے کے بعد گڑھی کی مرمت پر سولہ دن صرف ہوئے اور اس کے فوراً بعد جنگ چھڑی۔

یہ مسودہ اُن کی معین تعداد بھی بتاتا ہے جو سید احمدؒ کے آخری چند گھنٹوں میں ان کے دوش بدوش لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

وقائع نویس کی رپورٹ میں سکھوں کی پسپائی کا جس میں تین سو سپاہی ہلاک ہوئے جو ذکر ہے، وہ واقع ہوئی ہو گی جہاں سنگھ کی سپاہ سے جھڑپ کے دوران میں جب گڑھی کی مرمت ہو رہی تھی۔

جنگ کی تاریخ کے بارے میں تینوں مآخذ تین مختلف تاریخیں بتاتے ہیں، گو ان میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ جعفر کے بیان کے مطابق ۱۰ مئی تواریخ ہزارہ کے مطابق ۷ مئی اور وقائع نویس کی رپورٹ کے مطابق ۸ مئی آخر الذکر کی تاریخ تحریر ۱۰ مئی ۱۸۳۱ء ہے۔ اور زمانہ وقوعہ سے قریب ترین ہونے کے سبب سے سب سے زیادہ اقرب الی الصواب۔

(ب) سید احمدؒ کی سرحدی جنگوں کے سیاسی نتائج

سکھوں کی تاریخ پر عام تالیفوں میں سید احمد اور سکھوں کے درمیان جنگوں کے واقعات کی طرف یا تو زیادہ اعتنا نہیں کی گئی یا بالکل ترک کر دیے گئے۔ اس کا سبب ایک تو اس موضوع پر انگریزی میں مواد کی نادستیابی ہے۔ پھر بھی جو منتشر حوالے ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمدؒ کی کارروائیوں اور مساعی پر سکھ دربار نے جو دھمکی دی تھی وہ بالکل بے معنی نہ تھی۔ اگرچہ سید احمد براہِ راست سیاسیات سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے ان کی جنگوں کا ایک اہم سیاسی نتیجہ ضرور ظاہر ہوا۔

رنجیت سنگھ کی سندھ سے دلچسپی

۱۸۰۹ء کے معاہدہ کے وقت سے ہی رنجیت سنگھ کی نظریں سندھ اور خاص کر کے شکارپور پر گڑی ہوئی تھیں۔ حکومت برطانیہ اول اول اس سلسلے میں سکھوں کے عزائم اور حرکات کو دور سے دیکھتی رہی، اس معاملہ میں اس کی اپنی کوئی خاص پالیسی نہ تھی۔ پی این کھیرا نے اپنی مختصر مگر عمدہ تالیف میں صورت حال کو جامعیت سے یوں بیان کیا ہے :۔

"۱۸۲۰ء سے ۱۸۳۰ء تک کا ایک عشرہ (۱۸۲۵ء) میں ایک معمولی استثنا کے ساتھ) عدم مداخلت اور نگرانی وچشم گماری میں امتیاز رکھتا ہے (یعنی ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی پالیسی) ۱۸۲۵ء سے جب کہ رنجیت سنگھ کی فوج خوب منظم تھی لارڈ ولیم بنٹنگ کے اوائل عہد تک جب کہ حکومت برطانیہ نے اپنی عدم مداخلت کی پالیسی بدل کر پرامن تجارتی منصوبے کی خاطر سندھ میں دلچسپی لینا شروع کی اُس وقت رنجیت سنگھ سندھ پر حملہ کر سکتا تھا اور شاید۔ اُس ملک کا ایک حصہ لے بھی لیا ہوتا۔ اور برطانیہ کی مداخلت درکنار کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا"[1]

---

[1] پی این کھیرا BRITISH POLICY TOWARDS SIND UP TO ANNEXATION, 1843 لاہور ۱۹۴۱ء صہ ۸

یہ واقعہ ہے کہ برطانیہ کو اُس وقت تک سندھ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رنجیت سنگھ نے یہ محسوس کر کے اپنی مجوزہ فوج کشی کے لیے اس بہانے سے تیاریاں بھی شروع کر دیں کہ وہ خراج وصول کرانا ہے جو امیروں نے حکومت افغان کو ادا کیا۔ حالانکہ رنجیت سنگھ اس حکومت کی وراثت کا مدعی تھا۔ مگر صوبۂ شمالی و مغربی میں ایک نئے خطرے کے رونما ہو جانے سے اُس کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ سکھوں کے ایک زبردست دشمن سید احمدؒ نے مسلح مخالفت شروع کر دی اور کئی سال تک اس سکھ راجہ کی تمام تر توجہ اپنی طرف جذب رکھی۔ اس طرح اگرچہ سید احمد کو کنور شیر سنگھ نے ۱۸۳۱ء میں شکست دی اور قتل کیا مگر سندھ کو کفار کے پنجے سے بچانے والے بالواسطہ وہی تھے[1] ۱۸۳۱ء تک جب کہ رنجیت سنگھ نے اس خطرے سے نجات پائی تو اس نے دیکھا کہ سندھ کے متعلق انگریزوں کی نیت بدل گئی ہے۔

سیّد احمدؒ کی شہادت پر رنجیت سنگھ کا اظہار مسرّت

سید احمد کی شکست اور شہادت سے رنجیت سنگھ کو بڑا اطمینان ہوا۔ ویڈ نے اپنے متذکرہ مکتوب میں لکھا ہے "رنجیت سنگھ اپنی اس فتح پر پھولا نہ سماتا تھا جس نے اس کی حکومت کو دائمی خلفشار اور بے چینی سے نجات دلائی۔ اس نے اس واقعہ کی یاد میں توپوں سے سلامی دینے اور شہر امرتسر میں چراغاں کرنے کا حکم دیا۔ جو قاصد یہ خوشخبری لایا تھا اُسے ایک جوڑا سونے کے کنگن قیمتی تین سو روپیہ، ایک پگڑی اور شال کا جوڑا عنایت ہوا۔" کنور کو ایک خط میں اس کے خط کی رسید اُس کے اعلیٰ کارناموں کا اعتراف اور اُس کے واپس آنے کے بعد مزید جاگیر کا وعدہ تحریر کیا۔ گوبند گڑھ کے گورنر فقیر امام الدین کو بھی ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ قلعہ کی ہر توپ سے گیارہ گیارہ گولوں کی سلامی داغی جائے۔

حکومت ہند نے بھی اپنے پولٹیکل اسسٹنٹ کو حکم دیا کہ گورنر جنرل کی طرف سے مہاراجہ

[1] ایضاً صفحہ ۹-۲۴

رنجیت سنگھ کو اُس فتنے کی آگ کے ٹھنڈی ہو جانے پر جو اس شخص (سید احمدؒ) نے برانگیختہ کر رکھی تھی مبارکباد پیش کر دے۔

نظریہ غیبوبت سید احمدؒ

سید احمدؒ کی زندگی کے آخری لمحوں سے متعلق واقعات راز میں ملفوف رہے۔ اس لیے ان کے واقعی خاتمہ کے متعلق ایک نزاع چل پڑی جو کچھ مدت تک جاری رہی۔ سب سے آخر میں ان کو ایک گھمسان دست بدست معرکہ میں لڑتے دیکھا گیا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئے کسی نے ان کو گرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس لیے وہابیوں کے ایک طبقے میں یہ خیال چکر لگاتا رہا کہ سید احمد شہید نہیں غائب ہو گئے ہیں اور آئندہ کسی وقت پھر ظاہر ہوں گے۔ منطق اور عقل کی روشنی میں سید احمدؒ قطعاً اسی جنگ میں شہید ہو گئے۔ مگر بالاکوٹ کے باقی ماندہ لوگوں اور ان کے بہت سے رفقا و متبعین کے لیے یہ ناگہانی شدید ضرب ناقابل برداشت تھی۔

انھوں نے ایک مقصد عالی کے حصول کے لیے اپنی تمام مادی املاک قربان کر دی تھی اور سید احمد کے ساتھ ساتھ ناقابل قیام دُکھ جھیلے تھے۔ لیکن اب قسمت کی ہوشربا ناگہانی سرگشتگی سے سب مٹ رہا تھا۔

غیبوبت کے نظریے کا پس منظر یہی ہے۔ در اصل یہ ایک ہیجانی ردعمل تھا۔ ان کے مادی حرکات و سکنات کے منظر سے ان کے محبوب سردار و رہنما کے یک بیک اُٹھ جانے اور مرجانے پر یقین کرنا ان کے لیے دشوار تھا۔ یہ نظریہ ان کے اس راسخ عقیدے کا ایک مقدس سایہ بھی تھا کہ سید احمدؒ جسمانی طور پر فنا ہو گئے ہوں تو ہو گئے ہوں مگر ان کا مشن فنا نہیں ہو سکتا۔

ہٹلر اور سبھاش چندر بوس کی موتیں ہمارے عصر کے واقعات ہیں۔ ان کی موتیں بھی پردۂ راز میں مخفی تھیں۔ اول الذکر کی موت کے متعلق حکومت ہند کی مسلسل تحقیقات کے باوجود ان دونوں لیڈروں کے ہموطنوں کے ایک طبقے میں ان کی زندگی کا عقیدہ اب

تک موجود ہے۔ اگر محض سیاسی لیڈروں کے لیے ایسی محکم وفاداری و جاں نثاری ہوسکتی ہے تو ایسے شخص کے لیے جو صرف سیاسی لیڈر نہیں بلکہ حسنات وخیرات کا کامل نمونہ تھا اس کے متبعین میں جو گرم جوشی اور سرشاری محبت و عقیدت پیدا ہوئی ہوگی اقیاس کی جاسکتی ہے۔

عقیدۂ ظہورِ ثانی

صادق پور کے ارکان خاندان خصوصًا ولایت علی پر انگریز اور ہندوستانی مصنفوں نے سید احمد کے ظہورِ ثانی کے عقیدہ کی اشاعت[1] پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔ اُن پر اس عقیدے کی اشاعت میں دانستہ بے ایمانی کا الزام عاید کیا گیا ہے کہ ولایت علی نے اس مقصد سے یہ قدم اٹھایا ہے کہ تحریک کی ڈوبی ہوئی ناؤ کو پھر ابھارا جاسکے اور اس جدوجہد میں اپنی سرداری بحال رکھی جائے[2]

جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ عقیدہ ایک وقتی ہیجانی ردِ عمل تھا۔ اس پر سختی سے نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس تحریک کی خدمات جو ولایت علی اور ان کے بھائی عنایت علی نے انجام دیں وہ اتنی ٹھوس تھیں کہ اتنے سے موہوم فائدہ کے کمزور سہارے کی محتاج نہ تھیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ جو تمام زخموں کو مندمل کر دیتا ہے اس عقیدے پر الیقان کی شدت ہلکی ہوتی گئی۔ ایک دستاویز[3] مورخہ ۱۸۴۵ء میں خاص طور پر مذکور ہے کہ ۱۸۳۹ء کے قریب جب عنایت علی نے اول اول اس تحریک کی قیادت سنبھالی تو اس عقیدے کی بنیادی اہمیت باقی نہ رہی تھی۔ اگر لوگوں کا میلان ہوتا تو یہ عقیدہ رکھ سکتے تھے۔ ورنہ نہ تو اس پر کوئی جبر تھا نہ اس عقیدے کے منکروں پر کوئی الزام عائد کیا جاتا۔ خود سوانحِ احمدی کے مؤلف (جعفر تھانیسری) جو شروع میں یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ امتدادِ زمانہ

---

[1] رسالہ دعوت ولایت علی مشمولہ رسائل تسعہ

[2] "آور انڈین مسلمان" مولفہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ص ۴۷-۴۸

[3] پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کا محفوظ مکتوبات سید احمد ص ۲۲۰ سوانح ص ۱۷۹-۱۸۰

کے ساتھ اس سے دست بردار ہو گئے۔

سید احمد معرکہ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے اور ان کے چیدہ رفقا بھی پالوسیوں اور انتشار و پراگندگی کی ایک مختصر مدت کے بعد شیخ محمد ولی پھلتی سردار منتخب ہوئے اور تمام حاضرین سے بیعتیں لیں۔ وہابیوں کا ایک اور گروہ جو جنگ بالاکوٹ کے موقع پر مظفر آباد میں تعینات تھا وہ بھی واپس آ گیا اور شیخ محمد پھلتی کے گروہ میں شامل ہو گیا۔

آئندہ چند برسوں میں وہابی جگہ جگہ مارے پھرے اور اپنے ذرائع کو دوبارہ درست اور منظم کرنے کے لیے مختلف سرداروں سے مدد طلب کی، مگر قبائلی سردار زیادہ تر ذاتی اور مقامی مصالح کے تابع تھے۔ وہ تو اپنے اپنے علاقوں اور حدود و اثر کی توسیع کے لیے وہابیوں کی خدمات کے خواہاں رہتے تھے، کیونکہ وہ مسلّح، تربیت یافتہ اور جنگ آزمودہ لوگ تھے۔

وہابیوں کو پائندہ خاں کی پیش کش

بالاکوٹ کے بعد وہابیوں کا پہلا پڑاؤ ایک مقام نندھیار میں ہوا جہاں وہ کوئی دس مہینے رہے۔ اس کے سردار کو بدگمان اور نامددگار پاکر وہ پنج تار منتقل ہو گئے جو سید احمدؒ کی زندگی تک ان کی قومی کارروائیوں کا مرکز رہ چکا تھا۔ مگر وہاں بھی دہی دشواریاں پیش آئیں۔ تو آمب کے سردار پائندہ خاں کی امداد اور مہمان نوازی کی پیش کش پر وہ آمب کو منتقل ہو گئے۔ اس سے پہلے ۱۸۳۰ء میں پائندہ خاں سید احمدؒ سے شکست کھا چکا تھا لیکن اب اس نے مصالحانہ رویہ ظاہر کیا اور وہابیوں کو اپنی قلمرو میں اقامت کے لیے مدعو کیا اور اگرور کے سردار کے ہمسایہ علاقے میں جسّی کا قلعہ اور ملحقہ زمینیں دیں۔ بظاہر یہ اعانت کے علامات تھے لیکن دراصل وہ ایک پتھر سے دو چڑیوں کا شکار کرنا چاہتا تھا اُس میں اور اگرور کے سردار میں پرانی عداوت چلی آتی تھی۔ اس کی بہن اگرور کے سردار سے منسوب تھی۔ مگر دونوں کے درمیان کچھ تنازع کے سبب سے شادی ملتوی ہوتی چلی آتی تھی۔ جب وہ سید احمد کے ہاتھوں شکست کھا کر نکل بھاگا تو اس کا خاندان پیچھے

رہ گیا اور سید احمدؒ کے قبضے میں آگیا اسے انہوں نے کشادہ دلی سے اگردر کے سردار کے حوالہ کر دیا کہ اسے پائندہ خاں کے پاس پہنچا دے۔

سردار اگردر نے خاندان کو پائندہ خاں کے پاس بھیج تو دیا مگر اس کی بہن کو جو اس سے منسوب تھی اپنے پاس روک رکھا۔ اس حرکت پر پائندہ خاں نے اسے کبھی معاف نہ کیا اور اُس سے اپنی مخفی عداوت برقرار رکھی۔ اب وہابیوں کو اس سردار کی قلمرو سے متصل ایک قطعہ زمین دے کر اسے توقع تھی کہ ان کے درمیان نزاع پیدا ہو جائے گا۔ اور وہابی اس کی سرکوبی کر دیں گے، اور اس کش مکش میں خود بھی کمزور ہو جائیں گے۔ وہ اپنے اس منصوبے میں قریب قریب کامیاب ہو چکا تھا۔

وہابیوں کا ستھانہ میں قیام

وہابیوں نے اس کے منصوبے کو بھانپ کر اس کی دعوت رد کر دی اور اپنے پرانے دوست اور محسن ستھانہ کے سید اکبر شاہ کی طرف چلے گئے۔ (۱۸۳۸ء) اس عرصے میں ان کو اپنے دہشت زدہ اور غیر منظم گروہ کو از سرِ نو منظم کرنے کے لیے ستانے اور دم لینے کا وقفہ مل گیا۔ شیخ محمد پھلتی نے پورے گروہ کو دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جن کو دو علیحدہ علیحدہ کام سونپ دیے گئے۔ جب وہابی ستھانہ میں جم گئے تو شیخ پھلتی بنیر میں تخت بند چلے گئے اور سید احمدؒ کے افرادِ خاندان کو ستھانہ لے آئے۔ یہ افراد سندھ میں باقی افرادِ خاندان سے جو وہاں مقیم تھے جا ملنا چاہتے تھے۔ شیخ محمد کی ساری کوششیں اُس کام کی طرف مرکوز تھیں جو انہوں نے ۱۸۳۶-۳۷ء میں انجام کو پہنچایا۔ اس لیے انہوں نے آئندہ ہونے والی جنگ میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ اور یہ کام دوسری جماعت نے نصیر الدین منگلوری شاہ جہاں پور یوپی کے زیر قیادت انجام دیا۔

وہابیوں اور فتح خاں کی لڑائی

وہابیوں کو ستھانہ میں ایک عارضی پناہ گاہ مل جانے کے بعد بھی چین نہ ملا۔ کئی

قبائل وہابیوں کی شکست اور تباہی کے منصوبے بنایا کرتے تھے وہ ان کی خفیہ سازشوں اور مخاصمانہ منصوبوں کا شکار رہے۔ مغرب میں فتح خاں کا علاقہ تھا۔ وادیوں کے قبائلی ۱۸۳۱ء میں وہابیوں کے خلاف غداری کے وقت سے ان کے دشمن ہو گئے تھے، وہابیوں کے زبردست دشمن سکھ بھی وہیں تھے۔ پھر بھی یہ تین سال نصیرالدین کی قیادت میں خاموش رہے یہ منظم ترقی کا زمانہ تھا۔ ہندوستان سے مالی اعانت اور رنگروٹوں کی آمد کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔

ہندوستان سے کارروائیوں کو فتح خاں کی سرزمین سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ وہابیوں کا مخالف تھا مگر اُن کو نکال نہ سکتا تھا۔ اس لیے ان کو دق کرنے بلکہ ہندوستان سے آنے والے کاروانوں کو لوٹ لینے کا طریقہ بھی اختیار کر لیا یہ وہابیوں کے ایک نہایت زخمی عضو پر چوٹ کرنا تھا، اس لیے کہ یہی کارواں ہندوستان سے قیمتی امدادی سامان لاتے تھے، جن کے بغیر لڑائی جاری نہ رکھی جا سکتی تھی۔ اس لیے وہابیوں نے اس مداخلت کی جڑ کو مستقلاً کھود پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے ایک گاؤں منارا پر جہاں ایک ہندوستانی قافلہ کی راہ روک کر لوٹا گیا تھا حملہ کر دیا۔ اس طرح ایک اور سرکش گاؤں ٹوپی پر بھی حملہ کیا مگر حملہ آور گروہ کو فتح خاں کے آدمیوں نے گاؤں کے اندر ہر طرف سے گھیر لیا اور وہابیوں کی مراجعت کی راہ بند کر کے اپنی کثیر تعداد فوج سے وہابیوں کو گھیر لیا اور شکست دے دی۔ قائد نصیرالدین شہید ہو گئے۔ اس طرح زمانۂ مابعد بالاکوٹ کا ایک دور ختم ہو گیا۔ دوسرا دور ایک دوسرے نصیرالدین دہلوی[1] کے زیر قیادت شروع ہوا۔ اُن کے پہنچنے سے پہلے درمیانی وقفے میں موضع سورج گڑھ ضلع مونگیر کے ساکن میر اولاد علی قائد منتخب ہوئے۔

---

[1] یہ شاہ عبدالعزیز کے پوتے اور جانشین مولوی اسحاق کے داماد تھے۔

(ج) نصیر الدین دہلوی کے زیر قیادت سندھ کی فوج

اس زمانے میں وہابی تحریک ایک بڑے نازک مرحلے سے گزر رہی تھی۔ کسی نہ کسی مقامی سردار کے ساتھ برسوں کی بے قاعدہ آویزش سے مجاہدین کی تعداد گھٹ گئی تھی۔ فتح خاں کی دشمنی نے ہندوستان سے آدمیوں اور مال کی آمد کو بہت متاثر کر دیا تھا۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ نئے سردار کا انتخاب کیا جائے جو اس تحریک کے حامیوں میں ایک نئی جان ڈال دے چنانچہ نصیر الدین منتخب کیے گئے۔ دہلی کے مشہور منتقی گھرانے سے قریبی تعلق رکھنے کے سبب سے اُن کا انتخاب ایک نئی جان کا ذریعہ بنا۔ وہ ۱۸۳۵ء میں دہلی سے چلے اور ٹونک، اجمیر، اور جے پور سے ہوتے ہوئے ۱۸۳۷ء میں سندھ پہنچے۔ دوران سفر میں ہندوستان کے بہت سے زنگر وٹوں کی ٹولیاں اُن سے آملیں اور ٹونک میں نواب سے بیش قرار مالی امداد بھی حاصل ہوئی۔ پہلے وہ حروں کے مرکز پیر کوٹ میں ٹھہرے۔ جہاں سید احمدؒ کے خاندان کے افراد مقیم تھے۔ وہاں سے وہ حیدر آباد سندھ کی طرف چلے جہاں امیروں سے ملے۔ انہوں نے اُن کی ضیافت تو کی مگر کسی معتد بہ امداد کا وعدہ نہیں کیا۔ نواب مبارز الدولہ حیدر آباد کے ایک کارپرداز کے بیان کے مطابق جو اُسی زمانہ کے لگ بھگ سندھ بھیجا گیا تھا نصیر الدین اور ان کے گروہ کو کرنل پوٹنگر[1] کے مشورے سے سندھ چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا مگر ان کی طرف سے کچھ بااثر اشخاص نے مداخلت کی اور انہیں کچھ دن ٹھہر جانے کی اجازت مل گئی اور نصیر الدین پھر پیر کوٹ چلے گئے۔ وہ کچھ دن ٹنکاد پور میں بھی ٹھہرے جہاں مذکرہ کارپرداز اُن سے

---

[1] لفٹنٹ کرنل پوٹنگر کچھ میں پولٹیکل ایجنٹ تھا۔ وہ ۲۰ اپریل ۱۸۳۹ء کے معاہدہ کی تحریک کا ایک آلہ کار تھا جس نے دریائے سندھ کو انگریزوں کے تجارتی استعمال کے لیے کھول دیا۔ بعد میں وہ امیروں کے دربار میں ریزیڈنٹ ہوگیا اور سندھ کے الحاق میں ایک اہم حصہ لیا تھا۔

ملے اور رپورٹ کی کہ نصیر الدین کے ساتھ دو سو رفقا ہیں جو بنگال کی فوج کے منتظر ہیں۔

سندھ مرکز جہاد

نصیر الدین کا اصل منصوبہ سرحد کی طرف روانہ ہونے کا تھا۔ لیکن بعض سیاسی موانع کے سبب سے انہوں نے سندھ میں ہی ٹھہرے رہنے اور اسی کو اپنی جدو جہد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے وہاں سے برطانوی ہند کے متفرق اشخاص اور اہم سرداروں کو خطوط لکھ کر ان کی امداد اور معاونت طلب کی۔ ان کی اپیل کا جواب حوصلہ افزا تھا اور ملک کے مختلف حصوں بالخصوص بہار اور بنگال سے جہاں برادران علی (ولایت علی و عنایت علی) مصروف کار تھے آدمی اور روپے موصول ہوئے۔ اس سلسلے میں نصیر الدین کے خطوط میں ولایت علی کا نام بار بار مذکور ہوا ہے۔

سندھ کے سیاسی حالات

نصیر الدین نے اپنی جدوجہد کا مرکز سندھ کو کیوں قرار دیا، اس کا سبب سمجھنے کے لیے اس وقت کے سندھ کی سیاسی صورت حال کا یہاں مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ جائزہ اُن مسلسل رپورٹوں پر مبنی ہے جو لدھیانہ میں انگریزوں کے پولیٹیکل ایجنٹ کپتان ویڈ نے ارسال کی تھیں:۔

اس زمانہ میں امرائے سندھ کا سیاسی مقام بالکل غیر مستقل تھا۔ تین زبردست طاقتوں، سکھ دُرانی اور انگریز کے درمیان محصور و مجبور وہ ہر ایک کی دست درازی سے خائف رہتے تھے، اس لیے ان کی پالیسی وقت اور موقع محل کی مناسبت سے بنا کرتی۔ اسی لحاظ سے کبھی اس کا ساتھ دیتے کبھی اُس کا۔ دُرانی حکومت کے عروج کے زمانے میں شکارپور اسی کی قلمرو میں تھا۔ بعد میں سندھ کے تالپوروں نے اُس پر قبضہ کر لیا مگر درانیوں کو خراج دیتے رہے۔ درّانی حکومت کے زوال کے بعد انہوں نے خراج روک دیا مگر اس کے دوبارہ مطالبہ کا ڈر ہمیشہ لگا رہا۔ اور ہوا بھی یہی۔ شاہ شجاع جب افغانستان کو دوبارہ فتح کرنے نکلا اور شکارپور سے گزرا تو انہیں اسے پانچ لاکھ کی رقم ادا کرنا پڑی۔

مگر اس کو شکست ہو گئی اور اُدھر سے دوسری بار گزرتے ہوئے بقایا خراج کی ادائی کا سوال اُٹھایا۔ امرا مایوسی میں شجاع کے مطالبہ سے جان بچانے کو شکارپور سکھوں کے حوالہ کر دینے کے امکان پر غور کرنے لگے۔

رنجیت سنگھ کا امرا سے خراج کا مطالبہ

رنجیت سنگھ نے جنوب مشرق میں ۱۸۰۹ء کے انگریز سکھ معاہدے سے مات کھا کر اپنی سیاسی حدود کو جنوب مغرب (سندھ) کی طرف وسیع کرنا چاہا۔ تالپور نے شکارپور کلہوڑوں سے چھینا تھا اس لیے رنجیت سنگھ نے کلہوڑوں کے ایک نمائندہ عبدالنبی کو آگے چل کر تالپوروں کے خلاف کھڑا کر دینے کی غرض سے اپنی جنوب مغرب سرحد پر متعین کر دیا۔ کپتان ویڈ نے اپنی رپورٹ مورخہ ۱۸ امئی ۱۸۳۱ء میں بڑی سیاسی چالاکی سے اپنی حکومت کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ "جنگ بالاکوٹ کے فوراً بعد رنجیت سنگھ پھر سندھ کے علاقے کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اُس نے لکھا کہ سید نے رنجیت سنگھ کے اسلحہ کو پانچ سال تک اُلجھائے رکھا تھا، اب سید کی شکست اور فنا کے بعد سکھ اپنی فوجی کارروائیوں کے لیے آئندہ میدان کی تلاش میں ہیں۔ اور یہ میدان شکارپور کی طرف ہے۔ سندھیوں سے اس کے حاصل کرنے کے لیے یا نوابان بہاولپور کو (جو ستلج کے مغرب میں واقع ہے) قابو میں لانے کے رنجیت سنگھ آرزو مند رہا ہے اس لیے ممکن ہے کہ وہ ادھر اپنی فوج روانہ کر دے۔ پانچ برس ہوتے ہیں مہاراجہ (رنجیت سنگھ) نے امرائے سندھ کے ایلچیوں سے جو دربار میں حاضر تھے اُس خراج کا مطالبہ کیا تھا جو امرا حکومت افغانستان کو ادا کیا کرتے تھے اور دلیل یہ تھی کہ حکومت کابل کے زوال کے بعد سے اس سلطنت کا سب سے بڑا حصہ اُسی کو ملا کرتا تھا اور وہ اس حصّہ کا وارث ہے۔"

مزاری قبیلہ

امرائے سندھ دل سے سکھوں سے مقابلہ کرنے کے خواہاں تھے۔ کھلم کھلا مقابلہ کے لیے نہ ان کے پاس وسائل تھے نہ طاقت۔ بہرحال اس کو مزاریوں کا قبیلہ ایک اچھا حلیف

ہاتھ آگیا۔ یہ بلوچی تھے۔ جن کی سکھوں سے آئے دن سرحدی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کو امرا کی اور سندھ کی سیاسیات میں بعض اور عناصر کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ ملتان کے سکھ گورنر نے ان کے ترکتاز کو روکنے کے لیے روجہان کا سرحدی قلعہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا (اگست ۱۸۳۶ء) اور وہاں ایک محافظ فوج متعین کر دی۔

سندھ پر انگریزوں کی نظر

سندھ کے متعلق انگریزوں کے منصوبے الگ تھے۔ ۱۸۳۰ء میں بمبئی فوج کے الیگزینڈر برنس کو تعینات کیا گیا تھا کہ گھوڑے اور دوسرے تحائف جو شاہ انگلستان نے رنجیت سنگھ کو بھیجے تھے سندھ کی راہ سے لے جائے۔ اس سفر کے اصل مقصد پر تبصرہ کرتا ہوا ٹروٹر لکھتا ہے:۔

"اس کا صاف مقصد یہ تھا کہ دریائے سندھ کو برطانوی تجارت کے لیے کھول دیا جائے مگر ساتھ ہی اپنے گرد و پیش کا خوب معائنہ کرے۔ سندھ کی سیاست سے متعلق معلومات حاصل کر کے اُس بڑے دریا (سندھ) کا جائزہ لے اور تحقیق کرے جس کے بارے میں اُس وقت ہمیں کچھ واقفیت نہ تھی۔ اور اس کے دونوں کناروں پر امراء سے دوستی گانٹھے۔" برنس کا مشن امرائے سندھ کو بالکل پسند نہ آیا وہ اپنا ملک غیر ملکی تاجروں کے لیے کھولنا نہ چاہتے تھے۔ اور ایسی طاقت کی طرف سے کسی اقدام پر اُن کو اعتماد نہ تھا جسے وہ صرف اس کے جوع الارض کے لیے پہچانتے تھے۔ ایک بلوچی افسر نے کہا "بلا تو آچکی۔ انگریزوں نے ہمارا ملک دیکھ ہی لیا"[۱]

برنس کے مشن کی مخالفت

امرانے برنس کے مشن کو مختلف عذروں سے ناکام کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی مخالفت پر انگریز اور سکھ دونوں چراغ پا ہوئے۔ رنجیت سنگھ نے اس مخالفت کو اپنی

---

[۱] "لارڈ اکلینڈ" مولفہ ایل جے ٹروٹر ۱۸۹۳ء صفحہ ۴۰

ذاتی توہین قرار دیا، کیونکہ واضح طور پر یہ مشن اس کے لیے شاہی تحائف لے کر آیا تھا۔ اس نے امیروں کو لکھا اور زور دیا کہ راستہ دے دیں۔ لیکن امراء نے رنجیت سنگھ کو اپنی مخالفت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا کہ برنس کے مشن کا مقصد جو ظاہر کیا گیا ہے وہ محض ایک بہانہ ہے اور جو سامان وہ لا رہا ہے وہ مہاراجہ کے دشمن سید احمد کو دینے کے لیے ہے[1]۔" امیروں نے اس طرح برنس کے مشن کی مخالفت میں نہایت عیاری سے رنجیت سنگھ کے دماغ میں بسے ہوئے سید احمد کے خوف و خطرے سے کام لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ رنجیت سنگھ آخر میں آمادہ ہوا تو ونٹورا کے فوجی مظاہرے سے جس کا رنجیت سنگھ نے حکم دیا تھا۔ آخر بہت تاخیر و تذبذب کے بعد ایلچی کو دریائے سندھ سے گزر کر سکھ دربار تک پہنچنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے دو برس کے بعد جون ۱۸۳۲ء میں کرنل ہنری پوٹنگر نے وہ معاہدہ تیار کیا جس کی رو سے دریائے سندھ کو بیرانی اور انگریزوں کی تجارتی اغراض کے لیے کھول دیا گیا انگریز سندھ سے متعلق رنجیت سنگھ کی نیت سے اندیشہ رکھتے تھے۔ مگر اس کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کرنا چاہتے تھے کہ امراء سکھوں کے ساتھ مزاریوں کی گوریلا جنگ میں حوصلہ افزائی کریں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو سندھ میں براہ راست مزید مداخلت کا بہانہ مل جائے۔

رُوس اور برطانیہ کی سندھ پر نظر

اُدھر رنجیت سنگھ سندھ میں انگریزوں کے سیاسی منصوبوں سے مشتبہ تھا۔ متذکرہ بالا مشن میں کپتان برنس سے اس خصوص میں کھود کھود کر سوال کیے گئے۔ برنس نے انگریزوں کی پالیسی کے مقاصد ایسے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جن سے اُس کے خیال میں رنجیت سنگھ کے شبہات زائل ہو جائیں اور سکھ دربار میں اس پھیلی ہوئی افواہ کی تردید کی کہ انگریزوں نے شکارپور پر قبضہ کر لیا ہے۔ کپتان برنس کے جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے ویڈ نے حکومت کے نام ایک خط میں اس جواب سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ اس کے

---

[1] "سندھ کے الحاق تک برطانوی پالیسی" مؤلفہ پی این کھیرا۔ لاہور ۱۹۴۱ء

خیال میں کپتان برنس کو گورنر جنرل کی مجلس شوریٰ کے اس بیان کا اعادہ کرنا تھا کہ برطانوی پالیسی کا سب سے بڑا مقصد باہمی مفاہمت قائم کرنا اور کل ہمسایہ طاقتوں کے درمیان امن اور ہمواری پیدا کرنا ہے۔ اس بیان میں چاہیے تو یہ تھا کہ حکومت کی مرضی ظاہر کر دی جاتی بجائے اس کے کہ خود غرضانہ طور پہ اس بات کا اظہار کیا جاتا جو یقیناً مہاراجہ کے لیے پسندیدہ نہیں ہو سکتی تھی جس کا تعاون حاصل کرنے کی مجھ سے توقع کی گئی تھی اور جو رضا جوئی کے سوا اور کسی صورت سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔" اس طرح ظاہر ہے کہ انگریز رنجیت سنگھ کی نیت سے چوکنا ہونے کے ساتھ کھلم کھلا اس سے عداوت مول لینا ناپسند کرتے تھے۔ انگریز وسط ایشیا میں روس کی مفروضہ پیش قدمی کا جو اس زمانے میں حقیقی اور قریب الوقوع معلوم ہوتی تھی مقابلہ کرنے کے لیے رنجیت سنگھ کی امداد اور تعاون کی بڑی قدر و قیمت سمجھتے تھے۔ اسی امکان کے پیش نظر انھوں نے افغانستان کے دو خارج الوطن حاکموں، شاہ زماں اور شاہ شجاع کو سیاسی پناہ دے رکھی تھی، جن کے ذریعے سے وہ افغانستان میں اپنا اثر وسیع کرنا چاہتے تھے۔ اور وہی انگریزی اور روسی شہنشاہیت کے درمیان استخوان نزاع تھا۔ چنانچہ یہ دونوں عظیم طاقتیں سندھ کو ہڑپ کرنے کی نیت رکھتی اور ایک دوسرے پہ گہری نظر رکھتی تھیں۔ درحقیقت ٹھیک ٹھیک یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ انگریز سکھوں کے پہل کر لینے کے خوف سے سندھ کے الحاق کے لیے کتنے متعجل اور بے چین تھے۔

نصیر الدین اور مزاری قبیلہ

یہ تھی سندھ کی سیاسی صورت حال جب کہ نصیر الدین وہاں پہنچے۔ انہوں نے مزاریوں کو قیمتی حلیف پایا۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ سکھوں سے گوریلا جنگ لڑ رہے تھے وہ نہ سکھوں کے زیر اثر تھے نہ انگریزوں کے۔ یہ سید احمد ؒ کی شہادت کے بعد بھی ان کے متبعین کے اس عزم کی مزید مثال ہے کہ وہ ایسی ہندوستانی طاقتوں سے اتحاد سے باز رہیں جو انگریزوں کے ماتحت ہوں۔ وہ ایسی طاقتوں سے اتحاد کو ترجیح دیتے تھے جو ذرائع کی قلت کے باوجود انگریزوں کے خلاف ہوں۔

مزاریوں کی سکھوں سے صلح

چنانچہ نصیر الدین نے مزاریوں کی سرزمین میں سکونت

اختیار کر لی جو خیرپور کی سرحد پر واقع تھی اور موجودہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے جنوب مغرب سے مربوط تھی۔ نومبر ۱۸۳۶ء میں انہوں نے سکھوں سے قلعہ روجھان اور کان میں ہونے والی جنگوں میں ان کی سپاہ نے مزاریوں کی غداری سے شکست کھائی۔ ان مزاریوں نے ملتان کے سکھ گورنر دیوان ساون مل کی وساطت سے سکھوں سے صلح کر لی تھی۔

نصیر الدین کی روانگی افغانستان

شمالی مغربی سرحد کی معمولی حرکات پھر ظہور میں آنے لگیں۔ وہابیوں سے ان کے متلون مزاج اتحادیوں نے کنارہ کشی شروع کر دی۔ سرحدی قبائل کی طرح یہ غیر تربیت یافتہ لوگ تھے جن کے پاس سکھ دربار سے مقابلہ کرنے کے لیے نہ وسائل تھے نہ تنظیم۔ پہلے ہی دھنسوڑے (یورش) کے بعد اور نیز ساون مل کی ترغیب سے انہوں نے سکھوں سے صلح قبول کر لی اور وہابیوں کو درمیان میں چھوڑ دیا۔ قدرتاً نصیر الدین سخت دشواری میں پڑ گئے۔ اکثر مقامی سردار جن سے پناہ یا مدد طلب کی جاتی وہ ان کے (وہابیوں کے) وجود ہی کو سیاسی پریشانی سمجھتے۔ اس لیے نصیر الدین افغانستان چلے گئے۔ وہاں کے کچھ سرداروں سے وہ خط و کتابت کر چکے تھے۔

انگریز افغان جنگ میں نصیر الدین کی شرکت

اس اثنا میں انگریزوں اور امیر افغانستان دوست محمد پسر پاینده خان بارک زئی کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو چلے تھے جو واقعات پہلی انگریز افغان جنگ کا باعث ہوئے اور انگریزوں کی بلا اشتعال اور بلا سبب خصومت "اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است۔" اس لیے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ جنگ کے موقع پر دوست محمد نے تربیت یافتہ وہابیوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانا اپنے لیے بہتر سمجھا۔ چنانچہ اس نے نصیر الدین کو دعوت دی اور وہ ایک ہزار سپاہ کا دستہ لے کر کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے خود دادور کے قریب پڑاؤ کیا اور تین سو سپاہیوں کی ایک ٹولی کو غزنین کی مدافعت کے لیے آگے بھیج دیا، لیکن جب انگریزوں نے اس قلعے پر یورش کی تو وہ لڑتی ہوئی گر گئی۔ نصیر الدین کی کارروائی نے ایک بار پھر یہ حقیقت نمایاں کر دی کہ وہابی ہر اس طاقت کا ساتھ دینے کو تیار تھے جو انگریز سے برسرپیکار ہو۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ "وہ

انگریز کفار پر ضرب لگانے کے لیے ہر موقع کے منتظر رہتے تھے[1] ۱۸۳۹ء کے اواخر یا ۱۸۴۰ء کے اوائل میں ایک سخت صبر آزما کوچ کے بعد نصیر الدین اور باقی فوج ستھانہ پہنچی۔ اولاد علی کے ماتحت وہابیوں کی ایک مختصر ٹولی وہاں موجود تھی۔ نصیر الدین کے پہنچنے پر وہ قائد منتخب کیے گئے مگر اس کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا اور ستھانہ میں مدفون ہوئے[2]

خلفائے عظیم آباد

سید احمد[رح] کی شہادت کے بعد کے زمانے کی طرح اس تحریک پر بڑا نازک دور آیا۔ مگر تاریخ کے اکثر واقعات کی طرح حالات نے پھر ایک وقت کا آدمی (بطل حریت) پیدا کر دیا۔ اس بار یہ سعادت بہار خصوصاً عظیم آباد پٹنہ کے نصیب میں تھی جس نے اس تحریک کو زندہ رکھنے والے مہیا کیے۔ ہنٹر اسے اپنے پرزور اور خوبصورت الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے[3]: "مذہبی دیوانوں کا مقصد پھر فوت ہوتا نظر آیا۔ لیکن پٹنہ کے خلیفوں (ولایت علی عنایت علی) کے دینی جوش اور ان کے قبضے میں کثیر مالی سامان نے اس مقدس جھنڈے کو زمین سے اٹھا لیا۔ انھوں نے سارے ہندوستان کو اپنے کارکنوں سے بھر دیا اور ایک سب سے بڑا دینی احیا جو کبھی واقع ہوا رونما کر دیا۔"

ان خلفائے عظیم آباد کے کارنامے جن میں یہ برادرانِ علی مسلمہ طور پر سب سے پیش پیش ہیں اور ان کی خدمات تحریک آئندہ باب کا موضوع ہے۔ بہر حال اس باب کے آخر میں ایک فراموش کردہ فرائضی تحریک اور اس سے متعلق بنگال کی شورش بارا سیٹ کا بیان درج کر دینا بہتر ہوگا۔

---

[1] "آور انڈین مسلمان" صـ ۲۱ کلکتہ ریویو جلد ۵۱ صفحہ ۳۸۷، ۱۸۸ - جرنل آف انڈین ہسٹری اگست ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۵۱ - ۲۶۸ [2] اس جماعت اور سرحد پر وہابی کی ایک دوسری جماعت جو جنگ بالاکوٹ کی بقایا تھی اور نصیر الدین منگلوری کے زیر قیادت تھی، کے درمیان فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ آخر الذکر کی شروع کی کارروائیاں سندھ میں ان کے ہمنام (نصیر الدین دہلوی) کی جدوجہد کے زمانے میں بیک وقت جاری تھیں۔

[3] آور انڈین مسلمان صـ ۴۹-۵۰

(د) فرائضی تحریک

حاجی شریعت اللہ

فرائضی تحریک کے بانی ضلع فرید پور کے گاؤں بہادلپور کے ساکن تھے۔ یہ ۱۷۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں حج کو روانہ ہوئے اور بیس سال عرب میں مقیم رہے۔ انھوں نے مسلم معاشرہ کی سماجی اصلاح کی تحریک جو ۱۸۰۲ء میں شروع کی تھی وہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک سے بالکل مشابہ تھی۔ اسی تحریک نے غیر اسلامی بدعات اور رسوم ورواج کی مذمت کی اور انگریزوں کے زیر حکومت بنگال کو دارالحرب قرار دیا۔ اس کے پیرو صرف قرآن کے بتائے ہوئے احکام الٰہی کی سخت پابندی میں ممتاز تھے اور تحریک نے ان میں خالص توحید وتقوےٰ کی روح پھونک دی تھی۔

بنگالی مسلمانوں پر جبر وستم

یہ تحریک بانی کے جانشین اور فرزند مولوی محمد مسلم معروف بہ دادو میاں (۱۸۱۹ء تا ۱۸۶۰ء) کے زمانے میں مزید منظم ومستحکم ہوگئی، اور ان کی قیادت میں اس کا سیاسی پہلو زیادہ نمایاں ہوگیا۔ مشرقی بنگال کے مسلم مزارعین نیل کے انگریز کاشتکاروں اور نئے ابھرنے والے زمینداروں کے طبقے کے جبر وستم کا شکار تھے۔ انھوں نے ان کو ایک مضبوط نظام میں جکڑ دیا اور جیسور، پنبہ، مالدہ، ڈھاکا اور بارا سٹیٹ کے اضلاع میں اپنے علیحدہ علیحدہ مرکزوں کے نظام کی نگرانی کے لیے اپنے خلیفے مقرر کرلئے۔ انھوں نے انگریزی عدالتوں سے کامیاب مقاطعہ بھی کرایا اور ان کو آمادہ کیا کہ اپنے جھگڑوں کے اپنی پنچایتوں میں فیصلے کرائیں۔

دادو میاں

تمام بنی نوع انسان کی سماجی مساوات اور ناجائز کثیر رقوم کے ٹیکسوں کی تنسیخ کے نظریہ کی جس کی دادو میاں نے اشاعت کی، سادہ اور مظلوم کسانوں نے گرمجوشی سے پذیرائی کی۔ ناجائز محصولات کے خلاف انھوں نے کسانوں کی حمایت کی نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی زمینداروں کی کثیر التعداد رعایا اور نیل کے کاشتکار ڈنلوپ کے اسامی دادو میاں کے ساتھ

ہو گئے۔ مقامی زمینداروں پر یہ بہت شاق گزرا اور انہوں نے دادو میاں کے خلاف متعدد فوجداری مقدمات دائر کر دیے۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۶ء تک فریقین کے درمیان مقدمات اور جوابی مقدمات کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ آخر دادو میاں ریاستی قیدی کی حیثیت سے علی پور جیل میں نظر بند کر دیے گئے۔

تیتو میر

بعد کے مرحلوں میں فرائضی تحریک اور میر نثار علی عرف تیتو میر[1] کے زیر قیادت ایک مقامی معاصر تحریک میں ضم ہو گئی۔ نثار علی ضلع بارا سیٹ کے ایک گاؤں چاند پور کے باشندہ تھے۔ وہ ایک اوسط درجہ کے زمیندار خاندان کے فرد تھے اور جوانی میں ان کا کردار متنوع تھا۔ دلی کے شاہی خاندان کے کچھ افراد سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ سفر حج میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں سید احمد سے ملاقات ہو گئی اور ان کے مرید ہو گئے[2]۔ ۱۸۲۷ء میں ہندوستان واپس آکر وہ اپنے پرانے مسکن کے قریب حیدر پور میں سکونت پذیر ہو گئے اور اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی جن کی امتیازی خصوصیت سید احمد کے نظریوں سے مماثلت تھی۔ انہوں نے کامیابی کے ساتھ کلکتہ کے شمال اور مشرق کے اضلاع کے دورے کیے اور کثیر التعداد پیرو بنا لیے۔ بہت جلد پیروں کی ایک کثیر تعداد جمع کر لی، اور چوبیس پرگنہ ندیا اور فرید پور کے تین ضلع ان کے زیر اثر آ گئے۔

تیتو میر کی اصلاحی سرگرمیاں

دادو میاں کی طرح نثار علی نے بھی مظلوم کاشتکاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا جس کو منظم اور متحد کرنے اور بے ہوشی سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ قدرتاً زمیندار طبقے نے ان کی اصلاحی مساعی کی

---

[1] اس تحریک کا مفصل بیان ایک مقالہ سے "ہندوستان کے وہابیوں کی تاریخ" کلکتہ ریویو جلد ۵۱ ص۱۷۷ تا ص۱۹۲ اور اسی تھورنٹن E - THORNTON کی تاریخ ہند لندن ۱۸۴۳ء ج ۵ ص۱۷۹ تا ۱۸۳ میں مذکور ہے اور ایس جی چودھری کی سول ڈس اوبیڈینس ان انڈیا۔ کلکتہ ۱۹۵۵ء ص۹۵ میں بھی اسی طرح کا بیان ہے۔

[2] آور انڈین مسلمان ص۴۵۔ تھورنٹن ج ۵ ص۱۷۹ مخطوطہ تاریخ احمدی مملوکہ یونیورسٹی لیبرری مغربی پنجاب میں بھی نثار علی کے خروج کا ذکر موجود ہے۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس مخطوطہ کے ضروری اجزا مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔

مخالفت کی۔ کچھ کاشتکاروں نے ان تعلیمات سے اور باتوں کے علاوہ ان کی بعض مقبول عام سماجی رسوم و رواج کے امتناع پر گھبراہٹ اور دکھ محسوس کیا۔ ایسی رعایا کی شکایات کی بنا پر زمینداروں نے ایسی جمعیت کے نشو و نما کو دبانے کی کوشش کی جو ان کی عزت و وقار کا لحاظ نہ کرتی ہو۔ اور ایک ایسی متحدہ طاقت کا مظاہرہ کرے جو ان کے مفاد پر اثر انداز ہو۔ اس قسم کے قصوروں پر جرمانہ کی جو رقم بزور وصول کی جاتی تھی اس نے معاملات کو بہت الجھا دیا۔

اجتماعی جرمانے کے خلاف بنگالی مسلمانوں کا عملی اقدام

اچھامتی ندی کے کنارے ایک گاؤں پورنا کے زمیندار کشن دیو رائے نے بعض گاؤں پر جہاں معمولی جھڑپیں ہو گئی تھیں اجتماعی جرمانہ ٹھونک دیا۔ جولائی ۱۸۳۱ء کو زمینداروں کے گماشتے ایک ایسے ہی قصوروار گاؤں سرفراز پور سے جرمانہ وصول کرنے گئے۔ وہاں تیتو میر کے بہت سے پیرو موجود تھے۔ انہوں نے ان گماشتوں کا مقابلہ کیا اور آخر میں ان کو مار بھگایا۔ مقامی تھانے میں شکایات اور جوابی شکایات داخل کی گئیں اور آخر میں دونوں فریق بری کر دیے گئے۔ پھر بھی زمیندار طرح طرح سے ان کو تنگ کرتا رہا۔ "زمیندار نے بقایا مالگذاری کے لیے اپنے مخالفوں کو زچ کرنے کے لیے ان کو گرفتار کرانے کے واسطے اپنی طاقت و اقتدار سے کام لیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالت میں جھوٹے مقدمات دائر کر کے ڈگری کی تعمیل میں ان کو گرفتار کرا دیا۔"[1] اس اثنا میں اور اضلاع میں تحریک ترقی کرتی رہی اور زیادہ دلیر و جنگ جو بھی ہوتی گئی۔ ۱۸۲۶ء میں سرحد پر سید احمدؒ کی فتوحات نے تحریک کے شرکا کو ایک نئی طاقت اور حوصلہ بخشا اور ان کی دلیری میں نیا اضافہ ہوا۔ بے نتیجہ اور تکلیف دہ عدالتی کارروائیوں کے سلسلہ لامتناہی نے ان کے صبر کا پیالہ لبریز کر دیا اور اب وہ بلا واسطہ اور براہ راست کارروائی پر تل گئے۔

نرکل بڑیا کا گاؤں ان سرکشوں کا صدر مقام تھا اور بانس کے حصار سے محصور تھا۔

---

[1] کلکتہ ریویو ج ۱۱ ص ۱۷۷ - ۱۷۹

ایک شخص معزالدین لبسواس کے گھر میں غلہ اور اسلحہ کا ذخیرہ جمع کیا گیا۔ اُس زمانے میں تیتومیر کی علاقہ پنجاب کے ایک نووارد فقیر مسکین شاہ سے ملاقات ہوئی، کہا جاتا تھا کہ اس نے خروج پر برانگیختہ کیا۔

پورنا گاؤں پر حملہ

ان مسلح سرکشوں کا رُخ سب سے پہلے پورنا کے زمیندار کی طرف ہوا جس نے ان کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ اکتوبر ۱۸۳۱ء میں اس گاؤں پر حملہ کر کے لوٹ لیا گیا۔ انہوں نے ایک دیسی عیسائی مسمیٰ اسمتھ پر بھی حملہ کیا جو ادھر سے گزر رہا تھا اور اُن مسلمانوں کے ساتھ بھی بدسلوکی کی جو ان کی جماعت میں شریک نہ تھے، اور کمپنی کی حکومت کے اختتام کا کھلم کھلا اعلان کر دیا۔ اور بھی فرقہ وارانہ حرکات کا ارتکاب کیا۔

فرائضیوں کا خروج

بہرحال او کینلی نے ان سرکشوں کے عام رویہ اور ان کی جماعت کی تنظیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام کسی طے شدہ مقصد کے ماتحت سوچ سمجھ کر کیا گیا۔ یہ غنڈے ایک قسم کی عسکری ترتیب و تنظیم کے پابند تھے اور غلام معصوم کے زیر کمان صفوں میں مارچ کرتے تھے"[1]

اس کے بعد وہ متصل ضلع ندیا کی طرف بڑھے اور دوسرے گاؤں پر بھی حملے کیے۔

بھڈریا (یا بگوریہ ؟) میں نیل کے کارخانے کے ایک کارپرداز پایرن نے کلکتہ جا کر اپنے آقا کو اوائل نومبر میں ان فسادات کی اطلاع دی اور زور دیا کہ اگر جبری انسدادی کارروائی نہ کی جائے گی تو حکومت ایک سخت خطرے میں مبتلا ہو جائے گی"[2]

اس کے آقا اسٹورم نے باراسیٹ کے مجسٹریٹ اور لفٹنٹ گورنر کے سامنے اسے پیش کیا۔ مگر حکومت اپنی معمولی تنگ نگاہی سے کوئی قدم اٹھانے میں متامل تھی (اسی اثنا میں

---

[1] ایضاً

[2] ایضاً

ندیا اور براسیٹ کے مجسٹریٹوں کی متصل رپورٹیں فسادات کے جاری رہنے کی، کلکتہ میں پہنچتی رہیں۔

انگریزی دستہ کی شکست

چنانچہ ۱۴ر نومبر ۱۸۳۱ء کو باگنڈی کے سالٹ ایجنسی (نمک کوٹھی) کو بھیج دیا گیا اور ایجنسی کے ایک عہدہ دار الیگزینڈر کو ہدایت کی گئی کہ دستے کے ساتھ نرکل بڑیا چلا جائے۔ وہ بسیرہاٹ کے داروغہ اور کچھ برق اندازوں اور ایک سو سپاہ کا ایک دستہ ساتھ لے کر روانہ ہوا۔ فسادیوں کی تعداد چھ سو تھی اور یہ غلام معصوم کے زیر کمان تھے جو گھوڑے پر سوار تھا۔ ان فسادیوں کی حربی صلاحیت کو نظر تحقیر سے دیکھتا ہوا الیگزینڈر سے مڈبھیڑ کے لیے آگے بڑھا مگر اس کا دستہ پورے کا پورا تباہ ہو گیا۔ کلکتہ کے محافظ دستے کا جمعدار، دس سپاہی اور تیرہ برق انداز مارے گئے۔ بسیرہاٹ کا داروغہ اور کلنگا تھانے کا جمعدار زخمی ہوئے اور قید کر لیے گئے۔ خود الیگزینڈر کا فسادیوں نے ننگی تلواریں لیے پیچھا کیا اور وہ جان لے کر بھاگا اور بڑی مشکل سے جانبر ہوا۔ اس شکست سے پوری ایجنسی میں کامل دہشت پھیل گئی۔ خزانے فوراً کشتی پر رکھ کر سندربن کی راہ سے الیگزینڈر کی ذمہ داری میں کلکتہ بھیج دیے گئے۔

اس اثنا میں ضلع ندیا میں دوسرے کارخانوں پر حملے کر دیے گئے اور پولیس نے صورت حال کا مقابلہ کرنے سے اپنی معذوری کا اعلان کر دیا۔ مجسٹریٹ نے فسادات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تمام ممکن پولیس کی طاقت اکٹھی کی اور کارخانہ رودرا پور کے اینڈریوز کے ساتھ تین سو سپاہی لے کر کشتیوں پر اچھّا مٹی کو چلا گیا۔ بھاڈریا (رگوریہ؟) کے کارخانے پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ اس پر حملہ ہو چکا تھا۔ اور اس کا سارا مال لٹ چکا تھا۔ پایرن (کارپرداز کارخانہ نیل) نے فسادیوں کے خلاف حکام کو جو اطلاع دی تھی، یہ لوٹ مار اسی کا انتقام یا سزا تھی۔[1]

ان کو نرکل بڑیا میں الیگزینڈر کے دستے کی شکست کی خبر بھی ملی۔ اس لیے کچھ دیر مفسدوں

---

[1] گورنمنٹ بنگال جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ۔ او سی۔ نمبر ۵ مورخہ ۳ر اپریل ۱۸۳۲ء

کے خلاف اقدام کرنے میں متامل رہے مگر آخر کار وہ آگے بڑھے۔ یورپی صاحبان ہاتھیوں پر اور پیچھے پیچھے برق انداز۔ یوں وہ نرکل بڑیا میں وارد ہوئے، جہاں ایک ہزار مضبوط فسادی تیتو میر کے ماتحت باقاعدہ صفوں میں تیار نظر آئے۔ سرکاری دستے نے دُور اندیشی کو بہادری کا بڑا حصہ سمجھ کر مراجعت کا فیصلہ کر لیا۔ مگر پیٹھ پھیرتے ہی ان پر حملہ شروع ہو گیا۔ معمولی جھڑپ کے بعد جس میں چند برق انداز مارے گئے دستہ اپنی کشتیوں کی طرف واپس دوڑا اور اپنی حفاظت میں کچھ بندوقیں چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ مگر کشتیوں تک پہنچ جانے کے بعد بھی ان کا تعاقب کیا گیا۔ یورپی کشتیاں دوسرے کنارے پر چھوڑ کر اپنے ہاتھیوں کی طرف دوڑے جو ایک میل دُور کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے مولنا تھ کارخانے کی طرف مراجعت کی جو کوئی چھبیس میل دُور تھا۔ ایک ہاتھی، کئی کشتیاں اور دوسرے ساز و سامان فسادیوں کے ہاتھ لگے۔ اس کے بعد وہ ہوبلی کارخانہ پر حملہ کرنے چلے۔ اس کے مینجر کو گرفتار کر لیا اور تیتو میر کے سامنے لائے جس نے کامل اور غیر مشروط تسلیم و رضا کا مطالبہ کیا۔ وہ ہوشیاری سے راضی ہو گیا اور آئندہ انہیں کو حاکم ہندوستان[1] مان کر نیل کے بیج لگانے کو تیار ہو گیا۔ اس وقت تک متاثرہ اضلاع میں ملکی حکام کامل طور پر شکست کھا چکے اور مفلوج ہو چکے تھے۔ کچھ دنوں کے لیے متعلقہ اضلاع میں فسادی ہی برسرِ اقتدار رہے۔

غلام معصوم کی شکست و خاتمہ

اس درمیان میں الیگزینڈر اپنی بپتا سنانے کلکتہ آیا۔ اب حکام کی آنکھوں میں حالت کی خطرناکی نظر آئی اور فوری اقدامات کیے۔ ایک فوج جس میں دیسی پیدل فوج کی دس رجمنٹیں شامل تھیں، گھوڑے سوار توپخانہ، کچھ توپوں اور کچھ محافظ سپاہ، ہدایت کی گئی کہ بارا سٹیٹ میں الیگزینڈر سے جا ملیں۔ اور یہ سب مل کر ۲۹ نومبر ۱۸۳۱ء نرکل بڑیا پہنچے۔ فوج بانس کے حصار کی طرف بڑھی اور ایک زبردست دلیرانہ مدافعت کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جو عام لڑائی ہوئی اس میں فسادیوں کا قائد تیتو میر لڑتا ہوا گر گیا۔ اُن کا کمانڈر غلام معصوم

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۵۱ صفحہ ۱۸۳

اور اس کے ۳۵۰ آدمی اسیر ہوئے۔ علی پور میں ان کا مقدمہ چلا۔ غلام معصوم کو سزائے موت اور باقی کو مختلف میعادوں کی قید کا حکم دیا گیا۔[1]

فرائضیوں کی سرفروشی پر اظہار تعجب

بارا سیٹ کے خروج کی مختصر مگر ہنگامہ خیز کہانی یوں تمام ہوئی۔ گورنمنٹ نے مقامی مجسٹریٹ کولون کی رپورٹ پر اتنے ہی اظہار رائے پر اکتفا کی: "یہ ہنگامہ نتیجہ تھا ایسے حالات کا جن کا اثر ملک کے ایک بہت مختصر حصے تک محدود تھا اور قطعی مقامی تھا۔" پھر بھی اس نے باغیوں کی بیباکانہ سرفروشی پر تعجب کا اظہار کیا۔ اوکنیلی (جسٹس) اپنے متذکرہ بالا مقالے میں حکومت کے اس تنگ نظرانہ پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "اب بھی چالیس سال کی مدت گزرنے کے بعد کوئی آدمی اس ہنگامے کی تاریخ پڑھ کر حکومت کی بے بسی پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ۱۸۲۲ء میں سید احمدؒ نے ہندوستان کے غیر مسلم حکمرانوں کے خلاف بلا روک ٹوک جہاد کی تبلیغ کی تھی۔ آدمیوں اور روپیوں کی کثیر تعداد و مقدار بنگال سے اُس (سید احمدؒ) کو کھلم کھلا مہیا ہوتی رہی۔ خفیہ رکھنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ حکومت کو پنجاب میں اُس کی (سید احمدؒ کی) فتوحات کی پوری واقفیت ہو گی۔ پھر بھی اس کے پیرو اپنی طاقت پر اعتماد کر کے کلکتہ سے صرف تیس میل پر کھلم کھلا بغاوت کر بیٹھے تو یہ شورش ناقابل تشریح ظاہر کی گئی اور باغیوں کو معصوم اور کسی منصوبہ بندی کے ناقابل بتایا گیا۔[2]

اخبارات نے بھی اس بغاوت کی نوعیت پر حکومت کے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ بلکہ برعکس اس جماعت (مجاہدین) کے خطرناک امکانات پر اندیشہ کا اظہار کیا۔

---

[1] ایضاً ص ۱۸۴

[2] ایضاً

فرائضی و وہابی تحریک پر اوکینلی کی رائے

اس مسئلہ پر اوکینلی نے اخبار ہند پیٹریوٹ مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۷۰ء سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے۔ اخبار کا بیان ہے:۔

"فرائضی اور وہابی جیسی جماعتیں اگر خود ایسی عظیم تحریک کے چلانے کی طاقت نہ رکھتی ہوں تو اتنا تو کرسکتی ہیں کہ تمام بے چینیوں اور منافرتوں کے عناصر کو جمع کردیں جن کی تعداد موجودہ کم عقل گو فیاض اور شاندار حکومت میں بہت زیادہ ہوجاسکتی ہے۔ فرائضی اگرچہ بنگال کا ایک طبقہ ہے، کہا جاتا ہے کہ باہر کے کسی وسیع ریاست کے لوگ ہیں.... بنگال میں پچاسوں گاؤں ہیں مگر حکومت اور پبلک ان کے نظام، ان کی سیاست اور مذہب سے بالکل بے خبر ہے یہ بے خبری بڑی غفلت کی نشان دہی کرتی ہے۔"

فرائضی تحریک اور بار اسیٹٹ کے خروج کو غلطی سے دو جدا جدا واقعات سمجھ لیا گیا ہے ان کو عام وہابی تحریک کے زیادہ کشادہ پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اگرچہ فرائضی جماعت وہابی تحریک سے پہلے وجود میں آئی اور وہابی تحریک کے بہت سے بنیادی اجزا اس میں موجود تھے یہ رفتہ رفتہ وہابی تحریک میں جذب ہوگئی۔ اور اس کی تبلیغ اشاعت کے لیے خصوصاً بنگال میں راستہ بنادیا۔ یہ واقعہ قابل غور اور معنی خیز ہے کہ بار اسیٹٹ کے خروج اور بنگال میں عنایت علی کے پہلے تبلیغی دورے کا زمانہ ایک ہی ہے۔[1]

فرائضی خروج کی اصل وجہ

اس نظریہ کے متعلق کہ یہ خروج خالصتہً فرقہ وارانہ (یعنی مذہبی) تھا کچھ توضیح کی ضرورت ہے۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ اس واقعہ کا صرف ایک ذکر جو ہم تک پہنچا ہے وہ متعلقہ حکام کے اُس وقت کے چند خطوط اور رجسٹس، اوکینلی کے ایک مقالہ[2] پر مبنی ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ ہمیں

---

[1] آگے تفصیل آتی ہے۔

[2] THE SEPOY MUTINY AND REVOLT OF 1857 S.M.R صفحہ ۳۷-۳۸

دستیاب نہیں - بہر حال انہیں ذرائع سے کچھ واقعات فراہم کیے جا سکتے ہیں - اس تحریک کا اصل اہم پہلو یعنی یورپی مزارعین سے اس کی آویزش مورخوں کی نظر سے اوجھل ہے - یا اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی - یہ فتنہ جتنے رقبوں پر پھیلے ہوئے تھے ان میں اضلاع ندیا اور بار اسٹیٹ کے حصے ہیں جو نیل کے کارخانوں سے بھرے ہوئے ہیں اور باگنڈی کی سالٹ ایجنسی (نمک کی کوٹھی) سے دور نہیں[1] مقامی کسانوں پر ان نیل کے مزارعین کے مظالم سے انیسویں صدی کی اقتصادی تاریخ کے طالب علموں کو واقف ہونا چاہیے - یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ ان باغیوں کے خلاف پہلی کوشش خود انہیں مزارعین نے انجام دی تھیں انہیں کے مسلسل اصرار سے حکام نے باغیوں کے خلاف قدم اٹھائے ان کی عرضداشتیں ہی اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ خروج نیل کے کاشتکاروں کے خلاف تھا - اور اسی طبقے کے مفاد پر اس کی زد پڑتی تھی - جیسا کہ ان واقعات کے متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہے - نیل کے مزارعین کی فوج کے ساتھ جو پہلی جنگ ہوئی تھی اس میں اسے شکست ہوئی تھی اور ان کی ناکامی کے بعد باقاعدہ سرکاری فوج بھیجی گئی تھی جس نے کام ختم کر دیا - کمیٹی کے قانون کے التوا کا اعلان ایک دوسرا پر معنی واقعہ ہے جو قابل غور ہے - یہ واقعات تحریک کے مقاصد سے میل نہیں کھاتے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ سرتاسر صرف ہندوؤں کے خلاف تھے۔

یہ خروج در اصل ناجائز استحصال کرنے والے ڈھیٹ اور بے رحم نیل کاروں اور زمینداروں کے ایک نوزائیدہ طبقے کی لوٹ کھسوٹ کے شکار (مظلوم کاشتکاروں کی جد وجہد تھا - ان زمینداروں کو بندوبست دوامی کے بخشے ہوئے حقوق ملکیت کی رو سے یہ اختیار حاصل تھا کہ کاشتکاروں کے ساتھ بے دھڑک جو سلوک چاہیں کریں - خود کلوین مجسٹریٹ نے ان کے خروج پر اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ زمینداروں کو جو اختیارات حاصل ہیں ان سے کام لے کر اپنی رعایا میں ایک نمائشی بکری کھڑی کر کے جس بہانے

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۵۱ صفحہ ۱۸۰

سے چاہیں جو فیصلہ نافذ کر دیں[1]۔"

ڈاکٹر چودھری نے ہندوستان میں مختلف تحریکات مخالف برطانیہ کی نوعیت پر اپنے پر از معلومات مقالہ میں فرائضیوں کے متعلق نہایت صحیح تبصرہ کیا ہے کہ یہ" وہابی[2] سماجی اور اقتصادی اعتبار سے مجبور کاشتکاروں کے طرف دار تھے جن کو انھوں نے اونچے طبقوں[3] کے مظالم سے بچانے میں مدد دی۔"

اس سلسلے میں ایک اور بات خاص طور پر قابل غور ہے۔ یہ خروج انگریزوں کے ماتحت نوکری اور انگریزی عدالتوں میں جانے سے انکار کر کے عوام میں عدم تعاون کا احساس بیدار کرنے کی کوشش بھی تھی۔ یہ معنی خیز ابتدا تھی ایک اصول کی جس کی بنیاد پر ہندوستان کی آئندہ تحریکِ آزادی کی ایک عالی شان عمارت کھڑی کرنا تھی۔

---

[1] گورنمنٹ آف بنگال جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ او۔سی۔ نمبر ۵ مورخہ ۳ راپریل ۱۸۳۳ء

[2] انھوں نے یہاں وہابی کا لفظ وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے جس میں فرائضی بھی داخل ہیں۔

[3] ایس بی چودھری ص ۵۰

باب ۴

ولایت علی و عنایت علی

(۱) ولایت علی اور عنایت علی کے کردار اور جدوجہد

وہابی تحریک کی تاریخ کم سے کم ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۸ء تک بہت زیادہ حد تک خاندان صادق پور پٹنہ سٹی کے ولایت علی و عنایت علی کی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس مشن کی ترقی و سربلندی کے لیے ان کے بے نفسانہ جوش اور تحریک کی خدمت میں ان کی طرح طرح کی قربانیوں کی سر ولیم ہنٹر نے بھی کھلے دل سے تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "ان تھک مبلغوں کی حیثیت سے اپنی ذات سے بے پروا، بے داغ زندگی، انگریز کفار کے قلع قمع کرنے پر وقف اور رنگروٹ مہیا کرنے کے لیے ایک باقاعدہ نظام قائم کرنے میں قابل تعریف ماہر کے لحاظ سے یہ پٹنہ کے طلبہ اس جماعت کے مثالی نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا زیادہ تر حصہ عیب سے پاک تھا، اور اپنے ہزاروں ہموطنوں کو ایک صاف زندگی اور اللہ تعالیٰ کے زیادہ سچے اور پاک تخیل پر اُبھار دینا اُنہیں کا حصہ تھا"[۱]

ولایت علی کے ابتدائی حالات

یہ دونوں صادقپور پٹنہ سٹی کے فتح علی کے فرزند تھے۔ بڑے بیٹے ولایت علی ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں پیدا ہوئے ان کا قد اوسط، رنگ سانولا اور تن و توش بھاری تھا۔ ڈاڑھی رکھتے تھے بھنویں جڑی ہوئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر وہ لکھنؤ بھیج دیے گئے جہاں رنگ محل[۲] کے عالم اشرف علی سے تعلیم حاصل کی۔ یہیں وہ سید احمدؒ سے ملے اور

---

[۱] آور انڈین مسلمان ص ۶۸ [۲] یہ ایک مشہور اسلامی تعلیم گاہ تھی۔

بیعت کی، اس کے بعد انھوں نے اپنے افراد خاندان کو بھی سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر آمادہ کیا۔ جب سید احمد رحمتہ اللہ علیہ پٹنہ سے رخصت ہوئے تو یہ بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔

ولایت علی کی بیوہ سے شادی

ولایت علی کی پہلی شادی پندرہ سال کی عمر میں بی بی امیرن دختر منقصود علی ساکن قصبہ لبنا بچھٹولی ضلع آرہ سے ہوئی۔ وہ لاولد وفات پا گئیں۔ ولایت علی نے دوسری شادی اپنے حیدر آباد دکن کے قیام میں ایک مقامی امیر مرزا وحید بیگ کی بیٹی سے کی۔ اس شادی سے ان کے کئی اولاد ہوئی۔ ان میں ایک عبداللہ تھے۔ جو مشہور جنگ امبیلہ میں وہابیوں کے سردار تھے۔ پھر نکاح بیوگان کی سنت کو جاری کرنے کے لیے انھوں نے الہٰی بخش کی بیوہ دختر سے بھی شادی کی۔ یہ مقامی مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں اور اعلیٰ سماجی رتبہ والوں میں نکاح بیوگان کی پہلی مثال تھی۔ اس وقت اس شادی نے بڑی سنسنی پھیلادی۔ مگر انھوں نے اپنے عقیدے کی پختگی کا جرأت سے مظاہرہ کر دیا۔

عنایت علی کے ابتدائی حالات

چھوٹے بھائی عنایت علی ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کا قد بھی اوسط اور رنگ گورا تھا۔ داڑھی رکھتے تھے اور مضبوط اعصاب اور خوبصورت ڈیل ڈول اور پرکشش شخصیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ بعد میں وہ شہر پٹنہ کے ایک ممتاز رئیس اور تفسیر کے عظیم استاد سید محمد مسافر کے شاگرد ہوئے۔

ان کی پہلی شادی سید محمد مسافر کی دختر آمنہ سے ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد پندرہ سال تک جب کہ وہ زیادہ تر بہار اور بنگال میں تبلیغی دورے میں مصروف تھے کوئی شادی نہیں کی۔ الہٰی بخش کے فرزند اکبر علی کی وفات کے بعد ولایت علی نے عنایت علی کی شادی اکبر علی کی بیوہ اور محمد حسین کی دختر بی بی شریفن سے کر دی، جو اپنے شوہر (عنایت علی) کے ساتھ جسور میں مفیض الدین کے گھر میں رہتیں اور ہمیشہ شوہر کے تبلیغی دوروں میں ان کے ساتھ رہتیں۔ مفیض الدین نے بھی اپنے خاندان کے اور افراد کے

ساتھ سید احمدؒ سے بیعت کی تھی اور سرحد پر اُن سے جا ملے۔

عنایت علی کی زندگی اور جدوجہد اُس جوش اور جرأت کے لیے نمایاں ہے جس کا انھوں نے اس تحریک کے مقصد کے لیے ثبوت دیا۔ وہ دو دُور افتادہ مقامات شمالی و مغربی سرحد اور مشرقی بنگال میں بیک وقت کام کرتے تھے۔ اوّل الذکر میں جہاد کرنے اور جنگ کی نگرانی کرنے میں اور آخر الذکر میں تبلیغ کرنے اور نئے رنگروٹ بھرتی کرنے میں مصروف رہے۔

ولایت علی اور عنایت علی کی مراجعت ہند

سرحد پر کچھ دن قیام کے بعد سید احمدؒ نے دونوں بھائیوں کو تبلیغ اور انتظامی کام کے لیے ہندوستان میں تعینات کر دیا۔ بدقسمتی سے ہم ان کے ہندوستان کو مراجعت کی صحیح تاریخ سے واقف نہیں۔ سید احمدؒ نے پٹنہ کے قائدین کے نام اپنے ایک مکتوب میں علی برادران کے ہندوستان میں متعین کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اُس وقت سے لے کر ۱۸۳۹ء میں عنایت علی کے سرحد جانے تک دونوں بھائی مشرقی اور جنوبی ہند کے اکثر حصوں میں تنظیمی اور تعمیری کاموں میں مصروف رہے۔

دونوں بھائی اوّل اوّل سید احمدؒ کی رفاقت سے جُدا ہوئے اور سرحد سے چلے آنے پر دل سے راضی نہ تھے مگر سید احمدؒ نے یہ کہہ کر ان کو آمادہ کر لیا کہ وہ ان کو بیج کی طرح باہر بکھیر رہے ہیں۔ ان کی یہ پیش گوئی لفظ بہ لفظ صادق آئی، اور بعد کے سالوں میں ان کی مساعی بار آور ہوئیں۔ وہ ہندوستان سے آدمیوں اور روپے کی ڈاک چوکی کے ایسے نظام کی تکمیل کے لیے ماہر معمار ثابت ہوئے جو حیرت ناک مہارت کے ساتھ آنکھوں میں خاک جھونکنے میں عرصہ دراز تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ ان کے کارناموں کے دو اہم ذرائع معلومات سوانح احمدی اور تذکرہ صادقہ ہیں۔ آخر الذکر میں ولایت علی کے جو حالات مذکور ہیں وہ زیادہ تر اول الذکر کے بیانات پر مبنی ہیں جو ایک عام قسم کا مجمل تذکرہ ہے۔ اس میں ترتیب زمانی بہت کم ہے۔ مثلاً ولایت علی کے اپنے والد کے انتقال کی (۱۸۳۱ء) میں اخبر سنتے ہی پٹنہ واپس آتے ہی ان کے مشاغل کے سلسلہ

میں صاحب سوانح نے سید عباس اور زین العابدین کی آمد کا ذکر کیا ہے جو مبارز الدولہ کی سازش کے بعد حیدر آباد سے نکل بھاگے حالانکہ یہ واقعہ بہت بعد ۱۸۳۹ء کا ہے مگر ۱۸۳۱ء کے واقعات کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

ہند میں تبلیغی و تنظیمی سرگرمیاں

اس زمانے میں علی برادران کی جد و جہد خالصۃً تبلیغی تھی۔ وہ مقصد کو آگے بڑھانے والے بے غرض اور جوشیلے کارکن تھے۔ اپنی افتاد طبع اور تقاضائے حالات سے یہ دونوں بھائی اپنی کارروائیوں کی کوئی یادداشت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے اس پہلو پر ان کے متعلق وہابیوں کی دستاویزات یا گورنمنٹ کی تحریرات سے ہمیں بہت کم اطلاعات دستیاب ہوئی ہیں۔ سرکاری تحریرات کا ذکر اس وقت کرتے ہیں جب ان کی باغیانہ کارروائیوں کی طرف حکومت کی توجہ منعطف کرانا ہوتی ہے۔ مگر یہ کارروائیاں بعد کی ہیں جو ۱۸۴۰ء سے ظہور میں آئیں اور اسی کے بعد سے ہمیں زیادہ مکمل حالات ملتے ہیں۔

سید احمدؒ نے ولایت علی کو سید کرامۃ اللہ اور عبد القادر بہاری کے ساتھ بمبئی اور دکن میں کام کرنے کے لیے متعین کیا۔ بمبئی میں انھوں نے محمد علی رامپوری کو اپنی جگہ دے دی جو مدراس چلے گئے۔ وہ ابھی دکن ہی میں تھے کہ بالاکوٹ کی تباہی کی المناک خبر پہنچی۔ قریب قریب اسی وقت ان کے والد فتح علی بھی پٹنہ میں وفات پا گئے۔ اس لیے وہ مدھیا پردیش (صوبہ متوسط) کے راستے سے پٹنہ چلے گئے۔ عنایت علی باپ کے مرض کی خبر سن کر پہلے ہی پٹنہ آ چکے تھے۔

پٹنہ میں وہابی تحریک کی تنظیم نو

پٹنہ پہنچ کر ولایت علی نے تحریک کی تنظیم نو اپنے ہاتھ میں لی۔ بہت سے لوگوں نے ولایت علی کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ انھوں نے مقامی مسجد تموہیاں کو جو پٹنہ میں وہابیوں کا ایک اہم مرکز تھی محمد حسین کے ذمہ کیا اور اضلاع مظفر پور، در بھنگہ اور چھپرہ میں بھی تحریک کی ذمہ داری انہیں کو سونپی اور شہر کی ایک اور مسجد فخر الدولہ میں نماز جمعہ دوبارہ

---

[1] یہ مسجد تھانہ خواجہ کلاں (پٹنہ سٹی) سے تھوڑی دور مشرق میں واقع ہے۔

جاری کی۔ ان کے گھر میں بھی مجلسیں ہوتیں جہاں سادہ اور آسان زبان میں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی اور دینی و سیاسی مسائل پر وعظ ہوتے۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ احکام الٰہی کو آپ سمجھ لیں۔ قرآن مجید کو براہ راست خود سمجھنے اور درمیانی علماء سے جن کے پھیلائے ہوئے رسم و رواج کے خلاف یہ تحریک شروع کی گئی تھی، آزاد اور بے نیاز ہو جانے پر زور دیا جاتا تھا۔ ان مجلسوں میں عورتیں بچے اور ان پڑھ بھی شریک ہوتے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمۂ قرآن اور قطب الدین دہلوی کا ترجمہ مشکوٰۃ دہلی سے منگوا کر حاضرین مجلس میں ان کے نسخے کثیر تعداد میں تقسیم کیے جاتے۔

ولایت علی دوروں پر بھی نکلتے۔ اکثر اوقات کسی خاص جگہ پر کئی کئی مہینے اقامت کر لیتے اور کسی ایک آدمی کو منتخب کر کے اُس کو ہم خیال بنانے اور تربیت دینے پر تمام تر توجہ صرف کرتے اور مقامی تنظیم اُس کے سپرد کر دیتے۔ ان دوروں میں ان کو ہر شعبۂ زندگی کے آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا، کسانوں سے کھیتوں میں اور جولاہوں سے ان کے کرگھوں پر۔ انھوں نے بہار شریف کا دورہ بھی کیا جو ایک بڑا صوفیانہ مرکز تھا اور وہاں بھی اپنے پیغام کی اشاعت کی کوشش کی۔

عنایت علی کا دورۂ بنگال

عنایت علی نے شمالی مغربی سرحد سے لوٹنے کے بعد بنگال کے مشرقی اضلاع کے بے شمار گاؤں میں بڑے وسیع پیمانے پر تبلیغی دورے کیے۔ اُس زمانہ کی پولیس کی رپورٹوں سے بھی ان کے کاموں کی مفصل اور مستند اطلاعات دستیاب ہیں[1]۔ مارچ ۱۸۴۳ء میں ہی زیریں صوبوں کے

---

[1] حکومت بنگال۔ محکمہ عدلیہ، فائل نمبر ۲۱۔ ۲۴ مورخہ ۲۹ مئی ۱۸۴۳ء۔ ان دستاویزات پر جو اطلاعات مبنی ہیں وہ پہلی بار شائع کی جا رہی ہیں۔ کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء میں، او کینیلی کے مقالات کی بنا پر مبہم طور پر اتنا معلوم تھا کہ عنایت علی اُس وقت مشرقی بنگال میں اپنا کام کر رہے تھے۔ مگر اب تک ان ابتدائی ذرائع معلومات سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ خود وہابی ذرائع بھی عنایت علی کی کارروائیوں کے اس پہلو پر زیادہ معلومات بہم نہیں پہنچاتے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حکومت کو مسلمان "ملاؤں" کے ایک جتھے کی موجودگی کی رپورٹ[1] دی تھی جو بارا سیٹ جیسور، پٹنہ اور راجشاہی وغیرہ اضلاع کے چکر لگاتے پھرتے، سکھوں اور "حکومت کے حلیفوں کے خلاف جہاد کا وعظ کرتے" اس غرض سے رنگروٹ اور روپے فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس گروہ کا سردار ایک پٹنہ کا باشندہ عنایت علی نامی ہے۔ رپورٹ میں مزید یہ بھی درج ہے کہ رنگروٹ حاصل کرنے میں ان کو زیادہ کامیابی تو نہ ہوئی مگر روپے کی تحصیل زیادہ کامیابی سے جاری ہے۔"

عنایت علی کے متعلق سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ

اسی افسر نے بعد میں ایک اور رپورٹ ملاوں کے دوسرے سربراہوں کے متعلق ارسال کی تھی جس میں ان کی تبلیغ کے اغراض و مقاصد اور عوام میں ان کی تبلیغ کو بے اثر کرنے کی مساعی کی اطلاع دی تھی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا[2] کہ عنایت علی کے علاوہ کرامت علی[3] اور زینودین (زین العابدین) حیدر آبادی بھی اضلاع مذکورہ میں کام کر رہے ہیں۔ رنگروٹوں کے لیے ان کی اپیل کا خیر مقدم حوصلہ افزا ہوا۔ انھوں نے جنگی پور کے پاس ضلع مرشد آباد کے ایک گاؤں نارائن پور کو تاکا ہے جہاں یہ لوگ سرحد کی طرف روانہ ہونے سے پہلے جمع ہوتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ اطلاع بھی دی کہ مشرقی اضلاع کی مسلمان آبادی زیادہ تر "فرائضی یعنی وہابیوں پر مشتمل" "یہ لوگ باہم نہایت متحد، جوشیلے مذہبی، ایک خاص سردار

---

[1] ڈبلو ڈیمپیر سپرنٹنڈنٹ پولیس صوبہ زیریں کا مراسلہ بنام ایف جے ہیلیڈے سیکریٹری حکومت بنگال محکمہ عدالت نمبر ۱۸۰۵ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۴۳ء۔ [2] ایضاً مراسلہ نمبر ۸۸۱ مورخہ ۵ اپریل ۱۸۴۳ء۔

[3] جونپور کے متوطن تھے۔ ۱۸۰۰ء - ۱۸۳۳ء۔ ابتدائے عمر ۱۸ سال میں سید احمد کی بیعت کی۔ بنگال میں متعین ہوئے اور بڑے پیمانے پر تبلیغی کام کرتے رہے۔

کے ماتحت ، ہماری سرکار کے دشمن ہیں اور ان پر نہایت مستعدی سے کڑی نظر رکھنا ہے ان صوبوں میں اگر کسی شورش کا خطرہ ہے تو اسی گروہ کے مذہبی جنون کی برانگیختی سے ہے۔[۱]

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مزید لکھا کہ متعلقہ اضلاع کے مجسٹریٹ بالخصوص مرشد آباد کے مجسٹریٹ ان لوگوں کے اجتماع اور ان میں ایسی احمقانہ تبلیغات پر کڑی نظر رکھنے کے اقدامات کر رہے ہیں۔ اگر کسی جبر و تشدد کی ضرورت دیکھی گئی تو" ان کو مرعوب کرنے کے لیے فوراً طاقت استعمال کی جائے گی۔"

ایک اور خط میں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ رپورٹ بھی کی ہے کہ" عنایت علی کچھ عرصہ سے بنگال کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اپنے متبعین سے روپیہ جمع کر رہے ہیں اور میرے علم میں جہاد اور سید احمدؒ کے ظہورِ ثانی کے عقیدوں کو امداد کے حصول کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ بہرکیف وہ اس حصہ ملک کو چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے ہیں۔" ایک اور مراسلہ میں حکومت کو رپورٹ ملی کہ میں نے مجسٹریٹ بھاگل پور کو لکھ کر یہ دریافت کیا ہے کہ پتہ لگائیں آیا کوئی گروہ ان کے ضلع سے گزر کر شمالی مغربی سرحد کی طرف جا رہا ہے۔ مجسٹریٹ کے جواب سے معلوم ہوا کہ اضلاع بارا سٹیٹ ، جیسور ، میمن سنگھ اور راجشاہی کے کوئی آٹھ نو سو آدمی مختلف گروہوں میں مکہ کی طرف جا رہے ہیں۔

انگریزی حکومت کی پولیس کو ہدایات

حکومت نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی ان تمام رپورٹوں کے

---

[۱] سپرنٹنڈنٹ پولیس نے وہابی اور فرائضی تحریکوں کے نمایاں پہلوؤں اور نظریوں میں تشابہ دکھا کر اپنی گہری نظر کا ثبوت دیا ہے۔ یہ فرائضیوں کی ڈالی ہوئی داغ بیل تھی جس نے بعد میں بنگال میں وہابیوں کا تعمیر کا کام آسان کر دیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بعد کے ایک مراسلہ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۸۴۳ء میں کرامت علی اور عنایت علی کے درمیان احکام عبادات کے فرق سے دونوں کے متبعین کے فرق کی نشان دہی بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ" کرامت علی کے متبعین عنایت علی کے ہم خیال نہیں جن کا اثر میرے زیرِ ملاحظہ مذکورہ اضلاع میں زیادہ قوی ہے۔"

جامع جواب میں وعظ و تبلیغ کو زیادہ اہمیت نہ دینے کا اظہار کرتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ سربراہوں کو بالخصوص اور عوام کو بالعموم ترغیب و ترہیب پر مشتمل ایک محتاط ہدایت نامہ جاری کرے کہ اگر کوئی ایسا بے ہودہ فعل یا نقض امن کی حرکت صدور میں آئے جس میں وہ یا ان کے متبعین آلودہ ہوں تو وہ ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔ مختلف اضلاع کے مجسٹریٹ اپنے اپنے ضلعوں میں ایسی ہی کارروائی کریں اور مناسب موقعوں پر بلووں اور شورشوں کے نتیجے سے صحیح وقت پر متنبہ کر دیں۔ ان کو یہ فہمائش بھی کی گئی کہ وہ اپنے اضلاع میں ایسی کارروائیوں کی ہفتہ وار رپورٹیں بھیجتے رہیں اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ہدایت کی گئی کہ ایسے مقامات کا ملاحظہ کرتا رہے جن پر شک و شبہہ واضح ہو۔ عوام الناس کو بھی کسی غیر معمولی اجتماع سے متنبہ کر دیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی کہ اس معاملہ کی تحقیقات کے نتیجوں سے وقتاً فوقتاً حکومت کو مطلع کرتا رہے[1]

بنگال میں عنایت علی کی حکمت عملی

اس زمانے میں بنگال میں عنایت علی کا سب سے بڑا کام دیہاتیوں میں بلدیاتی اور اجتماعی روح کا نشو و ارتقاء، حکومت کی سول نافرمانی اور حکومت کے بعض انتظامی نظاموں بالخصوص عدالتوں کے خلاف ہڑتال کی پالیسی چلانا تھا۔

عنایت علی بنگال میں جو وہابی مشنری بھیجتے تھے اوکینلی ان کی تعلیم کے ایک بہت اہم پہلو پر زور دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "جو لوگ اس ملک سے ہجرت کر کے جہاد میں شریک ہونے سے مجبور ہوتے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ مجہول مقاومت کریں۔ اور اپنے کافر حاکموں سے تمام تعلقات منقطع کر لیں تاکہ حکومت کے اندر حکومت کے بالکل خلاف ایک طاقت قائم کر لیں۔ کافروں اور ان کی عدالتوں سے جو سود کی ڈگری دیتی ہیں، اجتناب کرنا چاہیئے۔

---

[1] یہ طرز فکر اس سے پہلے بھی اور مواقع پر جیسے حیدر آباد سازش کے موقع پر حکومت کے طرز عمل کے مطابق ہے مگر یہ ان کامل اور واضح ہدایات سے متضاد ہے جو حکومت نے اس خطرے کے خلاف انتناعی اقدامات کے متعلق نافذ کیے شاید یہ ماتحت حکام کے سامنے ایک جرأت مندانہ عزم کی نمائش تھی۔

اور بھائی بھائی کے درمیان شکایات کا فیصلہ مقامی سردار کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔"[1]

اس جدید متحدہ معاشرے کا مرکز گاؤں کی مسجد تھا۔ مسجد کے پیش امام کے ذمہ مذہبی خدمات کے انجام دینے کے علاوہ مقتدیوں کے درمیان عدالتی مقدمات کا فیصلہ بھی کر دیا گیا۔ امت کو اپنے تصفیے سرکاری عدالتوں میں لے جانے سے ممانعت کر دی گئی اور اسے آمادہ کیا گیا کہ ان کا تصفیہ اپنی ہی پنچایتوں میں کر لیا کرے۔ بعض اہم مقام کو جہاں بڑی مسجد ہوتی بڑے عدالتی ادارے کے طور پر منتخب کر لیا جاتا۔ جس کا رقبہ دس میل تک محیط ہوتا۔ وہاں کوئی بہتر تعلیم یافتہ پیش امام مقرر کیا جاتا جسے عدالتی اور دوسرے معاملات میں جن میں اعلیٰ صلاح و مشورہ کی ضرورت ہوتی اپیل سننے کا اختیار بھی ہوتا۔ مقامی چندہ کی تحصیل کا مرکز بھی مسجد ہی ہوتی۔ آگے چل کر ظاہر ہوگا کہ وہابیوں کا یہ نظام بیشتر کے فرائض دستور کا مرہون منت تھا۔ یہ زیادہ تر عنایت علی کی کامیاب تبلیغی کارروائی ہی کا نتیجہ تھا کہ بعد کے مراحل میں سرحد پر جنگ جاری رکھنے کے لیے بنگال سب سے آگے تھا۔

ولایت علی کا دورۂ بنگال

اس زمانے میں خود ولایت علی بنگال کے دورے پر روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے زین العابدین اور عباس حیدر آباد سے پٹنہ آئے، اور ولایت علی نے تحریک کی تنظیم کے لیے ان کو خلیفہ بنا کر اڑیسہ اور الہ آباد میں تعینات کیا۔ انہوں نے بدیع الزماں کو کلکتہ کا مقامی خلیفہ متعین کیا اور وہاں مصری گنج کی مسجد ان کے ذمہ کی۔ اس کے بعد وہ سفر حج کے عزم سے بمبئی گئے جہاں وہ دو مہینے ٹھہرے اور عنایت علی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ حج ادا کر کے انہوں نے یمن، نجد، یاسر، اور مسقط کا سفر کیا۔ اس سفر میں وہ مشہور عالم قاضی شوکانی سے ملے۔ ان سے فن تفسیر کی سند حاصل کی اور ان کی بہت سی تصانیف ہندوستان لائے۔ دو سال کے بعد وہ ہندوستان لوٹے۔ بنگال کے کئی اضلاع کے دورے کیے اور اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ پٹنہ واپس آئے۔ اس طرح ان کے کارناموں کا ایک حصہ تمام ہوا جو زیادہ تر ایک مستقل اور مضبوط اندرونی

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۵۱، ۱۸۷۰ء، ص ۳۹۳

تنظیم پر مشتمل تھا۔

سکھوں کے مقبوضات کی انگریزوں کو منتقلی

ان دونوں کے کارناموں کا دوسرا اور زیادہ عملی حصہ رنجیت سنگھ کی موت کے فوراً بعد سرحد پر شروع ہونے والا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی موت اور اس کے بعد پنجاب میں عام خانہ جنگیاں جو پہلی انگریز سکھ جنگ کا باعث بنیں سرحد پر علی برادران کی کارروائیوں کا پس منظر بنیں۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کے معاہدے کی رو سے سکھوں نے جالندھر دوآب انگریزوں کے حوالہ کیا اور ۱۵۰۰ ملین (ڈیڑھ کروڑ روپے) کا تاوان نقد ادا کرنے پر راضی ہو گئے۔ خزانے میں اتنی رقم موجود نہ تھی اس لیے دریائے سندھ اور بیاس کے درمیان پورا کوہستانی علاقہ مع کشمیر اور بالائی ہزارہ ۱۰ ملین (ایک کروڑ روپے) رقم تاوان کے عوض انگریزوں کی نذر کرنا پڑا۔ باقی رقم معاہدہ کی توثیق کے وقت ادا کرنا تھی۔ گزشتہ رقبے میں سے دریائے راوی کے مغرب اور دریائے سندھ کے مشرق کا علاقہ ہزارہ اور کشمیر کے گورنر گلاب سنگھ کے ہاتھ ساڑھے سات ملین (پچھتر لاکھ) نانک شاہی روپے پر فروخت کرنا پڑا۔ اس رقبے میں بالائی ہزارہ بھی شامل تھا۔ دوسری طرف زیریں ہزارہ کے کئی مقامی پٹھان قبائلی سکھ حکومت کے کامل انضمام اور خاتمہ کا یقین کر کے نیم آزاد سے ہو گئے اور سکھوں کی سرپرستی اور بالادستی سے کامل طور پر آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے لگے۔ بالائی ہزارہ میں بھی گلاب سنگھ سے حاصل کیے ہوئے علاقے پر کوئی موثر قابو نہ رکھتا تھا۔ وہ وہاں تک کشمیر پر مکمل قبضہ کیے بغیر پہنچ بھی نہ سکتا تھا۔ مگر امام الدین گورنر کشمیر نے لاہور سے ایک خفیہ ہدایت پر کشمیر پر گلاب سنگھ کو قبضہ دینے سے انکار کر دیا[1]۔ چنانچہ عملی طور پر کشمیر اور بالائی ہزارہ دونوں قبضے سے باہر تھے اور بے چینی اور بغاوت سے بھرے ہوئے تھے۔ دونوں جنگوں میں سکھوں کی مخالفت کے مرکز بن گئے۔ ان مرکزوں کی قیادت بالائی ہزارہ میں عنایت علی کے اور زیریں ہزارہ میں اکبر شاہ

---

[1] جے ڈی کنہگھام۔ تاریخ سکھ۔ کلکتہ ۱۹۰۴ء تتمہ ص ۱۷-۲۵

کے ہاتھوں میں تھی۔

نئے حاصل کردہ علاقوں میں اقتصادی اور انتظامی معاملات میں برائے نام امن قائم کرنے کے لیے ایبٹ کو ہزارہ میں متعین کیا گیا۔ ساتھ ہی دربار لاہور کا رزیڈنٹ ہنری لارنس ایک چھوٹا سا دستہ لے کر جموں کی طرف بڑھا وہاں سے اُس نے ہربرٹ ایڈورڈز کو امام الدین کے پاس بھیج دیا۔ اور امام الدین کو ہموار کر کے آمادہ کر لیا گیا کہ کشمیر گلاب سنگھ کے حوالہ کر دے۔

ولایت علی کی روانگی سرحد

اسی تاراج اور بے امنی کے زمانے میں سید ضامن شاہ[1] نے ولایت علی کو لکھ کر دعوت دی کہ آئیں اور سید احمدؒ کے کام کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر ہاتھ میں لے لیں جس کے لیے حالات سازگار ہیں چنانچہ ولایت علی نے اپنے چھوٹے بھائی کو بنگال سے بلا لیا جہاں وہ اُس وقت مصروف تبلیغ تھے۔ عنایت علی کوئی دو ہزار متبعین کی جمعیت کے ساتھ پٹنہ آ گئے۔ حکومت کے شبہ سے بچنے کے لیے پوری جمعیت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹ دی گئی۔ ہر ایک ٹولی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پٹنہ سے کوچ کرتی رہی اور تقریباً پانچ مہینوں میں روانہ ہو گئی روانگی کا یہ سلسلہ جولائی ۱۸۴۶ء میں شروع ہوا مگر خود عنایت علی کچھ بعد نومبر میں روانہ ہوئے اور ۱۸۴۶ء کے اواخر میں سرحد پہنچے۔ جو لوگ ان کے ہمراہ تھے ان میں سُورج گڑھ کے اولاد علی ایک نمایاں شخصیت تھے۔ یہ سید احمدؒ کی شہادت کے وقت اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک سرحد میں تھے مگر کمک کے انتظام کے لیے وہ لوٹ آئے تھے۔

---

[1] ضامن شاہ پسر حسن علی شاہ وادئی کاغان کے سردار وہابیوں کے مستقل حمایتی اور بالاکوٹ اور بالائی ہزارہ پر دوبارہ قبضہ دلانے میں ان کے مددگار تھے۔ ۱۸۷۱ء میں وفات پائی۔ ان کے بھائی نوبت شاہ بھی وہابیوں کے زبردست حامی تھے۔

فتح خاں کی شر انگیزی

سید احمد کی شہادت (۱۸۳۱ء) اور عنایت علی کی روانگی (۱۸۴۴ء) کے درمیانی وقفے کے واقعات کئی انگریزی مصنفوں نے اختصار سے بیان کیے ہیں۔ بیلو کے بیان کے مطابق فتح خاں پنجتاری جو اُس وقت تک وہابیوں کا مددگار تھا اب مخالف ہوگیا تھا۔ اور ستھانہ میں وہابیوں کی مختصر ٹولیوں کو ستا رہا تھا۔ چنانچہ عنایت علی اور مقصود علی آدمیوں اور روپے کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ پٹنہ سے روانہ ہوئے۔ پکھلی میں اولاد علی مل گئے انھوں نے اُس علاقہ پر قبضہ کر لیا اور خراج لگا دیا۔

بالاکوٹ سے سکھوں کا اخراج

اوکینلی کے بیان کے مطابق مولوی قاسم پانی پتی جو نصیر الدین کی سندھ فوج میں تھے کاغان چلے گئے۔ وادی کاغان کے دونوں سردار ضامن شاہ اور اس کے بھائی نوبت شاہ ان کے مرید ہو گئے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف خلفاء کے نام خط لکھ کر ان کو سید احمدؒ کے قریب الوقوع ظہور ثانی کی یاد دلائی اور آنے کی درخواست کی۔ عنایت علی پٹنہ سے آئے اور سکھوں کو بالاکوٹ سے مار بھگایا۔ عنایت علی کے ہمراہ زین العابدین بھی گئے۔ اور نجف خاں کاغانی کی امداد میں جو اپنی مملکت سے محروم کر دیا گیا تھا سکھوں سے ایک جھڑپ میں حصہ بھی لیا۔ اس کے فوراً بعد نجف خاں اور قاسم کے درمیان سید احمدؒ کے ظہور ثانی کے دقیق مسئلہ پر غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ اور قاسم کلکتہ واپس چلے گئے۔ تحریک کے ایک ایسے معتمد متبع کا انحراف اس کے مستقبل پر ایک المناک ضرب تھی، لیکن برادران علی کا استقلال تمام مشکلات پر غالب آگیا اور تھوڑے ہی عرصے میں تحریک سید احمدؒ کے زمانے سے زیادہ نہیں تو اتنی ہی طاقت ور ہو گئی۔

ہزارہ گزیٹیر کے مطابق وہابیوں نے سکھوں کی فوجوں کو جو شنکیاری، بیر کھنڈ، گڑھی حبیب اللہ اور اگرور کے قلعوں میں متعین تھیں شکست دے دی اور ان پر قبضہ کر لیا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ بعض خفیف فرقوں کے سوا یہ سارے متفرق بیانات ایک

دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

رضا کاروں کو تحریک میں شرکت کی دعوت

اس موضوع پر زیادہ معتبر اور اہم تر اطلاع ایک مشترکہ مکتوب[1] مورخہ ۹ رذیقعدہ ۱۲۶۲ھ (۲۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء) سے ملتی ہے۔ جو پٹنہ، جیسور، فرید پور، باراسیٹ، ڈھاکا، کلکتہ، رامپور وغیرہ ہم کے مقتدر اشخاص نے مل کر لکھا تھا۔ غالباً یہ ایک قسم کی عام روداد تھی جو برطانوی ہند میں اس تحریک کے پیروں کے نام سرحد سے بھیجی گئی تھی، اس میں وہاں کے تمام وقائع بیان کیے گئے اور اندرونِ ملک سے رضاکاروں کو دعوت دی گئی تھی کہ آئیں، تحریک میں شریک ہوں اور فتح و نصرت میں جس کا وقت قریب ہے حصہ لیں۔ اسی مضمون کے خط اور مقامات پر اور اشخاص کے نام لکھے گئے ہوں گے۔

افسوس ہے کہ ہمیں اب یہی ایک خط اس موضوع پر دستیاب ہے۔ یہ دسمبر ۱۸۴۵ء سے اکتوبر ۱۸۴۶ء کے مفصل واقعات بتاتا ہے۔

امارت عنایت علی

یہ حالات اس بیان سے شروع ہوتے ہیں کہ عنایت علی ۷ نومبر ۱۸۴۵ء میں، ذالحجہ ۱۲۶۱ء کو مجاہدوں، سرداروں اور علماء کی طرف سے جو وہاں ریاست میں حاضر تھے امیر منتخب ہوئے۔ ضامن شاہ کاغانی نے بھی اپنی اطاعت پیش کی۔ امارت ہاتھ میں لے کر عنایت علی نے سپاہ ہی کی تعیناتی اور اپنے ساز و سامان کی دوبارہ تنظیم شروع کی۔ اس کے کچھ ہی قبل بالاکوٹ پر سکھوں سے لے کر

---

[1] یہ مکتوب پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے مخطوط مکتوبات سید احمدؒ کا آخری حصہ ہے اور صفحات ۲۲۰-۲۹ پر محیط ہے۔ غلام رسول مہر نے بھی اس کا حوالہ دیا اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ ان کو اس کا ایک نسخہ مسعود عالم ندوی مرحوم سے دستیاب ہوا اور انہوں نے اسے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد سے حاصل کیا تھا۔ حیرت تو یہ ہے کہ ندوی مرحوم نے اسے خود اس تحریک پر اپنی مختصر تصنیف میں پورا استعمال نہیں کیا۔ مہر کی کتاب جلد ۴ جزو ثالث کے الواب ۳-۵ اسی دستاویز پر مبنی ہیں۔

قبضہ کیا جا چکا تھا۔ محرم ۱۲۶۲ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) میں گڑھی حبیب اللہ پر اچانک حملہ کیا گیا فتح گڑھ کا محاصرہ کیا گیا اور ایک مہینے میں اسے فتح کر لیا گیا۔ لاہور میں مرکزی حکومت کی کمزوری اور بدنظمی سے ان مضافاتی علاقوں کے قلعوں میں متعین افواج غیر یقینی نازک صورت حال سے دوچار تھیں اور ان میں سے اکثر قلعے چھوڑ کر نکل رہی تھی۔ عنایت علی نے کئی سکھ کمان داروں کو پیغام بھیجا کہ اطاعت قبول کرلیں۔ ان میں سے کچھ نے مصالحتی عبارت میں جواب دیا اور بعض نے مخاصمانہ الفاظ میں۔ مگر تھوڑے عرصے میں پکھلی، دھمتاور[1]، اوریش[2]، تناول اور ہزارہ کے کوئی بائیس قلعے فتح ہوگئے اور اسلحہ اور دوسرے سامانوں کی کثیر مقدار پر قبضہ ہوگیا۔ بہت سے دولت مند ساہوکار گرفتار کر لیے گئے۔

معرکۂ نوشہرہ

اسی درمیان میں ایک سکھ قلعے کی فوج پکھلی پہنچ گئی۔ اس کی آمد نے مقامی قبائل میں کچھ ہلچل مچادی اور وہ وہابیوں کو چھوڑ کر سکھوں سے جا ملے۔ انھوں نے وہابیوں سے جو عشر کی تحصیل کے لیے وہاں گئے تھے طنزاً کہا کہ پہلے سکھ فوج کو شکست تو دے لو۔ عنایت علی نے بے خوف وخطر ایک فوج نوشہرہ بھیج دی جس میں کچھ تنخواہ دار سپاہی تھے اور منشی شجاع الدین کے زیر کمان ساٹھ وہابی تھے اور مولوی مقصود علی دو سو آدمیوں کے ساتھ سلطان حسین کی مدد کے لیے مظفرآباد بھیج دیے گئے۔

سکھ فوج کے ساتھ آویزش اس طرح بیان کی گئی ہے۔ نو سو سکھ سوار اور پانچ ہزار پیادے پہاڑ کی دونوں طرف ڈھال پر جمع تھے پیچھے بارہ ہزار مقامی قبائل تھے جو اپنی معمولی روش کے مطابق بظاہر وہابیوں کے ساتھ مگر واقعی باطن میں سکھوں سے سمجھوتہ کیے ہوئے تھے اور منتظر تھے کہ جیسے ہی ان کی امید کے مطابق وہابیوں کو شکست ہو

---

[1] دھمتور یا دھماتور ایبٹ آباد سے ۵ میل مشرق دور ندی کے داہنے کنارے پر ایک بڑا اور زرخیز گاؤں ہے پہلے اس پورے علاقے کا یہی نام تھا۔ [2] ضلع ہزارہ کا ایک غیر آباد علاقہ یا منگل علاقے کے جنوب میں۔ ایبٹ آباد چھاؤنی اس کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔

ان کو لوٹ لیں۔ ظہر کی نماز کے بعد مڈبھیڑ ہوئی جس کی ابتدا سکھوں کی طرف سے ایک زوردار گولے سے ہوئی۔ وہابیوں کے علمبردار محمد عثمان کے بازو پر ایک گولی لگی۔ جھنڈے کو گرتا دیکھ کر قبائلیوں نے سمجھا کہ وہابیوں کو شکست ہوگئی، مگر اسی علمبردار نے جھنڈا اونچا کر دیا۔ وہابی ہر طرف سے پل پڑے اور روہیلوں نے منظم ہو کر حملہ کر دیا۔ سکھوں کے قدم اکھڑ گئے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ وہابیوں نے جوش سے ان کا تعاقب کیا۔ مقامی قبائلیوں نے ان کے ایک لاکھ روپے سے زائد کے ذخیرے لوٹ لیے۔ بارش کا موسم تھا، زمین میں کیچڑ ہو رہی تھی اور اونچی اونچی شالی گھاس اگی ہوئی تھی اس لیے سکھوں کے لیے تیزی سے بھاگ جانا آسان نہ تھا۔ مقامی لوگوں نے بے جگری سے ان کا تعاقب کیا۔ وہ وہابیوں کی فتح دیکھ کر سکھوں پر جھپٹے اور ان کے اسلحہ اور سامان لوٹنے کے لیے ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ مغلوب سکھ فوج کے پسپا اور منتشر سپاہیوں کا قتل و غارت تین روز جاری رہا، اگرچہ وہ سب مضبوط تن و توش والے تھے وہ ان لوگوں کے ہاتھوں لٹتے رہے جو جسمانی طاقت میں اُن کے مقابل نہ تھے۔

منافق سرداروں کو معافی

منافق سرداروں میں سے جو سکھوں سے مل گئے تھے نواب[1] خاں تناولی، امدو خاں[2] اور محمد علی گرنداز کو عنایت علی کے سامنے حاضر کیے گئے، انہوں نے بعض وفاداروں مثلاً امیر خاں[3] کی سفارش سے اُن کو معاف کر دیا۔

یہ تصادم جولائی اور ستمبر ۱۸۴۶ء کے درمیان کسی وقت ہوا تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ

---

[1] یہ سربلند خاں کا بیٹا تھا اور شنگیری کا سردار کہلاتا تھا۔

[2] یہ آمب کے پایندہ خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ پایندہ خاں نے اُس کو جاگیر میں پھلیسرا دے رکھا تھا۔

[3] یہ گڑھی حبیب اللہ کا سردار اور حبیب اللہ کا بیٹا تھا۔ جس نے اس گڑھی کو اپنے نام سے منسوب کیا تھا۔ وہ ۱۸۶۸ء میں فوت ہوا۔

تک سکھوں کو جاؤں کے علاقے کی طرف چڑھائی کی ہمت نہ پڑی۔

امارت ولایت علی

ولایت علی ستمبر ۱۸۴۲ء میں پٹنہ سے سرحد آئے۔ ان کے ساتھ احمد اللہ کے تین چھوٹے بھائی یحییٰ علی اور اکبر علی بھی تھے۔ ان کے ساتھ رضاکاروں کی ایک بھاری تعداد تھی اور اسلحہ اور ذخائر کی معتدبہ مقدار اپنے ساتھ لے گئے۔ عنایت علی نے وہابی ریاست کی سرحدی چوکی منی کلی پہ ایک دستہ ان کی پیشوائی کے لیے بھیجا ولایت علی کے اعزاز میں نئی ریاست کے اندر متعدد پڑاؤ پر خیر مقدم کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ ان کے نوشہرہ پہنچنے پر مقامی کمان دار داروغہ ریاست اللہ نکلے اور ایک توپ کی سلامی دی۔ مقصود علی کو عنایت علی نے ایک رسالہ اور پیادہ دستے کے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ بھی نوشہرہ پہنچے اور خیر مقدم میں شریک ہوگئے۔ دوسرا پڑاؤ لیبر کوٹ تھا جہاں ضامن شاہ اور امین خاں محترم مہمان کے استقبال کے لیے بھیجے گئے تھے۔

وہابی ریاست کا دار الخلافہ اسلام گڑھ

خود عنایت علی نے اپنے ذاتی جھنڈے اور روہیلہ فوج کے ایک دستے کے ساتھ ایک منزل آگے بڑھ کر بھائی کا استقبال کیا۔ اتر سیہ کے میدان میں جلسہ ہوا۔ یہ ایک عظیم الشان اور مبارک تقریب تھی۔ سب لوگوں نے اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ منائی۔ اتر سیہ میں دن کا کھانا کھا کر وہ فتح گڑھ کی طرف روانہ ہوئے جس کا نام اسلام گڑھ رکھ دیا گیا تھا اور وہابی ریاست کا دار الخلافہ تھا جہاں مقامی سردار اظہار اطاعت اور ادائے خراج کے لیے جمع ہوتے تھے۔ فوراً ہی عنایت علی نے بلاتامل و توقف ولایت علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جنہوں نے ریاست اور جماعت[1] کی امارت سنبھالی۔ ولایت علی نے اس سلوک کے جواب میں تمام حاضرین کو ہدایت کی کہ عنایت علی کے ساتھ حسب سابق اپنے سرداروں کا سا برتاؤ رکھیں۔

---

[1] یہ عنایت علی کا وہ شریفانہ رویہ تھا جو ایک بے غرضی و بے نفسی کا جوش تھا اور جس میں کسی ذاتی حوصلہ یا ہوا و ہوس کا دخل نہ تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو سرحد آنے کی دعوت

اس مکتوب کے کاتبوں نے آخر میں اپنے ہندوستانی بھائیوں کو بھی دعوت دی کہ "اگرچہ ان لوگوں کی تعداد بھی جو سرحد پر موجود ہیں کافی ہے مگر ان کا دل بھائیوں سے ملنے کو بے قرار ہے۔" ان کو اپنے پرجوش خیر مقدم اور مہمان نوازی کا یقین دلایا گیا۔ ان کو ملازمتوں کا بھی اطمینان دلایا گیا جو بے شک و شبہ کفار کی نوکریوں سے زیادہ بابرکت ہے۔ ساتھ ہی اہل استطاعت سے درخواست کی گئی کہ "جماعت کو مالی امداد بھیجیں۔ رہا امام رسید احمدؒ کے ظہور ثانی کا مسئلہ تو کچھ لوگ اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں اور کچھ نہیں رکھتے۔ اعتقاد رکھنے کے لیے کسی پر کوئی زور نہیں۔ بہرحال امام کا ظہور ثانی جلد وقوع میں آئے یا نہ آئے عنایت علی اور ولایت علی کی امامت (سرداری) تو قائم ہو چکی ہے۔"

مذکورہ بالا مشترک مکتوب میں واقعات کا خلاصہ جو مذکورہ ہے وہ اسی مقام پر تمام ہو جاتا ہے اور مقام جس میں وہابی ریاست کے رقبے اور نظام کا ذکر ہے اس کا خلاصہ آگے بیان ہوگا۔

معرکہ درہ دوب

وہابیوں کی انگریزوں سے کھلم کھلا جھڑپ درہ دوب[1] پر ہوئی جو ولایت علی کی آمد کے فوراً بعد واقع ہوئی۔ سرحد کے فسادزدہ علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے انگریز سرگرمی سے سکھ حکام اور گلاب سنگھ کی مدد کر رہے تھے۔ دربار لاہور کا انگریز ریذیڈنٹ ہنری لارنس اور اس کی ماتحتی میں ایبٹ، ایڈورڈز، ٹیلر وغیرہ جوشیلے جوان افسر درحقیقت ان علاقوں میں انگریزی حکومت کی بنیاد ڈال رہے تھے۔

انگریزوں نے گلاب سنگھ کی مدد کرکے کشمیر پر قابض ہونے کے لیے مناسب سمجھا کہ سکھ فوج کے ساتھ ساتھ دیوان کرم چند کی کمان میں انگریزی فوج کا ایک دستہ بھی

---

[1] دوب گڑھی حبیب اللہ اور مظفرآباد کے درمیان پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مشہور درہ ہے

بھیج دیا جائے جو کشمیر سے لاہور تک راستے میں امن و اطمینان قائم کرتا ہوا کوچ کرے۔ دو انگریز افسر ملسڈ ہین اور وانس ایگینو اس دستے کے ساتھ تعینات کیے گئے۔ طاقت کی اس نمائش کے ساتھ انگریزوں کی عام سیاسی چال بھی حرکت میں آگئی اور بہت سے مقامی قبائلی سردار مع عباس شاہ جھوٹے وعدوں سے دام کر لیے گئے۔

ابھی وہابی مظفر آباد کی طرف سے آنے والی اس فوج کا مقابلہ کرنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ مقامی سردار کے میل سے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ دوسری طرف پکھلی سے بھی ایک سکھ لشکر آ رہا ہے۔ دو طرفہ حملہ کے اس خطرے نے وہابیوں کے بہت سے مقامی پیرووں کو مرعوب کر دیا۔ اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بے یار و مددگار اس رجمنٹوں کی طاقت کے مقابلے میں وہابیوں نے مع برادران علی ایک مختصر محاربہ کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

اس شکست کے بعد کے واقعات کے بارے میں حکام کے درمیان بہت کچھ اختلاف رائے ہے۔ بیلیو کہتا ہے کہ سکھ فوج نے لفٹننٹ ایگینو کے زیر کمان مجاہدوں کو شکست دے کر منتشر کر دیا۔ مقصود علی گرفتار کر لیے گئے اور لاہور بھیج دیے گئے۔ عنایت علی پٹنہ بھاگ گئے۔ اولاد علی چند آدمیوں کے ساتھ ستھانہ جا رہے۔

اوکینلی کا بھی کم و بیش یہی بیان ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ برادرانِ علی ضمانتی مچلکے کے ماتحت پٹنہ بھیج دیے گئے۔ پٹنہ پہنچ کر انھوں نے دس دس ہزار کے مچلکے لکھ کر چار سال تک پٹنہ نہ چھوڑنے کی ضمانت دی۔

سوانح احمدی اور تذکرۂ صادقہ کے مؤلفین ان واقعات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

سکھوں کی انگریزوں سے امداد طلبی

علی برادران گلاب سنگھ کے مقابلے میں کامیابی سے لڑتے رہے تھے اور بہت کچھ کامیاب ہو رہے تھے۔ گلاب سنگھ نے خود میں وہابیوں کے مقابلے کی طاقت نہ پاکر انگریزوں سے مدد طلب کی۔ انگریزوں نے برادران علی کو لکھا کہ متنازعہ علاقہ ہمارے

قبضے میں ہے اس لیے تمہیں جنگ بند کرنا چاہیے۔ اس کے فوراً بعد لمسڈین اور وینس ایگینو گلاب سنگھ کی مدد کو بھیجے گئے۔ انھوں نے وہابیوں کے کچھ مقامی ساتھیوں کو جن میں ضامن شاہ بھی تھا مالی ترغیبوں سے ملالیا۔ اس لیے وہابی کسی ایسی مفاہمت پر مجبور ہو گئے جس کی رُو سے وہ ستھانہ اکبر شاہ کے پاس جا سکیں۔ سوات جانے کے لیے ان کو ایسے علاقوں سے گزرنا تھا جو انگریزوں کے قبضے میں تھے اور جس کے لیے ان کو بہ حفاظت گزرنے کی ضمانت درکار تھی جو لمسڈین اور ایگینو نے لکھ کر دے دی۔ چنانچہ وہابی چل پڑے مگر انگریزی علاقے میں پہنچنے پر ان کو گھیر کر گرفتار کر لیا گیا۔ بحفاظت گزرنے دینے کی تحریری ضمانت اس بہانے سے منسوخ کر دی گئی کہ یہ اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر مقامی ماتحت افسروں کی دی ہوئی ہے۔ روہیلہ اس بدعہدی پر بہت برافروختہ ہو گئے اور لڑنے کو تیار ہو گئے مگر ولایت علی نے تحمل سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ وہابیوں نے مع برادران علی اپنے ہتھیار اور سامانِ جنگ حوالہ کر کے جنگ سے دست برداری قبول کر لی۔ اور لاہور بھیج دیے گئے۔ جہاں کمشنر[1] جان لارنس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی بہادری کی تعریف کی۔ ان کو آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنے ہتھیار اور سامان جنگ فروخت کر دیں، روہیلہ فوج کو علیحدہ کر دیں۔ ہتھیار کی فروخت سے جو رقم وصول ہوئی اسی سے ان کی تنخواہیں ادا کر دی گئیں۔ اس کے بعد وہ پٹنہ واپس بھیج دیے گئے۔ لارنس نے ان کو ایک ضیافت میں مدعو کیا اور ان کی واپسی کے اخراجات کے لیے کچھ روپے دیے۔ پٹنہ پہنچنے پر لوگوں کی ایک کثیر جماعت نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ وہ "مجاہدین سرحد" کی زیارت کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔ کمشنر

---

[1] اس زمانے میں لاہور دربار میں کمشنر نہیں ریذیڈنٹ ہنری لارنس تھا، جان لارنس نہیں۔ دونوں کے ناموں کے پہلے ٹکڑے کے اشتراک کے سبب سے یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے۔

پٹنہ ان کے گھر آیا اور دو دو سو روپے کے ضمانتی مچلکے دو سال تک اچھے چال چلن رکھنے کے لیے تعمیل کرنے کو کہا۔

عبدالرحیم کے بیان پر تنقید

غلام رسول مہر بیان متذکرہ بالا کو کچھ واقعات کی بنا پر رد کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُس زمانے میں نہ تو انگریزوں نے پنجاب کا پورا الحاق کیا تھا، نہ لارنس اس کا چیف کمشنر تھا، نہ سید اکبر کی سوات کے حکمراں کی حیثیت سے تاج پوشی ہوئی تھی، اور نہ ہزارہ کا علاقہ انگریزوں کے زیر حکومت تھا۔ مہر ان بے جوڑ باتوں کی تردید میں بالکل حق بجانب ہیں پھر بھی کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہمیں یہ حقیقت اپنے ذہن میں رکھنا ہے کہ سوانح اور تذکرہ صادقہ دونوں کے مخالفوں کی اصل دلچسپی سید احمدؒ اور ان کے بعض اہم رفقاء کے کارناموں کے عام ذکر سے تھی۔ اس موضوع پر ان کی تحریر نہ ہمہ گیر ہے نہ مفصل اُس زمانے کی عام تاریخ سے ان کی واقفیت محدود تھی۔ کم سے کم عبدالرحیم انگریزی زبان سے ناآشنا تھے۔ جس زمانے میں یہ دونوں حالات قلمبند کیے گئے تھے۔ کمشنر کے عہدے کا وجود تو تھا مگر انھوں نے ریذیڈنٹ اور چیف کمشنر کے عہدوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک دفتری و قانونی فرق[1] کو نظرانداز کر دیا ہوگا۔ علاقہ زیر بحث کے انگریزوں کے قبضے میں نہ ہونے کے متعلق یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۸۴۵ء سے انگریز اس علاقے کے عملاً حاکم تھے۔ اور اس خاص واقعہ میں ساری گفت وشنید انگریز کمان داروں کی وساطت سے ہوتی تھی اس لیے وہابیوں نے سمجھا ہوگا کہ یہ انگریزوں کا مملوکہ ہے۔

---

[1] ۱۸۴۵ء کے معاہدے کی شرائط کے مطابق ایچ ایم لارنس لاہور دربار کا ایجنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۸۴۶ء میں اس عہدے کا نام بدل کر ریذیڈنٹ اور ایجنٹ گورنر جنرل رکھ دیا گیا۔ یہ نام ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء تک برقرار رہا۔ جب کہ یہ نام پھر بدل کر ریذیڈنٹ اور چیف کمشنر رکھ دیا گیا (لاہور پولیٹیکل ڈایری جلد ۳ تمہید)

ایک حالیہ مولف[1] نے کشمیر کی آتش بغاوت کو ٹھنڈا کرنے اور براہ راست فوجی مدد دے کر نام نہاد سکھ دربار اور گلاب سنگھ کا اپنے اپنے علاقوں میں کھویا ہوا اقتدار بحال کرنے میں انگریزوں نے جو زبردست حصہ لیا اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس نے امام الدین سے سکھ علاقہ چھین لینے کے لیے انگریز ایجنٹ کے سکھ فوج کے آگے آگے مارچ کرنے کے عجیب منظر پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔

عبداللہ کا چشم دید بیان عبداللہ کا مندرجہ ذیل بیان بھی بتاتا ہے کہ خود لاٹ صاحب (ہنری لارنس) نے ولایت علی سے کہا تھا کہ ملک پنجاب اب حقیقتاً انگریزوں کی ملک ہے۔

اس کے علاوہ ایگینو کے قول وقرار پر برادران علی کے ہتھیار ڈالنے کی آئندہ توثیق اُس زمانہ کی انگریزی دستاویزات سے بھی ہوتی ہے۔ لاہور پولیٹیکل روزنامچوں میں ایک اندراج[2] مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۴۷ء میں "ہزارہ سے ایک مولوی" کی گرفتاری کے بارے میں جس نے وہاں بغاوت کی قیادت کی تھی اور اس کے لاہور آنے کا ذکر موجود ہے۔ جس مولوی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بین طور پر وہ ولایت علی ہی ہیں۔

تذکرہ صادقہ اور سوانح احمدی کے بیانات کی تصدیق اُس زمانہ کی ایک نادر اور معاصر انگریزی دستاویز سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک شخص عبداللہ نامی پسر جان علی ساکن حاجی پور ضلع مظفر پور کا بیان ہے جو ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو اسسٹنٹ کمشنر راولپنڈی نے لیا تھا۔ عبداللہ پہلے محمد علی رامپوری کا پھر بعد میں ولایت علی کا مرید ہوا جن کے ہمرکاب وہ سرحد گیا۔ وہ خاص طور پر جنگ دوب کا ذکر کرتا ہے جس میں اس نے خود حصہ لیا، اور اس کے بعد کے واقعات کا بھی۔

---

[1] او آر سیٹھی مولف بغاوت کشمیر، بنگال گزشتہ موجودہ جلد ۶۔۲۴ صفحہ ۱۱۲-۱۲۱

[2] لاہور پولیٹیکل ڈائریز جلد ۲ صفحہ ۷ یہ اندراج وہابیوں کے ساتھ وبنس ایگینو کے قول وقرار کے متعلق ہے مگر اس میں کہا گیا ہے کہ اس میں بحفاظت ہندوستان جانے کی ضمانت ہے نہ کہ سنھانہ۔

ایک متنازع واقع پر اس چشم دید شہادت کے پیش نظر اس کے ضروری حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :-

"سکھوں کے فرار کے بعد مظفر آباد میں چھ جنگیں لڑی گئیں۔ تقریباً بارہ سو سکھ پہاڑیوں پر چڑھ گئے جن کا نام دوب ہے۔ ان سکھوں کو انگریزوں نے بھیجا تھا کیونکہ اس زمانہ میں انگریز ہی لاہور پر قابض تھے۔ اس وقت مولوی ولایت علی اور باقی لوگوں کو شکست ہوگئی۔ اور کاغان کے سردار[1] نوبت شاہ، ضامن شاہ اور دوسرے لوگ سکھوں سے جا ملے اور ولایت علی سے صاف صاف کہہ دیا کہ "ہم اب آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔" ایبوٹ اس وقت ہزارہ میں تھا۔ اور اس نے ایک سکھ سردار کو (جس کا نام اس وقت میں بھولتا ہوں) ہدایت کی کہ ہمیں پہاڑ کے نیچے پہنچا دے، ہمیں چھوڑ دینے کا وعدہ کیا اور اس سے یہ بھی کہا کہ ہمیں اپنی نگرانی میں رکھے، اور یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس جو اسلحہ ہیں ان کو فروخت کر دیں تو وہ ان کی قیمت ادا کر دے گا۔

مسٹر ایبوٹ اور ولایت علی کی گفتگو

چنانچہ ہمیں توپوں، زنبوروں اور اونٹوں وغیرہ کی قیمت بارہ ہزار روپے ملی۔ اس وقت ہم چار سو نفر تھے۔ ہم بیرکا دوراہ پہنچے تو مسٹر ایبوٹ ملے۔ وہ بالا کوٹ تک ہمارے ساتھ گئے۔ وہاں انگریزوں کی بارہ رجمنٹیں تھیں اور ہزارہ میں تو سپاہیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہاں مسٹر ایبوٹ نے ولایت علی سے پوچھا "اب تم کدھر جاؤ گے؟" انہوں نے کہا "ستھانہ" اس پر مسٹر ایبوٹ بولے "بہتر ہے کہ تم ہزارہ چلو اور لاٹ[2] صاحب سے ملو، جو وہ حکم دیں وہ کرو۔" اس وقت وہ لوگ

---

[1] مہر (جلد ۲ ص ۲۶۵) نے سوانح اور تذکرہ صادقہ کے ضامن شاہ پر غداری کے الزام کی تردید کی ہے۔ مگر اسی عصر کا یہ بیان ان کے بیانات کی تائید کرتا ہے۔

[2] ایچ۔ ایم۔ لارنس جو لاہور دربار میں ریذیڈنٹ اور گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔

بے بس تھے اور ہزارہ جانے اور قلعہ کے نزدیک کیمپ لگانے پر مجبور تھے۔ چند دن کے بعد لاٹ صاحب نے ولایت علی، عنایت علی، مقصود علی، فیاض علی اور یحییٰ علی کو بلا بھیجا۔ وہ خیمہ میں داخل ہوئے تو ان سے یہ سوال کیے گئے، "کیا تم صادق پور عظیم آباد کے باشندے نہیں؟ کیا تم انگریز کی رعایا نہیں؟ کیا تم گورنمنٹ کو مالگذاری ادا نہیں کرتے؟ تم اس ملک میں کیوں آتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا اپنے دین کی رُو سے ہم کو کافروں سے لڑنا ہے۔ سکھ[1] ہمارے دشمن ہیں اس لیے ہم ان سے لڑنے آئے ہیں۔ لاٹ صاحب نے جواب دیا "یہ ملک تو انگریزوں کا ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا "ہم کابل چلے جائیں گے۔" مگر لاٹ صاحب نے کہا وہ ملک کابل تک یاغستان (آزاد) ہے۔ اگر تم وہاں چلے جاؤ گے تو پھر سازش کرو گے اور انگریزوں سے لڑنے لگو گے، اس لیے میں تم کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تب انہوں نے حکم صادر کیا کہ ہم اپنے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ اس پر ہم لوگ منتشر ہو گئے۔ مولوی ولایت علی، عنایت علی، مقصود علی، اور یحییٰ علی اپنے اپنے گھر عظیم آباد لوٹ گئے اور ایک مچلکے سے وہ پابند کر دیے گئے کہ چار سال تک پٹنہ نہ چھوڑیں۔ میں بھی اپنے گھر حاجی پور چلا گیا وہاں ایک مکان بنایا اور دانا پور میں شادی کر لی۔

ایک ایسے شخص کی طرف سے جس نے ان واقعات میں خود حصہ لیا ہو اس مستند تصدیق کے پیش نظر سوانح اور تذکرہ صادقہ کے بیانات کو تفاصیل میں جزوی اختلافات کے باوجود، مجموعی طور پر صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

ولایت علی و عنایت علی کی مراجعت پٹنہ

برادران علی کے پٹنہ واپس آنے اور سرحد کو

---

[1] یہ ان کے اصل مقصد پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک سہل عذر تھا۔ انگریز خود ان کے اصل مقصد (انگریزوں سے جنگ) سے خوب واقف تھے۔ یہ حقیقت لاٹ صاحب کے جواب سے ظاہر ہے۔

[2] مکتوب ڈی ٹی کر۔ مجسٹریٹ پٹنہ سی بیڈن سیکریٹری حکومت ہند مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۵۲ء۔

ان کی دوبارہ ہجرت کا ذکر پٹنہ کے مجسٹریٹ کے ایک مراسلے[1] میں یوں ہے :-

"برادران علی ۱۸۴۷ء کے اواخر یا ۱۸۴۸ء کے اوائل میں صوبہ سرحد سے ادھر لوٹا دیے گئے تھے تاکہ ان سے ان کے گھروں میں رہنے کے لیے مچلکے اور حکومت کو پریشان نہ کرنے کا مچلکہ لے لیا جائے۔ سوءِ اتفاق سے اس وقت کے مجسٹریٹ مسٹر لوشنگٹن نے نذر زمینی نہیں لی۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد شمالی مغربی سرحد کی طرف واپس چلے گئے۔ لیکن اب ہماری حکومت کے ساتھ کھلم کھلا جنگ میں وہ سوات کے سردار سے جا ملے ہیں اس لیے اچھے چال چلن کی جو ضمانت ان سے لی گئی تھی وہ میرے خیال سے رد ہو گئی۔ اگر گورنمنٹ مناسب سمجھے تو میں ضامنوں کو گرفتار کر سکتا ہوں۔ لیکن ایسا اقدام اس ذلیل اور شریر شہر میں کچھ ہلچل[1] کا باعث ہو سکتا ہے۔ میں گورنمنٹ کے حکم کا منتظر ہوں۔"

ولایت علی و عنایت علی پر پابندی

اوکینیلی[2] کے بیان کے مطابق دس دس ہزار روپے کی چار سال کی ضمانت کے مچلکے کے پابند ہو کر وہ چند مہینے خاموشی سے پٹنہ میں بیٹھے رہے مگر جلد ہی ستھانہ میں باقی ماندہ جماعت کے سردار اولاد علی سے مراسلت شروع کر دی۔ عنایت علی کو ایک بار پھر ان کے پسندیدہ میدانِ عمل مشرقی بنگال میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کی باغیانہ تبلیغ و وعظ نے جلد ہی راج شاہی کے مجسٹریٹ کی توجہ جذب کی۔ اس نے ان کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ یہ الزام بھی ضم تھا کہ عنایت علی جسے پہلے اس ضلع سے اپنی باغیانہ حرکات کے سبب سے خارج کر دیا گیا تھا پھر مجاہدین کی بھرتی کر رہا ہے۔ لیکن بعد کی کارروائی میں راجشاہی کے مجسٹریٹ نے عنایت علی کے باغیانہ منصوبوں کے متعلق اپنی پہلی رائے سے انحراف کیا اور اس

---

[1] شاید نادانستہ یہ دلیل ہے شہر میں عوام میں برادران علی کی ہر دلعزیزی کی۔

[2] کلکتہ ریویو جلد ۵۱ صفحہ ۳۸۱ - ۸۳ (۱۸۷۰ء)

سے پٹنہ کے مجسٹریٹ کو مطلع کر دیا۔ وہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے شکایت پیش کرنے والے سے جواب طلب کیا کہ جھوٹی نالش کے لیے اُس پر مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے۔ لیکن پٹنہ کا مجسٹریٹ عنایت علی کی پہلی کارروائیوں سے زیادہ واقف تھا۔ ان کی بے قصوری پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا اور پھر ایک ہزار کے مچلکے کا پابند کر دیا۔

عنایت علی کی بنگال سے طلبی

ولایت علی نے یہ مدت دوبارہ تنظیم اور تبلیغ کے کام پر صرف کی۔ انہوں نے صوبے کا دورہ کیا اور لیکچر دیے۔ جب نیک چلنی کی ضمانت کی مدت کے اختتام کو چند مہینے باقی رہ گئے تو انہوں نے اپنی تمام جائیداد منقولہ وغیرہ فروخت کر دی اور ستمبر ۱۸۴۹ء کو ہجرت کر گئے۔ اسی اثنا میں ان کو سوات کے سید اکبر شاہ کی طرف سے دعوت کے خطوط ملے۔ عنایت علی اس وقت بنگال میں تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہاں کے معاملات کو ختم کر کے ہجرت کے لیے اپنے بڑے بھائی سے پٹنہ میں آملیں۔ مگر اس کی تعمیل میں ان کو چھ مہینے لگ گئے۔ پٹنہ پہنچ کر انہوں نے اپنی والدہ کو اپنے دوامی ہجرت کے ارادے سے مطلع کیا۔ انہوں نے اُن کو ان کے حصّہ موروثی کے طور پر قصبہ دواب پور ضلع گیا دے دیا جو انہوں نے بیس ہزار روپے پر بیچ دیا۔ اور خاندانی جائیداد[1] میں اپنے باقی حصہ کے متعلق اپنا چکائی اور بے باقی نامہ لکھ دیا۔

---

[1] تذکرہ صادقہ ص ۱۳۷ (اصل الفاظ ہیں "مواضعات اجمالی سے دستبرداری کی ایک تحریر لکھ دی" مگر مولانا ولایت علی کی ایسی تحریر کا ذکر نہیں۔ مولانا ولایت علی یا عنایت علی کسی کی تحریری دستبرداری کا ذکر اس تذکرہ میں قطعاً بے محل اور غیر ضروری بھی ہے چنانچہ پہلا ایڈیشن اس سے پاک ہے۔ افسوس ہے کہ مؤلف کتاب ہذا کو تذکرہ صادقہ کا پہلا ایڈیشن دستیاب نہ ہوا۔ مولوی عبدالرحیم نے ۱۳۴۱ھ میں وفات پائی اور یہ دوسرا ایڈیشن وفات کے چھ سال بعد انہیں کے نام سے غالباً ان کے ورثہ نے شائع کیا جن کا نام درج کتاب نہیں۔ مگر اس میں اتنے الحاقات ہیں اور زبان بھی اتنی بگڑی ہوئی ہے کہ اسے اصل مولف سے منسوب کرنا اس پر ستم ہے۔ اسی طرح اس دوسرے ایڈیشن میں مولانا عنایت علی کے سوانح میں ان کے پوتے محمد یوشع (والد خاکسار) کے متعلق لکھا

(باقی صفحہ آئندہ پر۔ م)

ان کی دوبارہ ہجرت کا ذکر پٹنہ کے مجسٹریٹ کے ایک مراسلے[1] میں یوں ہے :-

"برادران علی ۱۸۴۷ء کے اواخر یا ۱۸۴۸ء کے اوائل میں صوبہ سرحد سے ادھر لوٹا دیے گئے تھے تاکہ ان سے ان کے گھروں میں رہنے کے لیے مچلکے اور حکومت کو پریشان نہ کرنے کا مچلکہ لے لیا جائے۔ سوءِ اتفاق سے اس وقت کے مجسٹریٹ مسٹر لوشنگٹن نے نذر زمینی نہیں لی۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد شمالی مغربی سرحد کی طرف واپس چلے گئے۔ لیکن اب ہماری حکومت کے ساتھ کھلم کھلا جنگ میں وہ سوات کے سردار سے جا ملے ہیں اس لیے اچھے چال چلن کی جو ضمانت ان سے لی گئی تھی وہ میرے خیال سے ردّ ہو گئی۔ اگر گورنمنٹ مناسب سمجھے تو میں ضامنوں کو گرفتار کر سکتا ہوں۔ لیکن ایسا اقدام اس ذلیل اور شریر شہر میں کچھ ہلچل[1] کا باعث ہو سکتا ہے۔ میں گورنمنٹ کے حکم کا منتظر ہوں۔"

ولایت علی و عنایت علی پر پابندی

او کینیلی[2] کے بیان کے مطابق دس دس ہزار روپے کی چار سال کی ضمانت کے مچلکے کے پابند ہو کر وہ چند مہینے خاموشی سے پٹنہ میں بیٹھے رہے مگر جلد ہی ستھانہ میں باقی ماندہ جماعت کے سردار اولاد علی سے مراسلت شروع کر دی۔ عنایت علی کو ایک بار پھر ان کے پسندیدہ میدانِ عمل مشرقی بنگال میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کی باغیانہ تبلیغ و وعظ نے جلد ہی راج شاہی کے مجسٹریٹ کی توجہ جذب کی۔ اس نے ان کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ یہ الزام بھی ضم تھا کہ عنایت علی جسے پہلے اس ضلع سے اپنی باغیانہ حرکات کے سبب سے خارج کر دیا گیا تھا پھر مجاہدین کی بھرتی کر رہا ہے۔ لیکن بعد کی کارروائی میں راجشاہی کے مجسٹریٹ نے عنایت علی کے باغیانہ منصوبوں کے متعلق اپنی پہلی رائے سے انحراف کیا اور اس

---

[1] شاید نادانستہ یہ دلیل ہے شہر میں عوام میں برادران علی کی ہردلعزیزی کی۔
[2] کلکتہ ریویو جلد ۵۱ صفحہ ۳۸۱ - ۸۳ (۱۸۷۰ء)

سے پٹنہ کے مجسٹریٹ کو مطلع کر دیا۔ وہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے شکایت پیش کرنے والے سے جواب طلب کیا کہ جھوٹی نالش کے لیے اُس پر مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے۔ لیکن پٹنہ کا مجسٹریٹ عنایت علی کی پہلی کارروائیوں سے زیادہ واقف تھا۔ ان کی بے قصوری پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا اور پھر ایک ہزار کے مچلکے کا پابند کر دیا۔

عنایت علی کی بنگال سے طلبی

ولایت علی نے یہ مدت دوبارہ تنظیم اور تبلیغ کے کام پر صرف کی۔ انہوں نے صوبے کا دورہ کیا اور لیکچر دیے۔ جب نیک چلنی کی ضمانت کی مدت کے اختتام کو چند مہینے باقی رہ گئے تو انہوں نے اپنی تمام جائیداد منقولہ وغیرہ فروخت کر دی اور ستمبر ۱۸۴۹ء کو ہجرت کر گئے۔ اسی اثنا میں ان کو سوات کے سید اکبر شاہ کی طرف سے دعوت کے خطوط ملے۔ عنایت علی اس وقت بنگال میں تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہاں کے معاملات کو ختم کر کے ہجرت کے لیے اپنے بڑے بھائی سے پٹنہ میں آملیں۔ مگر اس کی تعمیل میں ان کو چھ مہینے لگ گئے۔ پٹنہ پہنچ کر انہوں نے اپنی والدہ کو اپنے دوامی ہجرت کے ارادے سے مطلع کیا۔ انہوں نے اُن کو ان کے حصّہ موروثی کے طور پر قصبہ دواب پور ضلع گیا دے دیا جو انہوں نے بیس ہزار روپے پر بیچ دیا۔ اور خاندانی جائیداد[1] میں اپنے باقی حصہ کے متعلق اپنا چکائی اور بے باقی نامہ لکھ دیا۔

---

[1] تذکرہ صادقہ صہ ۱۳۷ (اصل الفاظ ہیں "مواضعات اجمالی سے دستبرداری کی ایک تحریر لکھ دی" مگر مولانا ولایت علی کی ایسی تحریر کا ذکر نہیں۔ مولانا ولایت علی یا عنایت علی کسی کی تحریری دستبرداری کا ذکر اس تذکرہ میں قطعاً بے محل اور غیر ضروری بھی ہے چنانچہ پہلا ایڈیشن اس سے پاک ہے۔ افسوس ہے کہ مؤلف کتاب ہذا کو تذکرہ صادقہ کا پہلا ایڈیشن دستیاب نہ ہوا۔ مولوی عبدالرحیم نے ۱۳۴۱ھ میں وفات پائی اور یہ دوسرا ایڈیشن وفات کے چھ سال بعد انہیں کے نام سے غالباً ان کے ورثہ نے شائع کیا جن کا نام درج کتاب نہیں۔ مگر اس میں اتنے الحاقات ہیں اور زبان بھی اتنی بگڑی ہوئی ہے کہ اسے اصل مولف سے منسوب کرنا اس پر ستم ہے۔ اسی طرح اس دوسرے ایڈیشن میں مولانا عنایت علی کے سوانح میں ان کے پوتے محمد یوشع (والد خاکسار) کے متعلق لکھا

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اس طرح اُن کو اپنے دنیاوی معاملات نپٹانے میں تین مہینے لگے، اور ولایت علی کے کوئی نو ماہ بعد ۱۸۵۰ء کے وسط میں روانہ ہو گئے۔ لکھنؤ کی سرائے میں ملے اور دونوں ساتھ ساتھ آگے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۷) ہے کہ "مولوی محمد حسن نے مبلغ پچیس روپیہ ماہوار اور صورت گزران پیدا کر کے اپنا ایک مختصر مکان ان کے حوالہ کر دیا ص ۱۳۹" - یہ بھی قطعاً بے محل اور غیر محقق ہے اور پہلے ایڈیشن میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مولانا عنایت علی کے پر پوتے (خاکسار مترجم) کے مختار عام نے ۱۹۰۵ء کے قریب مولوی عبد الرحیم سے اس کی موروثی جائیداد کے حصہ رسدی کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اس کے رد کر دینے پر عدالت دیوانی میں دعوے دائر کر دیا تھا۔ مگر ۱۹۰۸ء میں مولوی عبد الرحیم کے جوان سال جانشین فرزند کا یک بیک انتقال ہو گیا جس سے سارا خاندان متاثر و متالم ہوا۔ فریقین مقدمہ سے دست بردار ہو گئے۔ اور پانچ ہزار روپے پر تصفیہ ہو گیا۔ یعنی مولوی عبد الرحیم نے اصل سے بہت کم سہی محمد مسلم کا حق تسلیم کر لیا۔ اور وہ اتنے ہی پر راضی و قانع ہو گیا۔

مگر انتقال کے بعد ان کے ورثہ نے جو دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس اندیشہ سے کہ کہیں پھر محمد مسلم یا اس کے ورثہ دوبارہ مطالبہ حق رسی کر کے قانونی چارہ جوئی نہ کریں حفظِ ماتقدم اور پیش بندی کے طور پر محمد یوشع کو محروم یا مجوب الارث ثابت کرنے کے لیے ان کی کتاب میں یہ فقرے الحاق کر دیے۔ گو عبد الرحیم نے بھی اپنے تذکرہ کی اشاعت کے بعد اپنے جواب دعوے میں یہ اظہار کیا کہ مولانا عنایت علی اپنی والدہ کی جو صاحب جائیداد موروثہ تھیں۔ زندگی میں وفات پا چکے تھے۔ یعنی مولانا ولایت علی اور فرحت حسین سے پہلے۔ اس لیے وہ مجوب الارث تھے۔ اور یہ تمام تاریخی شہادتوں اور سندوں کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو بیان تحریری مولوی عبد الرحیم در مقدمہ نمبر ۹۱ ۱۹۰۷ء بعدالت سب جج سوم پٹنہ۔ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۹ء اس کے علاوہ اس ایڈیشن میں اتنے بے سند الحاقات یا اضافات ہیں کہ ان کو مولوی عبد الرحیم کی تالیف کہنا صحیح نہیں اور اس کتاب کی تاریخی قدر و قیمت بہت خفیف ہو جاتی ہے) مترجم

بڑھ گئے۔

آغازِ سفر

ولایت علی کے سب سے چھوٹے بھائی فرحت حسین[1] کو تنظیم کی سربراہی کے لیے گھر چھوڑ دیا گیا۔ خاندان کے تین اور ارکان یحییٰ علی، فیاض علی، اور عبداللہ ۲۵۰ مردوں اور عورتوں کے ساتھ بعد میں روانہ ہوئے اور آرہ کے قریب ولایت علی سے مل گئے۔ اس طرح فرحت حسین کے سوا قریب قریب تمام دقبیع ارکان خاندان اس دشوار سفر کو چل پڑے۔ پہلا پڑاؤ پٹنہ سے چند میل مغرب کویلور میں ہوا جہاں ایک مقامی رئیس امام علی نے ان کی تواضع کی۔ آرہ پہنچنے پر چودھری بشیر نے ان کی ضیافت کی۔ دوسرا پڑاؤ غازی پور میں ہوا جہاں محمد فصیح ان کے میزبان ہوئے۔ مرد مسجد میں ٹھہرائے گئے اور مستورات میزبان کے گھر میں۔ اس کے آگے ولایت علی نے دھیرے دھیرے مختلف جگہوں میں ڈیرا کرتے اور لیکچر دیتے ہوئے راستہ طے کیا۔

بہادر شاہ دوم اور ولایت علی کی ملاقات

ایک سال سے زیادہ کے سفر کے بعد آخر وہ دِلّی پہنچے۔ وہاں وہ ایک ایسے گھر میں قیام پذیر ہوئے جو آسیب زدہ کہا جاتا اور خالی رہتا تھا۔ یہ فتح پوری مسجد کے قریب واقع تھا۔ یہ گروہ وہاں کوئی دو مہینے مقیم رہا۔ بقول اوکینلی ولایت علی کے لیکچر عوام کی توجہ کو جذب کر لیتے تھے۔ یہ مجالس وعظ جو جامع مسجد اور دوسری مساجد میں منعقد ہوتی تھیں ان میں حاضر ہونے والے اہم لوگوں میں مشہور شاعر اردو مومن خاں اور بہادر شاہ دوم کی اعلیٰ ترین ملکہ زینت محل کے معلم امام علی بھی ہوتے تھے۔ امام علی اور مومن دونوں نے ان سے بیعت کر لی اور بادشاہ سے ان کے اعمال کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے بھی ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ ان کو شرف باریابی بخشا گیا اور دیوان خاص میں جلسہ قرار پایا۔ ولایت علی ۵، ۷ آدمیوں کے ساتھ پہنچے، زندگی کی ناپائیداری اور اللہ کے احکام سے سرتابی کرنے والوں کے لیے

---

[1] یہ مولوی عبدالرحیم مولف تذکرہ صادقہ کے والد تھے۔

جہنم کی سزا کے موضوع پر وعظ بیان کیا۔ یہ ایک زبردست اور موثر تقریر تھی جو آداب دربار کے منافی تھی۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ بادشاہ کے حضور میں کوئی ناپسندیدہ موضوع نہ چھیڑا جائے۔ تمام سامعین مع بادشاہ نہایت متاثر ہوئے[۱] وعظ کے اختتام پر بادشاہ نے عرض کیا کہ زندگی کی ناپائیداری پر ہم نے بھی کچھ شعر کہے ہیں۔ اس کے جواب میں ولایت علی نے ایک آیت قرآن اس مضمون کی پڑھی کہ تلاوت قرآن میں کسی کو مخل نہ ہونا چاہیے بعد میں بادشاہ کے اشعار ریذیڈنٹ نے پڑھ کر سنائے اور ان لوگوں کو شاہی عمارات کی سیر کرائی۔ اپنی جگہ پر واپس آنے کے بعد ان کی ضیافت کی گئی جس میں پچاس طشت تھے۔ جو بادشاہ کی طرف سے آئے تھے۔ امام علی اور مومن خاں خود کھانا لائے۔

ولایت علی کی دہلی سے روانگی

بادشاہ نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ ماہ رمضان قریب ہے اس لیے یہ جماعت کچھ دنوں اور رک جائے مگر ریذیڈنٹ نے ولایت علی سے ان کے ماضی کے حالات اور مقصد سے متعلق ایسے باریک سوالات کیے تھے جن سے وہ مشتبہ ہو گئے اور بادشاہ سے رخصت ہو کر فوراً

---

[۱] تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۲۶-۲۷ بادشاہ نے تخت سے اتر کر افراد جماعت سے مصافحے کیے اور مزاج پرسی کی/ مہر جلد ۴ صفحہ ۲۷۲ میں بھی اس بیان کی تائید کی ہے۔ آگے چل کر ایک اور سلسلہ سخن میں تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۵۳-۵۴ یہی مذکور ہے کہ ولایت علی کے چھوٹے فرزند محمد حسن :۔ ذبیح جو اس وقت پانچ سال کے تھے اس موقع پر باپ کے ساتھ تھے۔ بادشاہ نے ان کو گلے لگا کر پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ انہوں نے کہا "قرآن" اور ایک آیت تلاوت کی بادشاہ اس ہونہار بروا کے قبل از وقت نشو و نما پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس لڑکے نے بعد میں پٹنہ سٹی میں ایک مدرسہ قائم کیا جو ترقی کر کے محمڈن اینگلو عربک ہایر سکنڈری اسکول ہو گیا اور اب کالج ہے۔

[۲] سوانح صفحہ ۲۲۳

شہر سے نکل گئے، جمنا پار کیا، تیز تیز کوچ کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچے اور کھنّہ کی سرائے میں ٹھہر کر عنایت علی کا انتظار کرنے لگے۔

نومبر ۱۸۵۰ء میں دونوں بھائیوں میں ملاقات ہوئی اور دونوں ایک ساتھ چل پڑے۔

اوکینیلی برادران علی کے ملک کے طول و عرض سے ہوتے ہوئے باطمینان اور بے روک ٹوک انگریزوں سے علانیہ جہاد کے مقصد سے سفر پر تبصرہ کرتے ہوئے حاکم و محکوم کے درمیان وسیع خلیج پر رائے زنی کرتا ہے۔ "کہ کسی بات کی یہاں تک کہ انتہائی خطرناک جماعت کی تحقیق حال سے کتنی لاپروائی برتی جاتی ہے۔ سید احمدؒ کا محاربہ، بار اسٹیٹ کی بغاوت، ہری پور میں مذہبی دیوانوں کی مدافعانہ مقاومت اور بعد میں ہتھیار ڈال دینا، سب یوں بھلا دیے گئے جیسے قصہ ختم ہو گیا ہو۔ حکومت اس وقت بیدار ہوتی ہے جب بعد از وقت وہ دیکھتی ہے کہ پٹنہ کے یہ مولوی پہاڑی قبائلیوں کے دماغوں کو برانگیختہ کرنے کے لیے ستھانہ پہنچ چکے ہیں۔" صرف ایک مقام کھابل پر پولیس نے بے دلی سے مداخلت کی اور چند سامانوں سے لدے ہوئے اونٹ پکڑ لیے گئے۔ ان کو بھی پشاور کے ڈپٹی کمشنر کے حکم سے مالکوں کو واپس کر دیا گیا۔ کوئی شک نہیں کہ ان کے گزشتہ رویہ اور پٹنہ کے مجسٹریٹ کی تحریری رودادوں کے باوجود ولایت علی کا دلّی میں طویل قیام، بادشاہ کے حضور میں باریابی اور ریذیڈنٹ کا انہیں محل کی سیر کرانا ظاہر کرتا ہے کہ وہابیوں سے متعلق حکومت کی پالیسی میں کوئی ہمواری و استقلال نہیں۔"

ولایت علی عنایت علی میں اختلاف رائے

سرحد کے اس دوسرے سفر کے درمیان دونوں بھائیوں میں کچھ اختلاف رائے رونما ہوا۔ بعض مصنّفین نے بے ضرورت اس کو بہت طول دیا اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے یہاں تک کہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ولایت علی اپنے بھائی سے زیادہ انگریزوں کے ساتھ نرم تھے۔

مثلاً اوکینیلی[1] لکھتا ہے کہ "ولایت علی کو حکومت برطانیہ سے وہ کینہ نہ تھا جو ان کے

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۵۱ سنہ ۱۸۷۰ء ص ۳۸۳

بھائی کی خصوصیت تھی۔" اور اس کا سبب اس نے ولایت علی کے وسطی ہند، بمبئی اور سندھ میں طویل سفر ظاہر کیا ہے۔ اس سفر نے ان کو برطانوی حکومت کی طاقت کا بہتر احساس دلایا۔ او کینیلی کے خیال کے مطابق ولایت علی سمجھتے تھے کہ وہابیوں کی طاقت ابھی انگریزوں کے مقابلے کے لیے کافی نہیں۔ اور ناکافی طاقت کے ساتھ ضعیف عزم سے اقدامات کر بیٹھنا ان کی ہمت شکنی کا باعث ہوگا اور انگریزوں کو ہوشیار کر دے گا۔ وہ جب اپنے اصلی مقصد سے متنبہ ہو جائیں گے تو اندرون ہندوستان سے وہابیوں کا سلسلہ مواصلات منقطع کر دیں گے۔ عنایت علی صبر و انتظار کی تاب نہ رکھتے۔ ان کے خیال میں اس صبر و تامل سے ایمان کی کمی ثابت ہوتی ہے وہ زیادہ جذباتی اور تخیّل پرست تھے۔

ولایت علی کا تدبّر

بقول او کینیلی دونوں بھائیوں میں یہ اختلاف اس حد تک بڑھ گیا کہ پوری جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ بنگالیوں نے عنایت علی کا ساتھ دیا جنھوں نے ان میں رہ کر کام کیا تھا، اور باقی ولایت علی کے ہم خیال ہو گئے۔ ولایت علی کی عالی خیالی کی کارروائی سے مزید تلخی رُک گئی۔ وہ بڑھتے ہوئے اختلافات پر نظر کر کے دونوں گروہوں کے سامنے آئے۔ سرداری سے ہاتھ اٹھانے کا ارادہ ظاہر کیا اور دُعا کی کہ "خدا ان کی اس آڑے وقت میں حفاظت کرے اور بھائی بھائی کے درمیان جنگ سے محفوظ رکھے۔" عنایت علی نے اس آرزو پر عمل کیا۔ اور ستھانہ چھوڑ کر منگل تھانہ کو جا رہے ہے۔ یہ واقعہ محرم ۱۲۶۳ھ (اکتوبر نومبر ۱۸۵۱ء) میں ہوا۔

عنایت علی کی مزاجی کیفیت

تذکرہ صادقہ کے مؤلف عنایت علی کی کسی قدر تند مزاجی کا ذکر کرتے اور فرماتے ہیں کہ بوڑھاپے میں یہ تند مزاجی چڑچڑاپن اور غضب ناکی میں منتقل ہو گئی وہ ایک صاف گو کھرے آدمی تھے میدان جنگ اور تبلیغی کاموں دونوں میں تحریک کی خدمات میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھے اُن کی آرزو تھی کہ انگریزوں سے نمٹ لیا جائے اور جب مقامی قبائلی سرداروں کی غداری یا اور اسباب سے ان کی کوششوں

ل صفحہ ۱۳۲-۳۳

میں رخنہ واقع ہوتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔ مزاج کا یہ رجحان بھی دونوں بھائیوں کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے میں کچھ حصہ رکھتا تھا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ یحییٰ علی نے جو اب تک سرحد ہی میں تھے دونوں بھائیوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی[1]۔ فریقین ان سے محبت رکھتے تھے۔ مگر ان کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ وہ ولایت علی کی وفات اور عنایت علی کی جانشینی کے فوراً بعد پٹنہ آگئے اور اپنی گرفتاری تک وہیں رہے۔

اختلاف کا بنیادی سبب

اصل اختلاف راہِ عمل کا تھا نہ کہ مقصد کا۔ وہ واقعہ جس سے اختلاف جلد رونما ہو گیا آمب کے جہاں داد خاں کی مخالفت تھی۔ وہ اور مقامی سرداروں کی طرح انگریزوں سے مل گیا تھا اور ہندوستان سے کاروانوں کے گزرنے میں مزاحم ہوتا تھا۔ عنایت علی اس کے خلاف فوری اقدام کرنا چاہتے تھے۔ مگر بڑے بھائی دوسرے مصالح کو مدنظر رکھ کر مقامی لڑائیوں میں اُلجھنا نہ چاہتے تھے۔

---

[1] یہ اطلاع مولوی عبدالغفار مرحوم کے مملوکہ نسخہ تذکرہ صادقہ ۱۳۲ کے حاشیہ پر درج ہے جو میں نے نوٹ کر لی ہے وہ خاندان کے سب سے کبیر السن رکن تھے۔ ان کے پاس اس موضوع پر کثیر التعداد دستاویزات و مسودات تھے، ان کو زبانی روایات بھی حاصل تھیں جو اب ہمیں دستیاب نہیں۔ اس لحاظ سے ان کے حواشی کافی وزن اور قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ (اولاً بخلاف واقعہ ہے کہ وہ سب سے کبیر السن رکن خاندان تھے۔ ان سے زیادہ کبیر السن حکیم عبدالخبیر جعفری، مولانا احمد اللہ کے پوتے اور سردار جماعت اہلحدیث، صادقپور میں اب تک بقید حیات موجود ہیں۔ ثانیاً تذکرہ صادقہ کا پہلا معتبر ایڈیشن مولانا عنایت علی کی افتاد مزاج کی ان تشریحات سے قطعاً خالی ہے۔ اصل مولف مولوی عبدالرحیم کے سوا جو چشم دید گواہ تھے مولانا عنایت علی سے متعلق سو برس سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد کسی کی روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ جب کہ مولوی عبدالغفار مرحوم کے والد ماجد یا ان کے کسی معاصر بزرگ نے بھی مولوی عنایت علی کا زمانہ نہیں پایا۔ یہ دوسرا ترمیمی ایڈیشن مرحوم ہی کے قیاس مع الفارق و توہمات کا عکس ہے۔ غالباً ان کی نیت پاک تھی مگر طرز استناج و استقرائے ناقص و قیاس آرائی کو کیا کہیے) مترجم

انہیں ان سیدوں کے احساسات کا بھی لحاظ تھا جنہوں نے تحریک میں اتنی مدد کی تھی اور جہانداد خاں سے ان کی قرابت تھی۔

ولایت علی کا انتقال

بظاہر اب معلوم ہوتا ہے کہ ولایت علی کا رویہ زیادہ صحیح تھا وہ بجا طور پر انگریزوں کے بہتر ذرائع وسامان اور اپنے ذرائع کی قلت کا شعور رکھتے تھے۔ اگر وہ ۵۹-۱۸۵۷ء کی شورش کے وقت زندہ ہوتے تو اُن کا طرزِ عمل کیا ہوتا، یہ خیال قدرتاً دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ ناشدنی تھا۔ وہ ۵ نومبر ۱۸۵۲ء کو سرحد کو لوٹنے کے بعد ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت میں انتقال کر گئے اور ستھانہ میں مدفون ہوئے۔

عنایت علی کی وفات

ان کی وفات کے بعد عنایت علی ستھانہ لوٹ آئے اور قائد منتخب کر لیے گئے۔ اگرچہ وہ بڑے بھائی کی مرضی سے منگل تھانہ جا رہے تھے تاہم وہ اب بھی اپنے ہی طریق کار کی صحت پر یقین رکھتے تھے۔ آئندہ چند سالوں میں ان کی کارروائیاں اس خیال کی تصدیق کرتی ہیں۔ انہوں نے فوراً انگریزوں کی چوکیوں پر سرحدی حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور گوریلا طرز جنگ کا آغاز کر کے ان کو زچ کرنے لگے۔ ۵۹-۱۸۵۷ء کی شورش میں بھی سرحدی چوکیوں پر سپاہیوں میں جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھایا اور نارنجی اور شیخ جانا پر حملوں کی تنظیم کی۔ اس زمانے میں ان کی حربی کارگزاریوں پر متصل طور پر علیحدہ باب میں بحث کی گئی ہے۔ عنایت علی کی زندگی کے آخری سال سخت معاشی تنگی اور سیاسی ناکامیوں میں گزرے انہوں نے ۱۸۵۸ء میں چنگلائی میں وفات پائی۔

رفقائے عنایت علی کی مراجعت پٹنہ

عنایت علی کی وفات کے بعد ان کے کچھ رفقاء منتشر ہو گئے اور پٹنہ لوٹ گئے۔ تحریک پر اس حادثہ سے سخت ضرب پڑی اور زوال کا سامنا ہوا۔ ولایت علی کے تینوں بیٹے عبداللہ عبدالرحمٰن اور محمد حسن جن کے تعلقات عنایت علی سے اچھے نہ تھے[1]

---

[1] ببلیو مذکرہ بالا ص ۹۶ (شاید آئندہ وراثت کے جھگڑے کی بنیاد بھی اسی وقت پڑ گئی؟ مترجم)

اُس وقت کے فوراً بعد پٹنہ واپس آ گئے۔ ان کے چچا فرحت حسین پٹنہ میں علیل تھے اور ۱۸۵۸ء میں وفات پا گئے۔ یحییٰ علی بھی پٹنہ لوٹ آئے۔ فیاض علی اگرچہ عنایت علی سے متفق الرائے نہ تھے سرحد پر ہی ٹھہر گئے اور کچھ دن بعد وہیں وفات پا گئے۔

(ب) حیدر آباد میں وہابی سازش

ولایت علی کی دکن میں تبلیغی سرگرمیاں

۱۸۳۹ء کے مقدمہ[1] سازش حیدر آباد جس میں نظام کے بھائی نواب مبارز الدولہ ایک مرکزی شخصیت رکھتے تھے اور اس کی بنا ولایت علی کی کارروائیوں پر تھی، اس لیے یہاں اس مہتم بالشان واقعہ کا تذکرہ مناسب ہو گا۔

ولایت علی کے دکن تعینات کیے جانے کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ حیدر آباد پہنچ کر انہوں نے اپنی مشنری اور تبلیغی کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ کچھ عرصہ کے بعد مبلّغ و واعظ کی حیثیت سے ان کی شہرت مبارز الدولہ تک پہنچی تو انہوں نے اپنے دو علماء زین العابدین اور محمد عباس کو ولایت علی سے ملنے کے لیے متعین کیا۔ ان دونوں علماء نے ولایت علی سے بیعت کر لی اور بعد میں ان کے خلیفے مقرر کیے گئے۔ خود مبارز الدولہ نے بھی بیعت کر لی اور تحریک کے ایک سرگرم کارکن بن گئے۔

یہ سازش جو ولایت علی اور ان کے مقامی رفقاء کی کارروائیوں کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی اس کو وسط ایشیا میں روسیوں کی پیشقدمی کے اُٹھتے ہوئے سیاسی خطرے اور انگریزوں کے نظام کے تمام اختیارات عملاً اپنے ہاتھ میں لے لینے کے اقدام کے پس منظر میں دیکھنا ہو گا۔ حیدر آباد کے ریذیڈنٹ فریزر نے بہت بعد میں حیدر آباد کے متعلق ڈائرکٹروں کی مجلس کے اصل مقصد کو یوں بیان کیا ہے: "حکومت کے نظم و نسق میں اصلاح کا اختیار حاصل کرنے کے لیے

---

[1] اس سازش کی ایک دلچسپ مگر علیحدہ داستان این سی چودھری نے اپنے مقالہ "وہابی سازش حیدر آباد میں ۱۸۳۹-۴۰ء" کے عنوان سے روداد انڈین ہسٹری کانگریس جلد ۱۹ ۱۸۵۶ء میں شائع کی ہے۔

ہمیں صرف ایک چیز کی ضرورت ہے، اور وہ ہے ہز ہائنس (نظام) کی باقاعدہ یقین دہانی کہ آئندہ وہ پبلک معاملات میں مداخلت سے باز رہیں گے۔ ویسے اس اجتناب پر زیادہ تر عمل تو ہوتا رہا ہے لیکن اگر اس قسم کی کوئی یقین دہانی ہو جائے تو تمام وزیروں کو صرف ریذیڈنٹ سے رجوع کرنے پر آمادہ کرنے سے بے انتہا مفید ہوگی۔" دراصل ریاست کے معاملات میں سیاسی جبر و اقتدار کی مزعومہ زیادتی ہی کے خلاف یہ سازش تھی۔

مبارز الدولہ کے خلاف ریذیڈنٹ فریزر کی رپورٹ

انگریزی افواج کی (جو افغانستان میں تھی) غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مبارز الدولہ کے رفقا نے سر اٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ پہلا قدم یوں اٹھایا گیا کہ حیدر آباد اور دکن کے دوسرے مقامات پر جو دیسی پلٹنیں مقیم تھیں ان کو بلا لینے کی کوشش کی گئی۔ اس سازش میں ہندوستان کے حاکموں کی ایک معقول تعداد جس میں نواب کرنول بھی شامل تھے، شریک تھی۔

راجہ ستارہ، جودھپور، اودھے گڑھ۔ بھوپال اور رامپور کے فرماں روا بھی سازش کے ناظموں سے مراسلت کر رہے تھے۔ اول الذکر دونوں حکمراں ذاتی اور سیاسی وجوہ سے انگریزوں سے بیزار تھے۔ ان راجاؤں کے فیصلے میں مختلف اسباب کارفرما تھے، لیکن ہر صورت میں انگریزوں کے خلاف جذبہ ایک مشترک سبب تھا۔ مبارز الدولہ اور ان کے رفقائے کار کی کارروائیوں پر رپورٹ کرتے ہوئے فریزر نے ایک شخص حاجی سید اسماعیل کا بیان بھی منسلک کیا ہے جو مبارز الدولہ کا برطرف کردہ ملازم تھا۔ اس میں مذکور ہے کہ خود مبارز اور ان کے رفقا بہت سخت فوجی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ اس میں مبارز کے اس ارادے کا ذکر بھی ہے کہ وہ نکل کھڑے ہوں، وہابی ساتھیوں کو جمع کریں اور انگریزوں کو قتل کرکے ملک اور حکومت پر خود قبضہ کرلیں۔" ان کے پیر و فقیر وغیرہ کے بھیس میں بہت سے افسروں اور سپاہیوں تک پہنچ جاتے اور سپاہیوں کو وہابیت میں داخل ہونے کے لیے بھکاتے۔

---

[1] ایچ فریزر "ہمارا وفادار حلیف نظام" لندن ۱۸۶۵ء، صفحہ ۲۳۸ [2] مقالہ محولا بالا [1]

ساتھ ہی ساتھ بقرینہ "غالب بغاوت کے لیے" ان ایجنٹوں سے خبروں کا ایک لامتناہی سلسلہ مبارز کے لیے فراہم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے رپورٹ کی کہ رجمنٹ کے تمام سپاہی متحد الخیال ہیں اور سب مبارز کے خروج کے منتظر ہیں تاکہ اُن سے جا ملیں۔ مبارز نے اپنے اقتدار کی تیاری میں دو مہریں بنوا رکھی تھیں جن پر یہ نقش کندہ کروائے تھے "محافظ دین متین، حامی دین و مسلمین" اور "مبارز نائب سید احمد شہید"

ایک اور بیان کے مطابق مبارز نے سندھ میں وہابی جماعت کے قائد نصیر الدین کی طرف سے ایک درخواست کے جواب میں اپنے قاصد عاصف، قاسم اور دوسروں کو سندھ بھیجا تھا کہ وہاں وہابیوں کی عام حالت اور ان لوگوں کی طرف سے سندھ کے امیروں کے رجحان و میلان کی رپورٹ لائیں۔ یہ قاصد جو ولایت علی کے مرید تھے اپنی مفوضہ خدمت اور ان کے مشورہ کے متعلق بذریعہ ڈاک لکھا اور اُن کی اجازت کے بعد بمبئی اور کراچی کے راستہ سے ٹنکاد پور پہنچے جہاں اس وقت نصیر الدین مقیم تھے۔ وہاں سے انھوں نے مطلوبہ رپورٹ بھیجی جس میں اور باتوں کے ساتھ بنگال کی آمد کا ذکر بھی تھا۔

منصوبہ کا انکشاف

شمالی ہند، کابل اور ایران سے صوبہ مدراس میں آنے والوں کے غیر معمولی ہجوم سے شک پیدا ہوا اور اس سے سازش کا انکشاف ہوا، پھر ایک سکھ نے جو شک پر گرفتار تھا سازش کے متعلق اطلاع دی۔ سب سے پہلے نیلور کے مجسٹریٹ اسٹون ہاؤس نے حکومت مدراس کو رپورٹ دی حکومت مدراس نے اسے حکومت ہند کے سیکریٹری کے پاس بھیجتے ہوئے صورت حال کی یوں تلخیص کی کہ :-

"ہندوستان کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد نے وہابیت قبول کر لی ہے۔ ان میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو اپنے عہدے اور مرتبہ سے اپنے ہم مذہبوں پر کافی اثر کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ سرگرمی سے لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے اور کفار کے خلاف جنگ چھیڑنے کے لیے آدمی اور روپے فراہم کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ اور یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ ان کے مقصد کی غائت ہندوستان میں برطانوی طاقت کا انضمام و اختتام ہے اور اس غرض سے دیسی فوج میں سپاہیوں کو اپنا ہم عقیدہ

بنانے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔"

مبارز الدولہ کے بارے میں تحقیقات

فریزر، ریذیڈنٹ اور اس کے اسسٹنٹ مالکوم اور ایک ایرانی مسلمان نے جو دربار نظام میں بمبئی کے تاجروں کا نمایندہ تھا اور بعد میں جس کے لیے اس کی خدمات کے صلے میں دو ہزار روپے کے انعام (اور ایک ہزار اخراجات) کے لیے سفارش کی گئی تھی، مبارز کے خلاف تحقیقات میں حصہ لیا۔ فریزر نے اپنی تحقیقات کے نتیجے میں حکومت ہند کے سیکریٹری کو رپورٹ دی کہ اور باتوں کے ساتھ یہ ثابت ہوگیا کہ مبارز نے صرف اپنے حاکم (نظام) ہی کے خلاف بھی خاص طور پہ مخاصمانہ ارادہ رکھتا تھا، جیسا کہ اس کی اور اس کے ایجنٹوں کی اس غیر معمولی کاوش اور جانفشانی سے ظاہر ہے جو انہوں نے دیسی پیدل فوج خصوصاً سکندر آباد اور ناگپور کی فوجوں کی وفاداری کو متاثر اور برگشتہ کرنے کے لیے کی۔ نیز اس نے مبارز کی سیاسی اور مذہبی جدوجہد کے درمیان فرق پر زور دے کر بتایا کہ عام طور پہ وہابیوں میں بھی یہی فرق ہے۔ اُسے ان کے عام تبلیغی کام اور اپنے فرقہ کی توسیع پہ کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ان کی سیاسی چالبازی دوسری بات ہے۔ جس شکل میں بھی ہو اسے دبانا اور پامال کرنا ناگزیر ہے۔ اس کے خیال میں نظام یہ غلطی کر رہے ہیں کہ اپنے بھائی کی کارروائیوں کو صرف مذہبی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ اس نے مشورہ دیا کہ نظام کو ان کے بھائی کی باغیانہ کارروائیوں کی پوری پوری اطلاع دے دی جائے (اب تک تحقیقات زیادہ تر ریذیڈنٹ کی رائے سے ہو رہی تھی) اور مبارز کو حکومت کے قیدی کی حیثیت سے قلعہ گولکنڈہ میں قید کرنے کے لیے ان کی رضامندی بھی حاصل کر لی جائے۔ لیکن اس نے اس معاملہ میں اپنے یا نظام کے طرز عمل کو عوام میں مشتہر کرنے سے منع کیا۔

مبارز الدولہ کو حبس دوام کی سزا

ایک تحقیقاتی کمیشن نے جس میں برطانوی افسر اور کچھ ہندوستانی بھی تھے مبارز پر مقدمہ کی سماعت کی۔ جون ۱۸۳۹ء میں ایک عدالت بنی اور مسلسل طویل نشستوں کے بعد سماعت اپریل ۱۸۴۰ء میں تمام ہوئی۔ مبارز کو حبس دوام کی سزا دی گئی۔ وہ قلعہ گولکنڈہ میں قید کر

دیے گئے اور ۱۸۵۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے رفقائے کار جن میں زیادہ تر وہابی مولوی تھے مزید تحقیقات تک گرفتار کر رکھے گئے۔ مگر حکومت ہند نے ان واقعات میں کوئی خطرناک علامت نہیں پائی۔ بلکہ اس کے برخلاف لارڈ آکلینڈ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "میں اُن لوگوں میں سے نہیں جن کا یہ گمان ہے کہ ہندوستان میں برطانوی بالادستی کے خلاف نفرت کا کوئی ہندوستان گیر عملی جذبہ موجود ہے۔" ایسے ایسے بظاہر متفرق واقعات کے متعلق عام انگریزی حکام کے طرز فکر کا یہ ایک نمونہ ہے۔ اس نے برطانوی حکومت کے خلاف بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی جس کی یہ علامات تھیں نافہمی ظاہر ہوتی ہے۔ بنگال میں فرائضی شورش کے زمانے میں بھی حکام نے ایسی ہی ذہنیت دکھائی تھی، جس کی حکام کو آگے چل کر بڑی مہنگی قیمت ادا کرنا پڑی۔

(ج) سرحد پر وہابی امارت

برادران علی نے سرحد پر جو ایک آزاد ریاست قائم کی تھی اس کی ایک جامع روداد ہمیں ایک عدیم النظیر خط محولہ بالا سے حاصل ہوئی ہے۔ اس سے مختلف عنوانات کے تحت جیسے حدود اربعہ، فوج کے مختلف عہدوں کی تنخواہوں، اخراج کے لگان وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کی غیر معمولی اہمیت[1] کے پیشِ نظر اس دستاویز کا پورا ترجمہ جو خطِ زیر نظر کا آخری حصہ ہے درج ذیل ہے:۔

وہابی ریاست کا حدود اربعہ

(۱) حدود۔ اسلامی ریاست کی حدود نوشہرہ میں جو ہزارہ کے سکندر پور سے متصل ہے متعین کی گئی تھیں۔ سامانوں کی ایک کثیر مقدار (مشمولہ توپیں)، اونٹ، گھوڑے، خیمے اور دوسرے سامان مومنوں کے ہاتھ آئے۔ ان میں سے معمولی معمولی چیزیں مقامی قبائیلیوں کو دے دی گئیں۔ جب عسکر اسلامی فتحیاب داخل ہوا تمام علاقے جیسے جادون، تناول، نندھیار، بھوگرمنگ، پکھلی، دھتمادر دارس (؟) وغیرہ نے عشر دینا اور ہماری بالادستی قبول کر لی، شروع میں وادی کہنا (بھوگرمنگ) بالائی وزیریں پکھلی اور کنڈطی (؟) کے سرداروں سے خراج کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تو وہ اس کے قبول کرنے پر راضی نہ تھے، بعد میں اپنے آپ کو بے بس پا کر قبول کر لیا۔ اللہ کے فضل سے تمام اطراف سے خراج کی تحصیل جاری ہے۔ لوگوں کو اپنے اپنے حق کے مطابق انعامات، تحائف، معافیاں اور جاگیریں دی جا رہی ہیں۔ فی الحال ایک ہزار کے قریب روہیلا سپاہی بھرتی کیے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اسی طرح دس ہزار سپاہی بھرتی کیے جا رہے ہیں۔ انہیں اس شرط پر زمینیں دی گئی ہیں کہ

---

[1] وہابی حکومت جمہوریہ جو سرحد پر قائم کی گئی اسی کا مختصر حال پہلی بار انگریزی زبان میں شائع کیا جا رہا ہے۔

جنگ کے وقتوں میں فوجی خدمات انجام دیں گے۔ علاوہ بریں اس ملک کا رواج ہے کہ جب کبھی کوئی (قبائلی) سردار جنگ کے لیے کہیں جائے تو ہر گھر سے ایک ایک مسلح آدمی اس کے ساتھ ہو۔ متعینہ پیشہ ور سپاہیوں کو چھوڑ کر ان سب کا شمار تیس ہزار ہے مگر ان میں سے صرف پیشہ ور سپاہ قابل اعتماد اور دلیر ہے[1]

سپاہیوں کی تنخواہیں

(۲) سپاہیوں کی تنخواہیں۔ پیدل سپاہیوں کی تنخواہ چھ سے دس روپے ماہوار، توپچیوں اور حوالداروں کی نوسے بارہ روپے ماہوار، لوہار مستری کی تیس روپے ماہوار۔ یہ معاوضے ان علاقوں کے مروجہ دستور کے مطابق ہیں۔

سرکاری ملازمین

(۳) مختلف عہدہ داروں اور افسران کے نام یہ ہیں۔ داروغہ ریاست اللہ افسر قلعہ مانسہرہ۔ حاجی گدائی رامپوری والیہ کلکٹر مالیانہ مانسہرہ۔ منشی شجاع الدین علاقہ جادون میں بینار منکلی کے تھانہ دار۔ رمضان علی خاں عظیم آبادی ساکن دھنگی، ضلع پٹنہ افسر قلعہ بالاکوٹ۔ منشی غلام علی پٹنہ والا قلعہ مذکورہ بالا کے منشی۔ حاجی نجو عظیم آبادی، قلعہ مذکور کے کلکٹر مالیانہ۔ یحییٰ علی[2] قاضی (بالاکوٹ ؟)، ملک احمد علی ساکن ارکی (قرات مند خیرات علی) رسالدار۔ محمد علی عظیم آبادی جمعدار صدر پھاٹک قلعہ فتح گڑھ۔ حاجی شیر خاں۔ ساکن صاحب گنج جمعدار باڈی گارڈ۔ بہادر خاں ساکن صاحب گنج کلکٹر مالیانہ فتح گڑھ۔ عبداللہ[3] عظیم آبادی فوج کو عسکری تربیت دینے کے لیے وہ ہر روز بعد نماز فجر فوجی قواعد کراتے ہیں۔ سراج الدولہ اسلحہ خانہ اور محکمہ اصطبل کے انچارج ہیں۔ نظیر ریحان الدین ایک طرح کے اسپیشل افسر ہیں جن کے ذمہ نظامت حضوری ہے اور قید خانوں

---

[1] اس خط کی تحریر کے زمانے میں (مولانا یحییٰ علی) صادقپوری تھے تو صادقپور میں ہی مگر یہ بات صاف نہیں، آیا یہ نام بردہ یحییٰ علی وہی تھے۔

[2] ضلع سنتھال پرگنہ (بہار) میں واقع ہے [3] ولایت علی کے بیٹے تھے۔ وہ عنفوان شباب سے فوجی تربیت اور تعمیر کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

محافظ خزانہ، مقصود علی[1] کمانڈر انچیف (سپہ سالار) صوفی معزالدین ذخائر کے اور ناظم فرید پوری غلوں کے نگران۔ اسی طرح متفرق عہدے اور ملازمتیں ہیں۔

عدلیہ : (۴) قوانین فوج داری اور سزائیں۔ حدود اور قصاص شریعت کے مطابق جاری ہیں۔ پانچ وقتوں میں سے کسی وقت کی نماز میں غیر حاضری کی سزا سردار کے لیے ایک روپیہ اور غریب آدمی کے لیے پانچ سیر غلہ۔ اسی طرح نماز جمعہ کا قانون ہے۔ قاطع الطریق (ڈاکو) کو قتل کر دیا جاتا اور دار پہ چڑھایا جاتا ہے تاکہ اور لوگ عبرت حاصل کریں۔ ملا اسد اخونزادہ وادی کنہار میں مفتی اور اخلاق عامہ کے محتسب مقرر کیے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ کئی سو طلبہ تعینات کیے گئے ہیں کہ اندرونی گاؤں میں دورے کر کے دریافت کریں کہ کون نماز پڑھنا نہیں جانتا، ان کو سکھائیں اور لوگوں کو شادی وغمی کے مواقع پر ناجائز رسوم ادا کرنے سے باز رکھیں۔ جو اس کا ارتکاب کریں اُن پر جرمانے لگائیں۔ اور انہیں جرمانوں سے ان طلبہ کے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں محمد حسین آخونزادہ پکھلی کے واعظ[2] مقرر کیے گئے ہیں۔

دربار کی روداد : (۵) دربار کی روداد۔ راجہ سلاطین اور سردار ہمیشہ مولانا (ولایت علی) کے حضور میں حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ داخلہ کے پاس کے بغیر کوئی متنفس، راجہ ہو یا سلطان قلعہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ رسالدار اور جمعدار بلائے جانے پر ایک کانسٹبل کے ساتھ سلامی کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ بیس توپچی ہمیشہ مولانا کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ کوئی شخص سر اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ کشمیر کے صوبہ دار شیخ کمال الدین نے دوستانہ تعلقات کی خواہش ظاہر کی ہے اور خط لے جانے کے لیے دو ہرکارے مقرر کیے ہیں چنانچہ وہ ہر مہینے دو خط بھیج کر محبت اور دوستی کا اظہار کرتا ہے۔ جب شیخ کو نوشہرہ کی فتح کی خبر

---

[1] یہ سورج گڑھ ضلع مونگیر کے تھے۔

[2] مبلغ۔ وہ اکثر پیش امامی بھی کر لیتا ہے۔

ملی تو اُس نے اس خوشخبری لانے کے لیے قاصد کو انعامات دیے اور خوشی منانے کے لیے توپیں داغیں کابل کے (حکمراں) دوست محمد اور محمد اکبر کی طرف سے بھی اظہار دوستی اور آرزوئے اتحاد کے خط وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔ الغرض اسی طرح کشمیر اور پشاور سے لے کر کابل اور قندھار تک سے اس ملک کے خوانین اور سرداروں کے ساتھ اتحاد حاصل ہو گیا ہے۔ یہ سب امام (سید احمد) کی برکت ہے، اگر ایسی کوئی چیز خود امام کے زمانے میں جنگ بالاکوٹ سے پہلے میسر نہ ہوئی تھی۔

خراج

(۹) خراج۔ مالیات کی تفصیلات یہ ہیں:۔ خراج وادی کنہار سے سولہ ہزار، وادی بھوگرہ جنگ سے پانچ ہزار، کاندھی سے سات ہزار، پکھلی سے چھبیس ہزار، سالارس (قبیلہ) سے تین ہزار، حسن زئی سے تیس ہزار، مظفر آباد سے چالیس ہزار، کرنا سے دس ہزار، نن دھیار سے بیس ہزار، علائی سے بیس ہزار، علائی اور مظفر آباد میں ملازموں کے لیے جاگیروں کے علاوہ اور عُشر کا (خراج کے علاوہ) مطالبہ بھی کیا جاتا ہے۔ اور اس کی مجموعی رقم خراج سے کم نہیں ٹھہرتی۔ باقی لوگوں سے صرف خراج طلب کیا جاتا ہے۔ بھوگرہ منگ اور علائی سے تحصیل مکمل ہو گئی، اب پکھلی سے تحصیل تقریباً ایک ہفتہ میں مکمل ہو جائے گی۔ بہت سی جگہوں میں خراج کے تحصیلدار تعینات کر دیے گئے ہیں اور پکھلی کی تحصیل کے اختتام کے بعد انشاءاللہ نن دھیار اور مظفر آباد سے تحصیل شروع ہو گی۔

صدر ریاست کے شان و شکوہ کی وجہ

روداد بالا سے ظاہر ہو جائے گا کہ سرحد پر برادران علی کے زیر حکومت ایک خاصے وسیع علاقے میں ایک آزاد جمہوریہ قائم ہو چکی تھی۔ اس کے پاس ایک بڑی اور طاقتور فوج، پانچ لاکھ روپے سے زائد کی ایک معقول آمدنی اور ملکی افسروں کی ایک جماعت موجود تھی۔

عدالت کی تشریح میں چند الفاظ میں یہاں تبصرہ بے محل نہ ہو گا۔ دربار کا یہ بیان اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب کہ ایک باقاعدہ آزاد ریاست شہریوں اور سپاہیوں کے تمام لوازمات کے ساتھ قائم کی گئی تھی۔ صدر ریاست کو ریاست کی شان قائم رکھنا تھی اور اس کی مناسب و معقول کارکردگی کے لیے، متعدد ضروری آلات نصب کرنا تھے۔ اس

کے علاوہ اگر ریاست کا اُن لوگوں کی نظروں میں جن کے درمیان یہ قائم کی گئی تھی عزت واحترام برقرار رکھنا ضروری تھا تو ظاہری رعب داب کا یہ تیور بھی قائم رکھنا ضروری تھا۔ مقامی جنگ جو لوگ صرف طاقت ہی کی زبان سمجھتے تھے ان مصالح کے علاوہ یہ نظام یہ حقیقت بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہابی قائدین مذہبی دیوانے نہیں بلکہ اپنی تحریک کے سیاسی لوازم و عواقب سے بھی خبردار تھے۔

جدید انتظامی تجربہ کی خامی

ایک جدید طرز کا انتظامی تجربہ یہ تھا کہ گاؤں کے دورے کر کے عوام کے چال چلن پر نظر رکھنے اور ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے قاضیوں کے ماتحت نگراں طالب علموں سے کام لیا جاتا۔ اور ان ملزموں سے جو جرمانے وصول ہوتے انہیں سے ان طلبہ کے اخراجات چلائے جاتے۔ لیکن اس نظم میں ایک عیب یہ تھا کہ ان نگراں طلبہ کے گزارے کے اخراجات اُن جرمانوں کی تحصیل پر موقوف تھے جو وہ عائد کرتے تھے اس لیے ہر ممکن موقع پر وہ جرمانے لگانے پر آمادہ رہ سکتے تھے۔

وہابی ریاست کا نظم و نسق

ریاست کے نظم و نسق میں اسلامی اثرات سے کام لینا بظاہر حکومت آلہیہ جیسی بات نظر آتی ہے۔ لیکن تحریک کی بنیاد کو وہابی ریاست کی نوعیت معین کرنا تھا، خصوصاً اُس زمانے میں جب کہ ہندوستان میں لادینی (سیکولر) حکومت کا تخیل نہ تھا۔ علاوہ بریں وہابیوں کے قبضے میں جو خطہ تھا وہ قریب قریب سارے کا سارا صرف مسلمانوں سے آباد تھا۔ ان کے نظامِ حکومت میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے ساتھ کسی ترجیحی سلوک کا دخل نہ تھا جو حکومت آلہی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ بہر حال اپنی مسلمان رعایا کے عوام الناس میں انہوں نے کچھ ایسے احکام جاری کرنے اور ایسے امتناعات نافذ کرنے کی کوشش ضرور کی جن کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ اس لیے وہابیوں کے متعلق سختی سے کوئی رائے قائم کرنا نہ چاہیے۔ ہر حکمران جماعت جو برسرِ اقتدار ہو جاتی ہے وہ نظام حکومت انہیں اصولوں پر چلانے کی کوشش کرتی ہے جو اپنی نگاہ میں لازمی دیکھتی ہے۔ وہابیوں نے

کچھ سماجی مذہبی اصلاحات کے رائج کرنے میں نہیں بلکہ اُس شدت اور سرعت میں جس کے ساتھ وہ ان کو انجام دینا چاہتے تھے سیاسی دقیقہ رسی اور فہم و ذکا کی قلت کا ثبوت ضرور دیا۔

وہابیوں نے اپنی نئی نئی حاصل کردہ ریاست میں جو نظام رائج کیا وہ ابتدائی نو یافتہ تھا۔ حالات نے اُن کو آتنا دم لینے کی مہلت نہ دی کہ وہ حکومت کا کوئی ہمہ گیر نظام تیار کر سکیں۔ اس چھوٹی سی ریاست کے سر پر اس کے نہایت مختصر وجود کی مدت میں ہر وقت جنگ اور اندرونی بغاوت کے سائے منڈلاتے رہتے۔ زمانہ امن و صلح کے وہ حالات کبھی میسر نہ ہوئے جو کسی معتدل نظام کے نشوونما کی اجازت دیتے۔ ہر بات جنگ کے امکانات پر مشروط تھی۔ اس لیے غیر جن کی حکام کی دو جماعتیں، تحصیلداران مالیات اور عدالتی افسروں کی قائم کی گئیں۔ دوسرے ملکی محکمے جیسے تعلیم و حفظان صحت وغیرہ قائم نہ کیے جا سکے۔ اس تحریک کی تاریخ کے طالب علم کے لیے اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا کہ وقت اور امن کے موجود ہونے کی شرط پر صورت حالات و واقعات پر غور و فکر کرے۔

باب ۵

(۱) وہابی تحریک کی اندرونی تنظیم

وہابی تحریک کے دو اہم پہلو تھے ، سماجی مذہبی اور سیاسی - پہلے پہلو کا تقاضا تھا کچھ سماجی اور مذہبی اصلاحات کی تبلیغ ، اور دوسرے کا دُور دراز کے ملکوں کے لوگوں اور تاجروں اور بساطیوں کے خلاف بنرد آزمائی - ان دونوں ضرورتوں کا تقاضا تھا مبلغوں اور واعظوں کی ایک مخلص جماعت کی تشکیل ، جو تمام چکر لگائیں اور عوام کو مقصد سمجھائیں - جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا اس سلسلہ میں پہلی کوششیں سید احمدؒ اور ان کے رفقائے خاص کی تھیں - لیکن ۱۸۳۶ء میں ان کی ہجرت کے بعد وہ کمزور پڑ گئیں - ان کی شہادت کے بعد تحریک کے تنظیمی پہلو کو برطانوی ہند کے اندر دوبارہ تازہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی - یہی کام تھا جس کے لیے قائدین عظیم آباد نے تحریک کی سب سے بڑی خدمت انجام دی - اب پٹنہ برطانوی ہند میں اس تحریک کا سب سے زیادہ فعال مرکز اور ہنٹر جسے مرکزی پروپیگنڈا کہتا ہے - اس کا صدر مقام بن گیا اور خاتمے تک رہا -

اگرچہ طریق کار اصولاً وہی رہا جو سید احمدؒ کے زمانے میں تھا - یعنی دورے ، تبلیغ بیعت (جہاد) مگر پٹنہ کے قائدین نے تنظیم میں زیادہ ربط و نظم پیدا کیا ، پٹنہ میں ایک منظم و مستحکم تربیتی مرکز قائم کیا اور تمام ملک میں بہت سے ذیلی محاذ اور مرکز بھی قائم کیے اور ہر محاذ پر مقامی واعظین مقرر کیے - یہ مقامی کارکن اپنے اپنے محاذوں میں تبلیغ کرتے ، رسالے تقسیم کرتے ، زکوٰۃ اور دوسری خیراتی رقوم اور چندے تحصیل کرتے اور اُن کو صدر مقام پٹنہ بھیج دیتے رہیں - اس عظیم نظام نے حکومت انگریزی کے ان کا پتا لگانے اور اس قلمرو سے

انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے تمام ذرائع اور طاقت کا مقابلہ کیا۔ چار مستقل عنوانات کے تحت ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے (۱) پٹنہ کی مرکزی تنظیم (۲) دورے کرنے والے مبلغین (۳) اضلاع کے مراکز (۴) رقوم کی تحصیل :۔

(۱) پٹنہ کی مرکزی تنظیم

قافلہ

سب سے پہلے ہم پٹنہ میں وہابی صدر مقام کی اس عمارت کا حال بیان کرتے ہیں جسے خود وہابی اپنی خفیہ زبان میں قافلہ یا بقول ہنٹر باغیوں اور سازشیوں کی کاروان سرائے کہتے تھے۔ ہنٹر نے ان عمارات کی جو بعد میں حکومت کے حکم سے ڈھا کر زمین کے برابر کر دی گئیں اور ان میں جو تعلیم دی جاتی تھی جو تصویر کشی کی ہے وہ محفوظ ہے اور ذیل میں پیش کی جاتی ہے :۔

"پٹنہ کے قدیم شہر کے مسلمان محلہ[1] میں ایک گلی ہے جسے صادقپور کی گلی کہتے ہیں جہاں مسافر بہت چلتے پھرتے ہیں۔ اس گلی کے بائیں ہاتھ پر بربری طرز کی عمارتوں کا ایک مجموعہ ہے جس کے سامنے کافی کشادہ صحن ہیں اور گلی سے کچھ فاصلہ پر پیچھے تک چلے جاتے ہیں۔ ان کے بیرونی حصوں کی شکل ویسی ہی اداس شکستہ و ریختہ نظر آتی ہے جیسی برسات کے بعد اینٹوں پر پلاسٹر کی ہوئی عمارتیں مستقلاً اختیار کر لیتی ہیں اور جو مشرقی شان دار تعمیر کے ہمارے جمے جمائے تصور کی مکروہ ضد پیش کرتی ہیں۔ اس پورے مجموعہ عمارات میں سب سے نمایاں مسجد ہے جس کا اندرون بہت سادہ ہے، جہاں ہر گھڑی نمازیں ہوتی رہتیں اور ہر جمعہ کو خطبہ یا لیکچر دیا جاتا ہے۔ صادق پور کی مسجد میں جمعہ کے یہ خطبے شہر کی دوسری مسجدوں کے خطبوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ پرزور تقریریں ہوتی ہیں جن میں ایمان کے بغیر سارے اعمال کے بے کار ہونے، سامعین کو عظیم روحانی خطرے سے متنبہ کرنے اور روحانی زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ خطبے پیغمبر صلعم کی سادہ عبادتوں کا عام

---

[1] اب اس مقام پر پرانی پٹنہ سٹی میونسپلٹی کے دفاتر کے مکانات اور ان سے متصل ہاٹ واقع ہیں۔

مساجد میں پیچیدہ رسومِ عباداتِ لامتناہی کے سوانگوں ڈھونگوں، اور طرز رکوع و سجود سے مقابلہ کرتے اور اُن لوگوں کے خلاف سخت گوئی کرتے جنہوں نے سُنی سنائی روایتوں کی بنا پر احکام منصوصہ کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ شہر کی دوسری مسجد کے مولوی کوچۂ صادق پور کے واعظوں کی علمی قابلیت اور فصاحت و بلاغت کا اعتراف کرنے پر تو مجبور ہوتے مگر مقدس تبرکات کے منکر کی حیثیت سے ان کو بُرا بھلا کہتے۔" آخر میں یہ بیان آس پاس کی عمارتوں کے ذکر پر تمام ہوتا ہے: "مسجد کے اردگرد پیش امام اور مستورات کے سکونتی مکانات اور صحیح العقیدہ طلبہ کے لیے ایک چھوٹا سا کالج، متقی مسافروں کے لیے ایک مہمان خانہ اور کئی مزار ہیں جن میں وہابی بزرگان دین کی ہڈیاں مدفون ہیں۔"

رنگروٹوں کی تعلیم و تربیت

"ہر شعبۂ زندگی سے رضاکاروں کا مسلسل ریلا اس فرقے کے عقائد کی تعلیم حاصل کرنے اور تبلیغ اور نئے رنگروٹوں کی بھرتی کے صبر آزما۔ کاموں کی تربیت کے لیے صدر مقام میں پہنچتا رہتا۔ رضاکاروں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ ان کو ان کی تعلیمی قابلیت اور ان کے سماجی رتبے کے مطابق کام دیے جاتے تھے۔ چنانچہ زیادہ ہونہار جوانوں کو کالج میں داخل کر لیا جاتا اور اسلامی شریعت اور علم کلام میں تربیت دی جاتی۔[1] اور کمتر قابلیتوں کے لوگوں کو اصلاح شدہ مذہب کے صرف موٹے موٹے عقائد میں تعجیل کے ساتھ تعلیم دے دی جاتی اور سرحد کو بھیج دیے جاتے۔ ان سے کم درجہ کے رضاکاروں کو افضلیت دی جاتی۔ مہمان خانے میں ان کا خیر مقدم کیا جاتا اور مہمان خانے کے خازن "بھیا" عبدالغفار کے ذمہ کیے جاتے۔

وہ ان کو ان کے مقصد عظیم کے جہاد کی ضرورت اور ثواب پر لیکچر دیتے۔ ایسے نوواردوں کے لیے زیادہ نظری تعلیم درکار نہ تھی۔ ان کا کام سرحد پر عملی زیادہ تھا۔ سادہ، غیر نظری دانشمندانہ تعلیم سے ان خام رنگروٹوں میں اتنا جوش اور شوق پیدا ہو جاتا کہ اپنا گھر بار

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۴۰ سنہ ۱۸۶۴ء ص ۱۳۱

چھوڑ کر اپنی خوشی سے محاذ پر پہنچ جاتے۔" ان کٹر معتقدین کا اپنے مذہب کے لیے جوش اور سکھوں سے نفرت جو انھوں نے سکھوں کے جانشین انگریزیں میں منتقل کر دی تھی اس درجہ تھی کہ سید احمد کی شہادت کے کئی سال بعد تک رنگروٹ اور روپے کثیر تعداد اور مقدار میں برطانوی ہند سے ستھانہ پہنچتے رہے۔[1]

خلفاء کا تقرر یہ سارے کام مقامی سردار کے زیر ہدایت انجام دیے جاتے تھے۔ جو خلیفہ کہلاتا تھا۔ خود سید احمدؒ کے مقرر کردہ خلیفوں میں پٹنہ سے محمد حسین ولایت علی اور مظہر علی تھے۔ ان کو اپنے اپنے طور پر اپنے خلفاء مقرر کرنے کا اختیار تھا۔ اس طرح خلفاء کی زنجیر طول کھینچتی رہتی۔

محولہ سابق مولوی عبد الغفار مرحوم کی یادداشتوں اور نجی کاغذات میں اُن لوگوں کی فہرست موجود ہے جن کو یکے بعد دیگرے خلافت کے فرائض سونپے گئے۔ ہر خلیفہ کے معاون مشیروں کی ایک کمیٹی ہوتی۔ ایک وزیر جنگ و وزیر مالیات وغیرہ ہوتے تھے۔

فہرست درج ذیل ہے :-

(۱) سید محمد حسین۔ جن کے معاون تھے۔ اکبر علی، فیاض علی، یحییٰ علی، واعظ الحق اور مقصود علی۔

(۲) ولایت علی امیر، عنایت علی وزیر جنگ، فرحت حسین مالیات اور رضا کاروں کی بھرتی کے ذمہ دار۔

(۳) فرحت حسین (خلیفہ ولایت علی) امیر، یحییٰ علی صلاح کار، احمد اللہ و عبد الرحیم مشیر۔

(۴) یحییٰ علی (خلیفہ فرحت حسین) امیر، عبد الرحیم ذمہ دار مالیات، احمد اللہ مشیر، منجملہ مذکورہ مشیروں کے جو زندہ بچ رہے تھے۔

---

[1] جنرل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ ص ۳۶۳-۶۴

(۵) احمد اللہ امیر، مبارک علی ذمہ دار مالیات، ارادت حسین مشیر۔ اور ممبروں کے نام معلوم نہیں۔

(۶) مبارک علی امیر، محمد حسن ذمہ دار مالیات۔

(۷) محمد حسن امیر (اس فہرست میں کسی اور کا نام نہیں)

(۸) عبدالرحیم (غالباً ان کے جزیرہ انڈمان سے لوٹنے کے بعد) امیر ابو محمد ابراہیم، عبداللہ غازی پوری اور عبدالعزیز رحیم آبادی مشیران [1]

مجلس اعلیٰ یہ فہرست ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ وہابی تحریک کی کارکن کمیٹی کی کچھ نشان دہی کرتی ہے یہ سب سے بڑی مجلس تھی جو تحریک کی تنظیم کرتی اور چلاتی تھی۔ تحفظ و احتیاط کے پیش نظر اس کی تشکیل اور کارکردگی تحریری ضوابط پر مبنی نہ تھی۔ تمام ارکان ایک ہی جذبۂ ایثار و خدمت سے سرشار تھے اور سارا نظام خاموش سمجھ بوجھ کے ساتھ ہمواری سے چلتا تھا۔ اس فہرست سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امیر تحریک کی خدمت میں تجربہ کی بنا پر ترقی کر کے امیر ہوتا تھا نہ کہ زیادتی عمر یا عہدے کی بنا پر۔ یہ فہرست ہماری ان معلومات کے بھی عین مطابق ہے جو ہمیں تحریک کی تاریخ مابعد کی دستاویزی شہادتوں سے اور امیروں کی کارگزاریوں کے خاتمے کے بعد کے حالات سے حاصل ہوئی ہیں۔

خلیفہ یحییٰ علی برادران علی کے زیر قیادت احیائے تحریک کے زمانے میں کچھ عرصہ تک پٹنہ کے خلیفہ یحییٰ علی تھے۔ انہیں کی تنظیمی قابلیت نے پٹنہ کے صدر مقام کی متنوع ضروریات کی سربراہی کی۔ ان کے ذمہ فرائض میں سے صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مسجد میں عوامی امداد، نظریاتی نکتوں پر طلبہ میں تقریریں کرنا۔ ضلعی مرکزوں سے مراسلات سرحد پر بھیجے جانے والے اسلحہ کی جانچ پڑتال، ہنڈیاں جن سے بھاری بھاری رقوم خفیہ

---

[1] یہ باقاعدہ نظام عبدالرحیم کے حبس (جزیرہ انڈمان) کے بعد درہم برہم ہو گیا۔

طور پر ارسال کی جاتی تھیں ان کی پیچیدگیوں یا دشواریوں کی بہ نفس نفیس دیکھ بھال۔ خازن عبدالغفار دنیاوی معاملات جیسے رضاکاروں اور طلبہ کے قیام وطعام کے انتظام میں ان کی مدد ضرور کرتے تھے مگر مرکزی انتظامات کی روح رواں وہی تھے۔ یہاں بے محل نہ ہوگا اگر مقدمہ انبالہ میں جس میں یحییٰ علی خاص ملزمین میں سے تھے۔ ہربرٹ ایڈورڈ کے فیصلے سے کچھ اقتباس نقل کر دیا جائے۔ اس جج نے رائے زنی کی ہے "یحییٰ علی کے خلاف ثابت ہوگیا ہے کہ اس عظیم غداری کی مشین کی جسے اس مقدمہ نے منکشف کر دیا ہے بڑی کمانی یحییٰ علی تھا، روپے جمع کرانے اور مسلمانوں میں جہاد کی تبلیغ کرنے کے لیے اس نے اپنے ماتحت ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے۔ اس نے اپنے لاکھوں ہم وطنوں کو دھوکا دے کر غداری اور بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ اس نے اپنی سازش سے حکومت برطانوی ہند کو ایک سرحدی جنگ میں الجھا رکھا ہے جس سے بیسنکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ جو کچھ اس نے کیا ہے پہلے سے سوچ سمجھ کر اور بڑی عیاری و غداری سے کیا ہے۔ وہ ایک موروثی غدار اور مذہبی متشدد خاندان کا فرد ہے"[1] ایڈورڈز کو کبھی یہ خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ ایک دن آئے گا جب کہ یحییٰ علی کی یہ سخت مذمت ان کی وفادارانہ مساعی کی شہادت میں پیش کی جائے گی۔

(۲) دورہ کرنے والے مبلّغین

وہابی مبلّغین کی اہمیّت

دورے کرنے والے مبلّغین وہابیوں کی اندرونی تنظیم کے دھرے کی کیل تھے۔ یہ کارکنوں کی وہ خود فراموش بے نفس جماعت تھی جو سارے ملک میں چکر لگا کر اس دعوت کو اندرونی حصوں میں پھیلاتی اور تحریک کے لیے مال جمع کرتی۔ جہاں گرد داعیوں کے اس طریق کار کو ہندوستان کے موسمی حالات اور سیلانی جوگیوں اور سادھوؤں کی قدیم روایات اور منولوں نے سہل اور دلکش بنا دیا تھا۔ موسم کے شدائد جو لوگوں کو گھر سے نکل کر پناہ لینے پر مجبور کر دیتے اس ملک میں

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱۱ ۱۸۶۴ء صفحہ ۱۳۲

ناقابل برداشت نہ تھے۔ اور سال کے زیادہ حصوں میں یہ دعاۃ بلا مزاحمت سفر کر سکتے تھے۔ سیدھے سادھے دیہاتیوں کے لیے ایک سیلانی فقیر کا یہ پھیرا کوئی انوکھی بات نہ ہوتی تھی اکثر وبیشتر ان کا خیر مقدم کیا جاتا اور مختصر مدت کے لیے ان کو مفت طعام و قیام مہیا کر دیا جاتا۔ ایک مبلغ کے سیر و سفر کی ایک مثال بطور نمونہ ہنٹر کی ناقابل تقلید زبان میں پیش کی جاتی ہے۔" وہابی مبلغ کی تنہائی کی زندگی اس کے سفر میں دیہاتیوں کے لیے زیادہ دلچسپی کا موجب بنا دیتی۔ مہینوں وہ کسی کے گھر میں داخل نہ ہوتا۔ وہ کسی دُور کے صوبے سے آتا اور اپنے طویل سفر میں کسی معتمد شاگرد یا چیلے کے سوا کسی ہم سفر کو جو اس کے دھیان گیان میں خلل انداز ہو ساتھ نہ رکھتا۔ اس کے کردار کی سنجیدگی اور خارجی ماحول سے اس کی لاتعلقی اسے عام آدمیوں سے نمایاں طور پر مختلف بنا دیتی۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ دیہاتی اس کے گرد جمع ہو جاتے اور کچھ دیر کے لیے اپنے آہر لوکھر اور سرحد بیوانوں کے پرانے جھگڑے بھول جاتے[۱]"

مبلغین کا محتاط رویّہ

یہ مبلّغ اس بات کی بڑی احتیاط رکھتے تھے کہ ان کی تعلیم میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو حکام کے کان کھڑے کر دے۔ عنایت علی کی کارروائیوں میں بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح راجشاہی کا مجسٹریٹ اس حد تک چلا گیا کہ ایک شکایت لانے والے سے جواب طلب کر لیا کہ عنایت علی کی باغیانہ حرکات کے خلاف جھوٹی شکایت دائر کرنے کے لیے اس پر مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے۔ فی الحقیقت ان مبلغوں کی کارروائیوں کے صحیح معنی کا پتا چلانے میں جن پر بغاوت کی عمارت کھڑی کی گئی تھی حکام کی ہمیشہ ناکامی حیرت انگیز ہے اور ہنٹر اور کینیلی دونوں نے اس پر سختی سے تعریض و تنقید کی ہے۔ ان مبلغین کی تبلیغ سماجی مذہبی اصلاحات کی ضرورت اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جہاد کی تعلیمات کا ایک نہایت احتیاط سے تیار کی ہوئی

---

[۱] آور انڈین مسلمان صفحہ ۴۲

معجون مرکب تھی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ بہت سے گاؤں میں قدیم روایات اور رسم ورواج دلوں میں بہت زیادہ جاگزین ہوتے تھے، اور مایوس واعظ اس سخت دل گاؤں کی گرد اپنے دامن سے جھاڑ کر نکل کھڑا ہوتا ——" لیکن بہت سے گھروں میں اس کے پیغام پر کان بھی دھرا جاتا۔

مبلغین کی کارگزاریاں

کسی چیدہ فرد کو زیادہ گہری تعلیم وتربیت دینے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ جب حالات موافق ہوتے تو مبلغ گاؤں کے معلم یا کسی اسی قسم کی حیثیت سے رہ پڑتا، وہیں عقد بھی کر لیتا اور آس پاس کی منتشر بستیوں میں بھی کام کرتا۔ اپنا کام اچھی طرح پورا کرکے کسی مقامی آدمی کو معتبر نائب کے طور پر پیچھے چھوڑ دیتا اور خود آگے بڑھ جاتا۔ ایسے مقامی سرداروں کے علاوہ بہت سے دیہات کے آدمی بھی تحریک میں داخل کر لیے جاتے۔ اکثر ان سے کہا جاتا کہ مبلغ کے ساتھ ساتھ رہا کریں اور ان کے طویل سفر میں ان کو آمادہ کیا جاتا تھا کہ وہ وقت کی پکار پر لبیک کہیں مثلاً سرحد پر جنگ چھڑی ہو، وہاں رضاکار سپاہیوں کی ضرورت ہو تو یہ سب سے بڑی دینی خدمت ہے جو انسان انجام دے سکتا ہے، سب سے بڑی سربلندی ہے جو انسان حاصل کر سکتا ہے، "زندگی میں ایسا پہلا موقع جو ان کے سامنے آگیا ہے کیا اُسے ہاتھ سے دے دیں گے اور فائدہ نہ اٹھائیں گے؟ مہینوں اس صحبت میں رہنے کے بعد جو جوش وشوق اور آزادی کی بے لوث اور پاک روح سے لبریز رہی اس مکرر مسلسل سوال کا کوئی اور جواب ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ سرحد کی طرف رضاکاروں کا تانتا بندھ جاتا۔ یہ ہنٹر صحیح لکھتا ہے کہ "ان لوگوں (دورے کرنے والے مبلغین) نے سارے بنگال کو اپنے جال میں لپیٹ رکھا ہے اور ہزاروں کارآمد برٹش رعایا کو پہلے پراگندہ دماغ مذہبی دیوانہ پھر تاج برطانیہ کا سخت غدار بنا دیا۔"

(۳) ضلع وار مراکز

اندرونی تنظیم کی درجہ بدرجہ تعمیر میں دوسرا درجہ ضلعی مراکز تھے، جو دورے کرنے والے مبلغین کے اندرونی گاؤں میں جہاں ان کے پیغامات کا خیر مقدم حوصلہ افزا ہوتا اقامت پذیری کے نتیجے میں قائم ہو جاتا۔ سارے بنگال اور ملک کے دوسرے حصوں میں ایسے مراکز پھیل گئے۔ ہنٹر ان کے طریق کار کی تشریح کے ساتھ بنگال کے ضلع مالدہ کے دو مرکزوں کا مفصل ذکر کرتا ہے[1]

مبلّغین کا طریقۂ کار سنہ ۱۸۴۱ء کے قریب عبد الرحمٰن ایک لکھنؤ کا باشندہ اور ولایت علی کا ایک خلیفہ اپنے تبلیغی دوروں میں مالدہ آیا۔ وہاں شادی کر لی۔ ایک مدرسہ کا معلّم بن گیا اور وہیں مستقلاً قیام پذیر ہو گیا۔ اس کے پیشے نے اُس کو موقع دیا کہ وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ملتا جلتا رہے اور بالخصوص جوانوں پر اپنا اثر ڈالے۔ وہ اپنے احاطے سے آدمی اور روپے جمع کرنے اور اُن کو پٹنہ بھیجنے کا دوہرا کام کرتا رہا۔ اس کام میں ایک شخص رفیق منڈل قابلیت کے ساتھ اس کی اعانت کرتا رہا۔ وہ دراصل ایک کاشتکار تھا مگر عبد الرحمٰن نے اُسے تحصیلدار مقرر کر دیا۔ ان کا کام بہت عرصے تک بلا مزاحمت چلتا رہا یہاں تک کہ سنہ ۱۸۵۳ء میں حکام مشتبہ ہو گئے۔ رفیق منڈل کے گھر کی تلاشی لی گئی اور اس کے کاروبار کے باغیانہ انداز کے ثبوت میں کچھ کاغذات دستیاب ہوئے اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اس سبب سے جسے ہنٹر "سرکار کی معمولی سازشیوں کی تحقیرانہ نظرانداز ی" کی پالیسی کہتا اور تنقید و تعریض کرتا ہے، رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد رفیق منڈل نے اپنا کام اپنے بیٹے امیر الدین کے سپرد کر دیا۔ جو ایک لائق جانشین ثابت ہوا اور بڑی قابلیت، احتیاط، چوکسی اور کامیابی سے کام چلاتا رہا۔ اس کے زیر نگرانی مالدہ کے مرکز کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور عملاً بنگال

---

[1] آور انڈین مسلمان ص ۷۸-۸۳

کے سارے ضلعی مراکز کا ایک مقبول عام اڈا اور اکثر قائدین پٹنہ عنایت علی، فیاض علی اور مقصود علی کی ان کے دوروں میں ایک مفید طلب اقامت بن گیا۔ مرکز کا کام بلا خلل و مزاحمت دس سال سے زیادہ چلتا رہا "اس لیے کہ حکام ضلع اور خصوصًا ہندوستان کا ایک انگریز مجسٹریٹ صدر سلطنتِ رومہ کی طرح اپنے زیرِ حکومت اقوام کے طرح طرح کے عقائد و توہمات میں دخل اندازی کو ناپسند کرتا تھا۔ اسی طرح غداری بھی مذہبی لبادے میں باطمینان چل پھر سکتی ہے۔" ۱۸۶۵ء میں احمد اللہ کے مقدمے نے وہابی اثر کے اسی اہم مرکز کی کارستانیوں کی طرف حکام کی توجہ مبذول کی۔ اس وقت بھی امیر الدین کی کارروائیاں جاری تھیں ۱۸۶۸ء میں اس نے پٹنہ کے سردار (خلیفہ) کے بیٹے کو دعوت دی کہ آکر اس کے علاقہ کے متبعین کے بجھتے ہوئے (دینی) جوش کا بچشم خود معائنہ فرمائیں۔ اس کا علاقہ تین ضلعوں تک پھیلا ہوا تھا جن میں پورا مالدہ اور اضلاع مرشد آباد و راجشاہی کے کچھ حصے شامل تھے۔ اس نے سرحد کو جو رنگروٹ بھیجے ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن ہنٹر اندازہ لگاتا ہے کہ سرحد پر ایک ایک وہابی چوکی پر جس میں ۴۰۰ آدمی ہوتے تھے دس فی صد سے زیادہ اس کے ماتحت علاقوں سے آئے تھے۔ ۱۸۶۹ء یہ کارگزار مرکز توڑ دیا گیا اور اس کے قائدین گرفتار کر لیے گئے۔ جس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے۔

یہ وہابی ضلعی مراکز میں سے ایک مرکز کے طریق کار کی بطور نمونہ مختصر داستان ہے تمام ملک میں دوسرے اور مراکز کی کارروائیاں کم و بیش اسی قسم کی ہوتی ہوں گی۔

(۴) مال کی تحصیل

مال کی تحصیل کے لیے کئی کئی گاؤں کو ملا کر دفاتر صیغہ مالگزاری ایک صدر تحصیلدار کے ماتحت قائم کر دیے گئے تھے۔ ہر گاؤں کا تحصیلدار اس کے ماتحت ہوتا۔ زیادہ آبادی والے گاؤں میں تحصیلدار کے علاوہ ایک بڑا پیش امام ہوتا جو مسجد میں نمازیں پڑھاتا ایک غیر مذہبی سردار ہوتا جو ایک قسم کا جنرل مینجر ہوتا اور ایک ڈاک سردار ہوتا جس کا کام ہوتا قاصدوں کا بندوبست کرنا جو ملک سے باہر خطوط اور روپے پہنچانے کا خطرناک

فرض انجام دینے۔ بڑا تحصیلدار اپنے احاطوں کے سالانہ دورے کر کے دیکھتا کہ تمام بقایا رقوم کی باقاعدہ ترسیلات وصول کرتا اور ان کو پٹنہ بھیج دیتا جہاں ان کی رسیدوں کا ایک کھاتہ رکھا جاتا۔

وہابی فنڈ کے چندے

ہنٹر یوپی (صوبہ متحدہ) کے ایک نیل کے کاشتکار کے بیان کا یوں حوالہ دیتا ہے کہ اس کے مسلمان ملازمین اپنے معاوضہ کا ایک حصہ باقاعدہ وہابی فنڈ کے چندے کے طور پر الگ کر رکھتے۔ ان میں جو زیادہ دلیر ہوتے وہ فنی چھٹیاں بھی لیتے اور سرحد پر فوجی خدمت کے لیے نکل جاتے ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان ان نیل کے کاشتکاروں کے مسلمان گماشتے اکثر چند مہینوں کی رخصت کے لیے سرحد پر وہابی مرکز میں شرکت کی ضرورت پیش کرتے۔

وہابی فنڈ کے چندے نقد اور جنس دونوں شکلوں میں ادا کیے جاتے۔ چندوں کی خاص خاص شکلیں یہ تھیں:-

زکوٰۃ

(۱) زکوٰۃ۔ اسلام میں اس کی ادائی فرائض میں سے ہے۔ یہ ایک قسم کا انکم ٹیکس ہے جو ایک معینہ سالانہ شرح سے ان لوگوں پر عائد کیا جاتا ہے جو آمدنی کی بعض مدات میں آتے ہیں۔ شروع میں اس لگان کا مقصد ایک طرح کا رفاہی فنڈ قائم کرنا تھا جس سے نادار لوگوں کی حاجتیں پوری کی جاتیں۔ مگر وہابیوں نے اسے اصولاً انگریزوں کے خلاف جہاد پر استعمال کیا۔

صدقات

(۲) صدقات۔ صدقے بھی پرہیزگار لوگ نقد اور جنس دونوں شکلوں میں دیا کرتے تھے۔ جنس کی فروخت کی رقمیں جمع کر کے اکٹھی ارسال کر دی جاتیں بھیڑ بکریوں کی کھالیں بھی جو بقر عید کی قربانیوں سے حاصل ہوتیں۔ وہ خشک اور محفوظ کر کے بیچ دی جاتیں [1]

---

[1] اب بھی مسلمانوں میں یہی طریقہ رائج ہے کہ بقر عید میں یتیم خانوں کے طلبہ کھالیں جمع کرتے ہیں ان کو نمک لگا کر خشک کر کے بیچ دیا جاتا اور آمدنی کی رقم جمع کر لی جاتی ہے۔

عمومی لگان

(۳) ایک عمومی قسم کا لگان تھا مٹھیا۔ یعنی ایک مٹھی چاول یا کوئی اور غلہ۔ اس طریقے میں ہر گھر ایک اکائی تصور کیا جاتا اور توقع رکھی جاتی کہ ہر گھر روزمرہ کے صرف سے ایک مٹھی غلہ بیت المال کے لیے علیحدہ کر دے۔ اس طور کی بچت سے غریب طبقہ کے معاونین پر کوئی بار نہ پڑتا اور ساتھ ہی غلے کی معتد بہ مقدار پس انداز ہو جاتی۔ یہ جمع کی جاتی اور وقتاً فوقتاً صدر مقام کو بھیج دی جایا کرتی۔ مٹھیا کا یہ طریقہ چندے جمع کرنے کا ایک معروف اور فائدہ بخش ذریعہ تھا اور بعد میں اور سیاسی انجمنوں جیسے پرانی کانگریس پارٹی میں بھی تجویز ہوا تھا۔ سریندر ناتھ بنرجی نے جولائی ۱۸۸۳ء میں کلکتہ کے ایک جلسہ میں قانونی حقوق کے لیے احتجاج میں مالی اعانت کے واسطے ایک قومی فنڈ جاری کرنے کے لیے ایک رزولیوشن (تجویز) پیش کرتے ہوئے کہا تھا " وہابی اپنا فنڈ کس طرح فراہم کرتے ہیں؟ وہابی مصلحین کا ذکر کر رہا ہوں، وہابی باغیوں کا نہیں[۱]۔ اس لیے آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے یوں انجام دیتے ہیں کہ ہر گھر والا اپنا کھانا پکانے سے پہلے ایک مٹھی چاول رکھ لیتا ہے، اور یہ مٹھیاں ایک ہفتہ میں اکٹھی کی جاتیں اور مسجد میں لے جائی جاتی ہیں کہ وہابی مبلغ آ کر لے جائیں۔ اس طرح وہابی مشن کے چلانے کے لیے فنڈ جمع ہو جاتا ہے[۲]۔

عطیات

مبلغین ہر موقع پر تحریک کے لیے فیاضی سے عطیات دینے کی ضرورت اور ثواب پر زور دیا کرتے بالخصوص ان لوگوں سے زیادہ پر زور اپیل کی جاتی جو کسی سبب سے سرحد جا کر خود جہاد میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔

ان مستقل لگانوں کے علاوہ خاص خاص وقتی مواقع پر جیسے شادیاں، ولادتیں، تہوار

---

[۱] وہابی مبلغوں اور وہابی باغیوں کے درمیان یہ امتیاز غالباً ضرورۃً قائم کیا گیا تھا ورنہ حکام باغیوں کے طریقہ کار کے اختیار کرنے میں معترض ہوتے۔

[۲] پروگرس آف دی نیشنل فنڈ میٹنگ منعقدہ ۱۷ جولائی ۱۸۸۳ء کی رپورٹ مطبوعہ بین پریس کلکتہ ۱۸۸۳ء۔

عمی، خاص عطیات دیے جاتے۔ یہ خیرات، فطرہ اور صدقات وغیرہ ہوتے برطانوی عہد میں تحریک کے دولت مند معتقدین وقتاً فوقتاً خفیہ طور پر چندوں کی بڑی بڑی رقمیں بھیج دیا کرتے۔

(۵) مال کی ترسیل

یہ تو تھا طریقہ وہابیوں کے مال حاصل کرنے کا۔ اب دوسرا زیادہ دشوار کام حاصل کردہ مال کو خفیہ طور سے سرحد تک پہنچانے کا نظام قائم کرنا تھا۔ یہی کام تھا جس میں پٹنہ کے قائدین بالخصوص یحییٰ علی کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے سرحد کے راستے پر پورے طول میں وہابی مسافر خانوں یا مہمان خانوں کا سلسلہ تیار کر دیا اور ہر ایک کو کسی آزمودہ کار مرید کے سپرد کر دیا۔ ہنٹر نے اس نظام کار کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

"عظیم شمالی شارع عام مناسب حال ٹکڑوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ اور وہابی باغی ہمارے دشمن کی چھاؤنی کی طرف مصروف علاقوں سے اس اطمینان کامل سے گزارا کرتے تھے کہ ہر منزل کے آخر میں ان کے دوست ان کے منتظر ہیں۔ ان مسافر خانوں کے وہابی کارکن مختلف مدارج زندگی کے ہوتے اور سب برطانوی حکومت کی بربادی کے جاندادہ ہوتے اور ہر ایک باغیوں کی مقامی کمیٹی کا سردار ہوتا۔ یحییٰ علی نے ان اشخاص کے انتخاب میں اپنے گہرے نفسیاتی علم کا ثبوت دیا، کیونکہ نہ انکشاف کے خوف نے نہ انعام کے لالچ نے ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے سردار کی رسوائی کے وقت اس کے خلاف کھڑے ہونے پر آمادہ کیا۔ اور اگرچہ معلوم تھا کہ اس وقت ان پناہ گاہوں کے ایک سلسلہ (جیسے تھانیسر) نے پٹنہ کو سرحد پنجاب سے ملا رکھا تھا۔ لیکن کوئی سامنے آ کر کسی خاص مقام کی طرف انگلی سے بھی اشارہ نہیں کرتا۔" [۱]

---

[۱] کلکتہ ریویو جلد ۴۰ ۱۸۶۴ء صفحہ ۱۳۶

تحریک کے خفیہ کارکن

روپے کی ترسیل کا یہ نازک اور دشوار کام خفیہ کارکنوں کا ایک گروہ انجام دیتا تھا۔ اگرچہ ضرورۃً و مصلحتۃً ان کے کام چادرِ راز میں ملفوف رہتے۔ اور ان کے متعلق زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں، اس خطرناک مہم کا ایک مختصر بیان ایسے مواد سے جو دستیاب ہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

یہ کارکن نقد لے کر (جو زیادہ تر اشرفیوں کی صورت میں ہوتا) پٹنہ سے چلتے۔ مخلوط سکوں کے وزن اور حجم کو کم کرنے کے لیے ان کو اشرفیوں میں منتقل کر لیا جاتا جو صدریوں، جوتوں یا قاصد کے کسی حصہ جسم پر ٹانک دی جاتیں۔ سکوں کو اشرفیوں میں منتقل کرنے کے کام میں پٹنہ کے مشہور تاجر چرم امیر خاں سے بہت مدد ملتی جن کی ایجنسی کلکتہ میں تھی۔ دہلی کے کچھ ساہوکاروں کی خدمات سے بھی کام لیا جاتا۔ سید احمد رحمہ اللہ تعالٰے کے زمانے میں روپے کے بھیج بھیجاؤ کے انتظام میں دہلی زیادہ اہم درجہ رکھتی تھی۔ دہلی میں اس کاروبار کا سب سے بڑا ایجنٹ ایک شخص اسحاق نامی تھا۔ سید احمد قائدین عظیم آباد کے نام مکتوب میں ترسیل زر کے لیے اسحاق کا نام ایک معتبر اور معتمد شخص کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ بعد میں پٹنہ مرکز بن گیا اور ترسیل زر تھانیسر اور راولپنڈی کے راستوں سے ہوتی تھی۔

خفیہ کارکنوں کا طریقہ عمل

یہ خفیہ عامل ملک کے پورے طول میں کبھی تنہا کبھی بھیس بدل کر، اور زیادہ تر دوسرے بڑے کاروانوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جتھوں میں سفر کرتے۔ وہ منزل بمنزل مختلف مرکزوں میں ٹھہرتے جاتے جو یحییٰ علی کی تنظیمی قابلیت سے پورے گرینڈ ٹرنک روڈ پر قائم تھے۔ ان کے یہ سفر ایسے آسان اور محفوظ نہ تھے جیسا کہ ہنٹر کے بیان مندرجہ بالا سے مترشح ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حامل زر قاصد کے اختیار کردہ راستے کی خبر پہلے سے پھوٹ جاتی، پھر بھی ان کو یہ خطرہ جھیلنا ہی پڑتا۔ ہمیں ان باخبر ذرائع اور مخلص ایجنٹوں کے دلیرانہ کارناموں کے زیادہ واقعات تو دستیاب نہیں۔ صرف سید احمدؒ کے زمانے کے ایک ساہوکار پیر محمد کے مشن کا ایک واقعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کے اس

خطرناک کام کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ تین ہزار روپے کی ایک ہنڈی اور ایک ہزار اشرفی نقد لے کر دہلی سے سرحد کو جا رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کو اس کا پتا چل گیا اور جنرل ونٹورا کو ہدایت کر دی کہ قاصد کی تاک میں رہے۔ آخر کار اس کا پتا مل گیا تلاشی لی گئی اور اس کے جسم سے مخفی رقوم برآمد کر لی گئیں۔ پیر محمد کی سخت پٹائی ہوئی اور لاہور میں قید کر دیا گیا۔ وہابیوں کے پاس بھی اپنے ذرائع معلومات تھے ان کو لاہور میں سید احمدؒ کے مقامی ہمدردوں کے ذریعہ سے اس گرفتاری کی خبر مل گئی۔ آخر کار حکیم مغیث الدین سہارن پوری نے بھاڑے کے ایک مشہور جرمن فوجدار ولیم رنیھارٹ کی بیوہ بیگم سمرو سے جنرل ونٹورا کے نام ایک چٹھی لکھوائی۔ الغرض پیر محمد رہا ہو گیا اور بہت سے دوسرے حادثات سے دوچار رہنے کے بعد سرحد واپس آ گیا۔

ایجنٹوں کی دیانت

منتقلی زر کا ایک بڑا ذریعہ ہنڈی تھا۔ دلی اور پشاور میں کسی ساہوکار کے پاس نقد رقم جمع کر دی جاتی وہ اس میں سے بارہ فی صد کمیشن کاٹ کر سرحد بھیج دیتا۔ شرح کمیشن بہت زیادہ تھی مگر یہ لوگ قابل اعتماد تھے اور روپے کے روک رکھنے یا ارسال میں ادھر ادھر ہو جانے کا کوئی واقعہ کسی تحریر میں نظر سے نہیں گزرا۔ ہلکے رقوم کی ہنڈیوں کو ترجیح دی جاتی تھی کیوں کہ وہ زیادہ آسانی سے بھنائی جا سکتی تھیں۔ اکثر ساہوکاروں کو ہدایت کر دی جاتی تھی کہ ان رضاکاروں کے متوسلین (بال بچوں) کو جو ہندوستان میں پڑے ہیں دینے کے لیے کچھ رقم الگ رکھ چھوڑیں۔ ان کی خبر گیری کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ جو لوگ یہ کام کرتے تھے ان کے کردار اور ایمان داری کی یہ واضح دلیل ہے کہ جو بڑی بڑی رقمیں ان کے سپرد ہوتیں ان میں سے ایک پائی کے بھی خورد برد ہونے کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ ان لوگوں کے اخراجات سفر الگ سے دیے جاتے۔

اگر راستے میں بیماری گرفتاری یا رکاوٹ وغیرہ کے غیر متوقع سبب سے صرف بھی ہو جاتے تو جسمانی محنت و مشقت سے ان کو پورا کر دیتے اور اس رقم امانت سے

جسے پہنچانا ہوتا کچھ بھی خرچ نہ کرتے۔

ترسیل زر کا طریقہ کار جس زمانے میں احمد اللہ اس فنڈ کے خازن تھے ایک کھاتہ رکھا جاتا تھا جس میں تمام رقوم جو وقتاً فوقتاً وصول ہوتیں درج کر لی جاتیں۔ یہ کھاتہ عبدالغفار کے نام سے تھا۔ الٰہی بخش کو جو احمد اللہ کے مقدمے میں سرکاری گواہ بن گیا تھا۔ اشرفی خریدنے اور ہنڈیاں تیار کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ دونوں کام ترسیل زر کی زنجیر کی مضبوط کڑیاں تھے، اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ ہندو مہاجنوں کے ذریعے سے ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں پٹنہ کے رام کشن، فتح چند امنوہرداس دہلی کے جگرناتھ اور مکوند لال، بنارس کے لال چند کرم سنگھ، سامنت رائے، اور شیو بخش اور منورا، سرحد کے سنتو اور موتی کے نام موجود ہیں۔ جو خطیر رقمیں قائدین پٹنہ نے ارسال کیں ان کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ تین سال ۱۸۶۳ء سے ۶۵ تک جب کہ امبیلا کی جنگ چھڑی ہوئی تھی پٹنہ سے ایک لاکھ کی رقم صرف ایک مہاجن منوہر رام کی معرفت بھیجی گئی تھی [1] اس کی بنا پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس طویل مدت میں جب کہ یہ نظام ترسیل جاری تھا بڑی بڑی رقمیں بھیجی گئیں۔

(۶) خفیہ اور مرموز پیغامات

خفیہ پیغامات اور روپے کی رسیدوں کے لیے مرموز الفاظ و اعداد کا ایک پیچیدہ نظام بھی خود سید احمدؒ کے زمانہ سے مستعمل تھا۔ کچھ مرموز نقش جو حیدر آباد سازش کے مقدمے میں پکڑے گئے تھے ان کا حل ابھی باقی ہے [2]۔ عرفی نام بھی استعمال ہوتے

---

[1] وہابی مقدمات پر بنگال گورنمنٹ کی دستاویزات کے انتخابات مرتبہ ایم اے خاں صفحہ ۹۸

[2] مرموز اعداد میں ایک پیغام اس طرح ہے۔ خفیہ کاغذات نمبر ۱۔ مورخہ ۱۲ جون ۱۸۳۹ء مقابل B :-

تھے ۔ حتی الوسع کاتبوں کے نام اور پتے براہ راست استعمال سے اجتناب کیا جاتا ۔ خفیہ مطالب کے ظاہر کرنے کے لیے ادبی اور مذہبی استعارات و تلمیحات کا استعمال کیا جاتا۔ پٹنہ کے قائدین نے اپنے محصولہ فنڈ کے ارسال کے لیے مرموز علامات اور فرضی ناموں کا ایک نہایت باقاعدہ اور کارآمد نظام تیار کر لیا تھا ۔ محصلہ رقوم کی ترسیل میں بہت زیادہ اسی پر انحصار رکھتے تھے ۔

وہابیوں کے متعلق جیمس ایبٹ کی رپورٹ

کئی مواقع پر حکومت کی توجہ اس طرف منعطف کی جا چکی تھی کہ ہندوستان میں باغیانہ مراسلات کا ایک جال اور سرحد کی نوآبادی کو آدمی اور روپے کی فراہمی کا سلسلہ موجود ہے ، جس کا صدر مرکز پٹنہ تھا ۔

جیمس ایبٹ ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے ۱۸۴۹ء ہی میں پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کی تھی کہ ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کا ایک عجیب جتھا یہاں آباد ہو گیا ہے ۔ یہ اپنے اسلحہ اور گزارے کا سامان اپنے ساتھ لاتا ہے اور ستھانہ میں آ جما ہے ۔ یہ مقام ان سب لوگوں کا مرجع ہے ۔ جو ایک کامیاب غزوہ کے دیکھنے کے منتظر ہیں ۔ اس نے ان مہاجرین کے خفیہ طور پر اپنے جسموں پر اور کھوکھلے بانس کی لاٹھیوں میں خطوط اور سونا لے آنے کا ذکر بھی کیا ۔ یہ بھی رپورٹ کی گئی کہ نواب وزیر محمد خاں والی ٹونک مرید سید احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی بڑی بڑی سالانہ رقوم بھیجا کرتا ہے ۔ گزشتہ دو سالوں میں ان کی تعداد ۶۰ یا ۸۰ نفر ہو گی مگر گزشتہ دو ہفتے میں بڑھ کر دو سو سے زیادہ ہو چکی ہے اور ہزاروں کی اُمید کی جاتی ہے ۔ جیمس ایبٹ نے اپنے بعد کے خطوط میں بورڈ کی توجہ دوبارہ اس امر کی طرف منعطف کی کہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے خاص کر کے راجپوتانہ اور روہیلکھنڈ سے ستھانہ میں آدمیوں کا اجتماع جاری ہے ۔ وہ فقیروں اور طالب علموں کے بھیس میں اٹک کی راہ سے آتے اور ستھانہ پہنچ کر اپنی میلی کچیلی گدڑیاں اتار پھینکتے ہیں ۔ ستھانہ میں گودام بھی بن رہے ہیں جہاں گندم کا ایک بڑا ذخیرہ اونٹ پر لایا اور جمع کیا جاتا ہے ۔

جیمس ایبوٹ کی سبکدوشی

کپتان ایبوٹ ہزارہ کے مضبوط ملک میں ان جوشیلے لوگوں کے اجتماع سے فکر مند تھا۔ کیونکہ یہاں حکومت کے خلاف کارروائیوں میں سکھوں اور درانیوں سے کسی آویزش کے موقع پر یہ فساد جڑ کی طرح کام میں لائے جا سکتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ پنجاب میں کسی نئی شورش کے موقع پر ہزارہ ہی پہلا اکھاڑا منتخب کیا جائے گا۔ جھگڑے کے عناصر متعدد ہیں۔ یہ زمین دار الحکومت سے بلند اور دُور ہے اور آخری فیصلہ سے جو ملتان کے حق میں ہوا نقطۂ مماثلت کی دریافت میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ ستھانہ کو ذرائع آمد و رفت کا سلسلہ قطع کر دینے کے لیے اس نے مشورہ دیا کہ دریائے سندھ کے کنارے مسلّح چوکیاں قائم کی جائیں۔ لیکن بورڈ نے کپتان ایبوٹ کے اندیشے سے اتفاق نہ کیا۔ وہ ان نمایاں علاقوں میں مناسب ذریعہ آمد و رفت کے بغیر ایسی مسلّح چوکیاں قائم کرنے پر راضی نہ ہوا۔ ہزارہ میں کسی انقلاب کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ "حکومت برطانیہ کے تمام دشمنوں کی ابھی ابھی پوری سرکوبی ہو چکی ہے۔ ہزارہ کے لوگ جیسے تلون مزاج اور بے وفا ہیں اس لحاظ سے ابھی کسی جہاد کا وقت نہیں آیا ہے خواہ مذہبی دیوانے کچھ ہی تقریریں کریں اور چند غنڈے کچھ ہی سوچیں۔" برسر موقع شخص کپتان بوٹ اور بورڈ آف ایڈمینس ٹریشن کے درمیان پالیسی کے اختلاف میں لہجے کی تلخی بڑھتی چلی گئی۔ آخر ۱۸۵۳ء میں ایبوٹ کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔ بہرحال کپتان ایبوٹ کی نمایاں سیاسی دانائی کا اقرار کرنا قرین انصاف ہے اس صورت حال کا تخمینہ اُس بورڈ سے کہیں زیادہ صحیح ہے جس کی آنکھیں ہزارہ کی ایسی مستقل وفاداری کی دلفریب توقعات کے خلاف کھل جانے والی تھیں کہ اہل ہزارہ ہمارے ہاتھوں ہمیشہ اعانت و مروت ہی پاتے رہے ہیں۔

وہابیوں کی نقل و حرکت پر نظر

۱۸۵۳ء میں پٹنہ ایک بار اور باغیانہ مراسلت اور سرحد پر وہابی نو آبادی کو آدمی اور روپے کی فراہمی کے طور پر نمایاں ہوا۔ گزشتہ کئی مواقع کی طرح اس موقع پر بھی حکومت صورت حال کی واقعی سنجیدگی کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ گورنر بنگال نے اس موضوع پر صرف سرکاری

روداد مورخہ ۲۶ اگست ۱۸۵۲ء تیار کرنے پر اکتفا کی۔ جس میں لکھا گیا کہ "مجھے اس میں شک نہیں کہ پٹنہ کے کچھ اشخاص اور سوات اور ستھانہ کے مذہبی دیوانوں کے درمیان مراسلت ہوتی ہے اگرچہ گورنر نے مجسٹریٹ کے اندیشہ سے اتفاق نہیں کیا اس نے مناسب سمجھا کہ اشخاص متعلقہ کے رویے اور نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے اور جس صورت میں کہ مجسٹریٹ کی رپورٹ کے مطابق وہابی مسلح آدمیوں کا اجتماع ہو تو حکومت کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے میں ضروری اقدامات کروں گا۔"

جنگ امبیلہ کے بعد انگریزوں کی کاروائیاں

ہندوستان سے آدمیوں اور روپے کی فراہمی کا یہ نظام ہی تھا جس نے سرحد پر وہابیوں کی ریاست کے لیے کشمکش کو برقرار رکھا۔ اس زبردست سہارے کے جاری رکھے بغیر یہ کش مکش برقرار نہ رہ سکتی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں اس ذریعہ مراسلہ و مرابطہ کے اتفاقی انکشاف ہی سے حکومت ہند نے جنگ امبیلہ کی سخت ٹھوکر سے ہوش سنبھالا اور ہندوستان کے اندر سازش کے ان مرکزوں کا پتا لگانے اور ان کا خاتمہ کر دینے پر اپنے تمام وسائل وقف کر دیے۔ اس کے بعد اگرچہ سرحد پر وہابی مرکز تو قائم رہا مگر اس کی طاقت اور اثر باقی نہ رہا۔ جیسے ہی گنگا کی شاداب وادیوں سے طاقت بخش ذخیروں کا یہ مستقل بہاؤ بند ہوا وہابی ریاست کا نوخیز پودا سرحد کی بنجر گرم چٹانوں میں جھلس کر رہ گیا۔

(ب) وہابیوں کا ہندوستانی فوج میں تداخل

وہابیوں کی تنظیمی کاروائیوں میں دوسرا زبردست ہتھکنڈے برطانوی فوج کی ہندوستانی پلٹنوں میں گھل مل جانے کی کوشش تھا۔ خود سید احمدؒ نے اپنی جدوجہد کے آغاز ہی میں آنے والی کش مکش و آویزش کے لیے ایک قواعد دان تربیت یافتہ فوج کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مگر ان کا مقصود محض ایک بھاڑے کی فوج رکھنا نہ تھا بلکہ ایسے جانباز رضا کاروں کی جماعت اکٹھا کرنا تھا جن کی تربیت دینی اور اخلاقی معیاروں کی بنیاد پر ہوئی ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ خود امیر خاں والی ٹونک کی فوج میں داخل ہوئے تھے جہاں ان کو پیش امام کا کلیدی عہدہ ملا تھا۔ اسی نے ان کو اپنے حوصلہ کے مطابق سپاہیوں کو اخلاقی تربیت دینے کا موقع دیا۔ مخزن کا مؤلف سید احمدؒ کے وہاں تقرر کے زمانے میں اُن کی کئی کرامات بیان کرتا ہے۔ ان کے ذریعے سے انہیں عام سپاہیوں کے دماغوں پر کچھ اثر ڈالنے کا کافی موقع ملا ہو گا۔

اس قائد تحریک نے جو خاکہ تیار کیا تھا بعد میں اس کے رفیق کچھ ترمیموں کے ساتھ اس پر کاربند رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگی چالیں

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستانی پلٹنیں جو سپاہ کہلاتی تھیں ان کی ترکیب اور نشو و نما بجائے خود ایک قابل غور اور اہم موضوع ہے یہ سپاہ ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی ترقی اور نشو و نما میں عظیم الشان حصہ رکھتی تھی۔ انیسویں صدی میں تاریخ ہند میں اس بات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ ہندوستانی پلٹنوں کو جو ملک کے ایک حصہ سے بھرتی کی جاتی تھیں کس طرح ملک کے دوسرے حصوں کو فتح کرنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ بنگال کی فوج کا حصہ پہلے جنگ کابل میں (جو عجیب طور پر ان میں بے چینی کے بیج بونے کا باعث ہوئی) اور بعد میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان جنگوں میں، پھر ۱۸۵۷ء کی تحریک کی سرکوبی

میں سکھ رجمنٹوں کی اہم خدمات اور کارکردگی جس میں بنگال کی فوج علمبردار تھی، چند مثالیں ہیں اور یہ صورتِ حال کی اعجوبگی کی انتہا تھی۔ لارڈ لارنس کا ۱۸۵۷ء میں دہلی کی بازیابی میں ایک زبردست ہاتھ تھا۔ اس کے سیرت نگار نے اس کی پالیسی کی تحسین کی ہے کہ پنجاب کی مختلف نسلوں میں مخاصمت سے جس کا اُسے علم تھا فائدہ اٹھا کر انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسری جنگ میں اس نے تیس ہزار پٹھان بھرتی کر لیے اور اس طرح مروجہ طریق کار کو اُلٹ دیا جو غدر میں ہمارے اتنا کام آیا۔

دو پلے کی حکمت عملی

یہ فرانسیسی اور زیادہ تر دوپلے کی کارستانی تھی جس نے پہلے پہل اس نفع بخش تخیل کو عملی شکل دی کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں جزیرہ نمائے ہند کی تاریخ میں مختلف مقامی جنگوں میں حصے کر فرانسیسی مفاد کو طاقت پہنچانے کے لیے ہندوستانی پلٹنوں کو بھرتی کر کے فرانسیسی افواج کا ایک حصہ بنا دیا جائے۔ لیکن یہ دوپلے کے زیادہ خوش نصیب رقیب کلایو کا کارنامہ تھا جس نے اپنے سیاسی حریف کے شاندار تخیل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ حقیقت میں اسے اپنے کام کا سب سے زیادہ کارآمد آلہ بنایا اور ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی بنیاد ڈال دی۔ ۱۷۵۸ء میں بہار میں اپنے پہلے ورود میں فوجی مصالح کے پیش نظر خالصتہً ضلع شاہ آباد کے باشندوں پر مشتمل جو اپنی تنومندی اور بہادری کے لیے مشہور ہیں ایک مختصر پلٹن تیار کی۔ ان پلٹنوں کو جو وہاں سے بھرتی کی گئیں یورپی طرز پر فوجی قواعد کرائے جاتے اور تربیت دی جاتی۔ یہ یورپی افسروں کے ایک چیدہ گروہ کے زیر کمان تھیں جو اپنا فرض اس مہارت سے بجا لایا جو اس تخیل کے بانی کے خیال سے افزوں تر تھا۔ سلطنت مغلیہ کا انتشار، اس کے مقامی خاندانوں میں اس کی تقسیم و پراگندگی، طویل خانہ جنگیاں، کسی عظیم قومی مطمح نظر کی غیر موجودگی، نیز اس باہمی اعتماد وارتباط کا وہ خاص جذبہ جو دوش بدوش لڑنے سے پیدا ہو جاتا ہے اور جو مختلف نسلوں اور مذہبوں کو ذات پات اور دین دھرم سے آزاد کر کے وفاداری اور دوستی کے بندھن میں مربوط کر دیتا ہے، سب مل کر ان ہندوستانی پلٹنوں اور ان کے یورپی افسروں کو ایک نہایت کارآمد اور موثر فوجی تنظیم میں منتقل کر دینے

میں بہت معاون ہوئے۔ یہ تو نتیجہ تھا امتداد زمانہ اور غالباً اس حقیقت کو بہت طور پر سمجھ لینے کا کہ انہوں نے ہی کسی حد تک انگریزوں کو ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں مدد دی تھی، اور بہت سی مقامی شکایات کا جن کو مغربی احساسات نے ہوا دی کہ ہندوستانی پلٹنوں میں بے چینی نے سر اٹھایا۔ جس کے نتیجے میں پہلے تو معمولی شورشوں اور سازشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور آخر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم پر ختم ہوا۔ اس نے مشرق میں سلطنت برطانیہ کے عظیم الشان ڈھانچے کو جو خود "سپاہ" کے خون اور پسینے سے تعمیر ہوا تھا قریب قریب تباہ کر دیا۔

وہابی قائدین کا عسکری تدبر

یہ وہابی قائدین کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ آویزشوں میں سب سے پہلے محسوس کیا کہ ہندوستانی فوج کو اس جنگ میں کلیدی مقام حاصل ہے۔ انگریزوں کی طاقت کا سب سے بڑا آلہ کار یہی ہے، اور اگر کسی طرح اسے معطل کر دیا جائے تو آدھی جنگ جیت لی جا سکتی ہے۔ اسی احساس سے وہابی ایجنٹوں نے بار بار ہندوستانی سپاہ کے ذہن نشین کیا کہ وہ کتنی طاقت کی مالک ہے اور انگریز کہاں تک اس کے محتاج ہیں۔ وہابیوں کے ہندوستانی فوج میں گھل مل جانے کے متعلق مندرجہ ذیل بیان اور معلوم عام تحریری واقعات سے واضح ہو جائے گا کہ ان کی کارروائی پورے ہندوستان کو محیط تھی۔ ان کو خبر نہ تھی کہ دوسری بار کون سی ٹولی ان سے لڑنے کو بھیجی جانے والی ہے، اس لیے ان کے ایجنٹ دریائے ستلج سے کلکتہ تک تمام اہم چھاؤنیوں میں تعینات تھے۔ اور جتنی ٹولیوں کی وفاداری کو توڑنا ممکن تھا ان کے توڑنے اور ان کے اثر کو معطل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جہاں محض وعظ و تبلیغ اور حب وطن کی اپیل کارگر نہ ہوتی وہاں مالی ترغیب و تحریص کی زیادہ یقینی اگرچہ ادنیٰ تر ترکیب سے بھی کام لیا جاتا۔ ۱۸۴۵ء کی پٹنہ سازش میں ہندوستانی سپاہیوں میں کثرت سے روپے تقسیم کیے گئے تھے۔ وہابیوں نے فوج میں گھس جانے کی چال بہت پہلے سے اختیار کر لی تھی اور ان کے اصول میں داخل تھی اور فوجی ٹولیوں میں ان کی گڑبڑ کی کارروائیوں کے بہت سے تحریری واقعات موجود

ہیں، ان سے ان کے طریق کار کا یکساں نمونہ صاف ظاہر ہے۔

دکن میں وہابیوں کی کارگزاری

عجیب بات ہے کہ ہندوستانی فوج کی وفاداری کو متاثر کرنے کے لیے وہابیوں کے ہندوستانی فوج میں تداخل کا پہلا تحریری واقعہ جنوبی ہند سے متعلق ہے۔ ۱۸۳۹ء میں حیدر آباد سازش کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس سازش میں حکومت کی تفتیش کے دوران میں یہ انکشاف ہوا تھا کہ مدراس میں اور آگے دکن تک مختلف ملکی اور فوجی چھاونیوں میں وہابی کارندوں[1] کا ایک وسیع جال معروف کار تھا۔ ویلور کے کمان افسر نے حکومت میں ان کی کارروائیوں کی رپورٹ بھی بھیجی ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ عدالت ضلع کے مفتی ولی محمد اور عدالت کلکٹر کے صدر ہوب اللہ (؟) ایک فارسی اخبار ستارہ (؟) اخبار جو کلکتہ کا ایک شخص رجب علی طبع کرتا ہے، وصول کیا کرتے تھے۔ آخر الذکر شخص محمد علی[2] رامپوری کا خلیفہ ہے جو اب سے پیشتر علاقہ کرناٹک میں اپنی باغیانہ جدوجہد کے سبب سے مدراس سے نکال دیا گیا تھا

اس اخبار نے دوست محمد اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی جنگ کو نمایاں کیا ہے اور پیش گوئی کی ہے کہ دوست محمد جلد ہی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرے گا۔ مولوی مودین (مبین ؟) مسجد نزد قلعہ کا بڑا مولوی اور مولوی محمد علی رامپوری موصوف الصدر کے دوسرے معتقدین مغرب کی نماز کے بعد مجمع میں وعظ کہتے اور جہاد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ شہر کی دوسری مساجد مسجد قلعہ، شنی اسٹریٹ مسجد اور بران صاحب کی مسجد میں اسی قسم کی تقریریں ہوتی ہیں۔ آخر الذکر مسجد کا پیش امام فوج سے خارج کیا ہوا سپاہی ہے۔

بعد کی ایک چٹھی مورخہ ۱۵ جون ۱۸۳۹ء میں ویلور کے کمان افسر نے حکومت مدراس

---

[1] اس زمانہ کا دستور تھا کہ رجمنٹ میں ایک مولوی اور پنڈت مقرر ہوتا۔ بعض دفعہ وہابیوں نے رجمنٹ کے مولویوں اور پنڈتوں کے ذریعہ سے بھی کام لیا ہے۔

[2] ان کو سید احمدؒ نے دکن میں کام کرنے کو بھیجا تھا۔

کو ایک گودا میاں کے بارے میں خبر دی ہے جو پلاورم کے سپاہیوں کو لیکچر دیا کرتا اور شطرنج کھیلنے کے بہانے سے اکثر افسروں کی کوٹھیوں پر حاضر رہتا تھا۔ اس نے ایک شخص موسوم بہ بڑا صاحب[1] کی طرف سے ایک رسالے کی اشاعت کی خبر بھی دی جس میں باغیانہ مضامین درج ہیں۔

افسر نے ایک اور چٹھی مورخہ ۱۰ جون ۱۸۳۹ء میں حکومت مدراس کو موصوف الصدر محمد علی کے حلیفوں اور ایجنٹوں کی فہرست بھیجی جو دکن میں مختلف ملکی اور فوجی چھاؤنیوں میں کام کرتے تھے۔

وہابیوں کی بہار میں سرگرمیاں

۱۸۴۵ء میں پٹنہ میں ایک وسیع تر اور بہتر منظم سازش کو جنم دیا جا رہا تھا جس میں وہابیوں کا کردار بہت نمایاں تھا۔ اس واقعے کی طرف مورخین نے اب تک پوری توجہ مبذول نہیں کی ہے اور جے ڈبلیو کیئی J. W. KAYE کا مختصر خلاصہ اب تک تنہا شائع شدہ بیان باقی رہ گیا ہے۔ فی الحال جب کہ بہار میں ۱۸۵۷ء-۵۹ء کی تحریک کی تحقیقات سے متعلق اس موضوع پر نسبتاً مکمل تحقیق ہونے لگی تو اس سے متعلق اصلی کاغذات برآمد کر کے مطالعہ کیے گئے۔ پھر بھی ان دونوں نوشتوں میں یہ بات مان لی گئی کہ سازش کے منظموں کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ کیئی KAYE نے بھی اقرار کیا کہ "یہ سازش واقعی کسی حد تک وسعت پذیر ہوئی اور کس مرکزی نقطے سے پھوٹی نہ اب معلوم ہے نہ کبھی معلوم ہو گی۔" دوسرے نوشتہ نے بھی یہی بے چارگی ظاہر کی ہے۔ "وہ (سیف علی) آخر تک ایک پر اسرار شخصیت رہا۔"[2] علاوہ بریں دوسری تحریر دراصل کنور سنگھ کے سوانح سے متعلق تھی جو بہار میں ۱۸۵۷ء کی تحریک کا قائد تھا۔ اور اس سازش کا اسی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا گیا، کیونکہ

---

[1] یہاں یہ دلچسپ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ولایت علی کو عموماً ان کے قریبی رفقاء کے حلقے میں اور ان کے مراسلات میں بڑے حضرت کے لقب سے خطاب کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان کا عنایت علی سے امتیاز کیا جاتا تھا جو "منجھلے" حضرت کہلاتے تھے۔

[2] کے کے دتا ص ۵۹-۶۰

اس میں کنور سنگھ کے ملوث ہونے کا کچھ ذکر ہے[1] چونکہ اصل منظموں کی شناخت کی صحیح جانچ نہ کی گئی اسی لیے وہابیوں کا اس کے خاص منظموں میں شامل ہونے کا مسئلہ نظر انداز ہوگیا۔

بہار میں اس سازش کی بنیاد کو حکومت کی بعض سماجی اور اقتصادی پالیسیوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی عام بے چینی میں تلاش کرنا ہوگا۔ عوام کی شکایات کی فہرست میں اراضی کی بازیافت کی کاروائیوں اور مشنریوں کی جدوجہد کو بھی داخل کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کے خلاف شورش کرنے والوں نے قوم کے خوف اور اندیشوں سے بھی ہوشیاری سے کام لیا۔

خواجہ حسن علی کی انگریزوں کے خلاف کاروائیاں

سازش کے موٹے موٹے وقائع مختصراً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں تاکہ ہم تمام داستان کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ ۱۸۴۵ء کے اواخر میں حکومت کو رپورٹ کی گئی کہ داناپور (پٹنہ) میں متعینہ دیسی افسروں اور سپاہیوں کی وفاداری کو متاثر کرنے اور بگاڑنے کے لیے ایک عمومی وسیع سازش موجود ہے۔ واقعات کی زنجیر[2] جو اس سازش تک پہنچتی ہے وہ فرسٹ رجمنٹ۔ N.I کے ریجمنٹل منشی پیر بخش اور ایک دولت مند مقامی زمیندار راحت علی کی ملاقات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ زمیندار کچھ دنوں سے حکومت کے خلاف جدوجہد کے لیے مشہور تھا۔ یہ ملاقات ستمبر ۱۸۴۵ء میں واقع ہوئی اور پیر بخش کے بیان کے مطابق ملاقات کا مقصد راحت علی سے کچھ قرض لینا تھا۔ دونوں کے مشترک دوست نے راحت علی سے اس کی سفارش کی تھی۔ سازش کے اصل منتظمین میں سے ایک سیف علی بھی وہاں موجود تھا۔ جس کا پیر بخش سے تعارف کرایا گیا۔

---

[1] بہرحال بعد کی ایک چٹھی میں پٹنہ کے مجسٹریٹ کی طرف سے حکومت بنگال کے سیکریٹری کے نام نمبر ۶۸ مورخہ ۳۰ جنوری ۱۸۴۶ء میں اختلافی بحث کی گئی ہے۔

[2] واقعات کا یہ بیان پیر بخش کے اظہار پر مبنی ہے جو دفعہ ۵ ۱۸۴۰ء کے تحت ۷ مارچ ۱۸۴۶ء کو سازش میں ملوث تھا۔

اس تعارف کی بنا پر سیف علی آیندہ دسمبر میں کچھ کتابیں فروخت کرنے کے بہانے سے پیر بخش سے ملا مگر اس نے سیف علی سے کوئی واسطہ رکھنے سے انکار کیا۔ (اس بیان میں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا ہو گا کہ پیر بخش سرکاری گواہ بن گیا تھا اور اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا) بعد میں سیف علی نے پیر بخش کا سازش کے ایک دوسرے اہم منتظم خواجہ حسن علی[1] سے تعارف کرایا۔ پٹنہ میں خواجہ کے مکان کی بالائی منزل پر ان تینوں کی ملاقات ہوئی۔ ان کے درمیان گفتگو بڑی حقیقت کشا اور مکرّرات سے پُر ہے۔ خواجہ نے منشی سے اپنے تقرر کی شرائط، تنخواہ وغیرہ کے متعلق سوالات کیے۔ اس کے بعد بولا "منشی جی ہندوستان دارالحرب (وہابی نظریہ سے) ہو گیا ہے۔ قید خانوں میں کیا کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہیں... بمبئی کے مجسٹریٹ نے مسلمانوں کے مکّہ[2] جانے کا راستہ بند کر دیا ہے۔" اس پر منشی نے خواجہ کے ارادے دریافت کیے خواجہ نے جواب دیا کہ میں ان لوگوں سے تعارف چاہتا ہوں جو فوج میں بلند مرتبہ ہیں جیسے صوبے دار اور جمعدار منشی نے خواجہ کو ایسے باغیانہ منصوبوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر خواجہ نے ایک آدمی سے ایک سو روپے ایک رومال میں باندھ کر لانے کو کہا اور منشی کو دے دیا۔ اُس نے اسے سیف علی کے پاس جمع کر دیا۔ اُس نے منشی سے کہا کہ رجمنٹ کے سرداروں کو راضی کرے کہ وہ ہم سے معاملہ رکھیں۔ اور ابھی کسی سپاہی کو خبر نہ کریں۔ اُس نے اسے بھی ایک سو روپے ایک کپڑے میں بندھے ہوئے دیے۔

خواجہ حسن علی کی ہندوستانی فوجوں کو پیشکش

منشی نے پوچھا آیا دوسری رجمنٹوں سے معاملہ

---

[1] وہ کئی سال تک ریاست گوالیار میں ملازم رہا، اور کچھ عرصہ تک کلکتہ میں ریاست کا وکیل (ایجنٹ) رہا۔ پیر بخش کا بیان ہے کہ "وہ ایک بوڑھا آدمی ہے، بال سفید ہیں، داڑھی رکھتا ہے قد اوسط ہے، نہ موٹا ہے نہ لاغر، رنگ گندمی ہے۔" [2] اس زمانے کے قریب ایک حاجیوں کا جہاز قرنطینہ میں روک لیا گیا تھا اس سے یہ افواہ پھیلی کہ حکومت ارادے حج میں مزاحم ہے۔

کرنے کی ایسی ہی کوششیں کی گئی ہیں؟ خواجہ نے کانپور، بنارس، الہ آباد، سگولی (ضلع چمپارن) اور ڈورنڈا (ضلع ہزاری باغ) کو بتایا کہ یہ وہ مقامات ہیں جہاں یہ لوگ کام کر رہے ہیں اس نے یہ بھی کہا کہ اگر رجمنٹ کے سردار یہ "ضیافت" قبول کریں تو میں ان کو ایک ماہ کی تنخواہ دوں گا۔ اور یہ کہ مجھ کو ایک کروڑ روپے تک خرچ کرنے کا اختیار ہے۔ میں سرداروں سے یہ نہیں چاہتا کہ ابھی ہماری طرف ہو جائیں اور جنگ کرنے لگیں بلکہ یہ کہ جب بغاوت ہو جائے تو وہ ہماری طرف ہوں۔ اس سے پوچھا گیا آیا آپ کانپور تک کے انتظامات کے ذمہ دار ہیں۔ یا اس سے آگے تک کے؟ اس نے جواب دیا کہ کان پور سے آگے کا انتظام کار کوئی اور ہے۔ منشی نے کہا کہ رجمنٹ کا پنڈت درگا پرشاد آپ لوگوں کا مقصد بہتر طور پر انجام دے سکتا اور سرداروں سے آپ لوگوں کے تعلقات قائم کر دے سکتا ہے اتب سیف علی نے پیر بخش سے کہا کہ پنڈت سے اس کا تعارف کرا دے۔ اس طرح پہلی ملاقات ختم ہوئی۔ منشی نے اس معاملہ کا ذکر درگا پرشاد اور بھیکھن جمعدار سے کیا۔ اول الذکر نے سرداروں سے باتیں کرنے کا وعدہ کیا۔ پیر بخش پھر راحت علی سے کچھ دسنگرداں لینے کے بہانے سے ملا۔ (ورنہ اس سے اپنی بار بار ملاقات کی توجیہ کیا کر سکتا تھا) وہ سیف علی سے بھی ملا اور اس سے کہہ دیا کہ میں نے تم لوگوں کا پیغام سرداروں تک پہنچا دیا ہے۔ اس لیے سیف علی دانا پور تک اس کے ساتھ گیا اور حوالدار میجر کو بلانے کو کہا۔ اس کے آنے پر اسے اس نے پچھتر روپے دیے جو اس نے قبول نہیں کیے۔ پنڈت بھی آگیا اور کہا کہ "میں نے بڑی جد و جہد کی۔ کچھ آدمی راضی ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ نہیں۔" سیف علی نے پنڈت کو دس روپے دیے اور مزید انعام، چالیس برہمنوں کا بھوج اور ہر ایک کو دس دس روپے کا نقد نذرانہ دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد سیف علی واپس پٹنہ آگیا۔

منشی پیر بخش کی گرفتاری

دو ہفتے کے بعد پنڈت پیر بخش کے پاس آیا اور اسے مطلع کیا کہ "سرداروں نے روپیہ لینا منظور کر لیا ہے چوتھی کمپنی کے موتی مسرا جمعدار اور رام سروپ صوبہ دار گیا جا رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حصے پٹنہ میں گول گھر کے قریب ادا کر دیے جائیں۔" پنڈت نے پیر بخش سے کہا کہ

پٹنہ جاکر سیف علی سے ملے اور روپے کا بندوبست کرے۔ سیف علی منشی کو خواجہ کے گھر لے گیا اور وہاں سے اُسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کے بعد دو سو روپے اٹھا لایا اور حوالدار کی تنخواہ کی پوری رقم (بیاسی روپے دو علیحدہ علیحدہ رومالوں میں رکھے اور دونوں دو علیحدہ علیحدہ یکوں میں گول گھر کی طرف چلے۔ وہاں پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ دونوں سردار مجسٹریٹ سے ملنے گئے ہیں۔ سیف علی اور منشی وہاں پہنچے اور احاطہ کے پھاٹک پر انتظار کرنے لگے۔ وہ باہر نکلے تو پیر بخش نے ان کے روپے دے دیئے (ان دونوں نے میجر رد کرو فٹ سے منصوبے کا افشا کر دیا تھا۔ اور اس کی ہدایت پر روپے لے رہے تھے۔ پیر بخش جس وقت یہ بیان دے رہا تھا اُس کو یہ بات معلوم نہ تھی) تب پیر بخش اور سیف علی دانا پور لوٹ آئے۔ وہ بھیکن جمعدار بھی پہنچا اور اپنا حصہ طلب کیا چنانچہ اُس کو تئیس روپے دیے گئے۔ اس کے بعد پنڈت نے سیف علی سے کہا کہ ایک صوبہ دار کیول تیواری اپنے پانچ سرداروں کے لیے روپے طلب کر رہا ہے۔ رقم سیف علی کے پاس اُس وقت موجود نہ تھی اسے لانے کے لیے پٹنہ واپس گیا۔ اس اثنا میں پیر بخش کو جس کی کیول تیواری سے کچھ ان بن تھی اسی کی طرف سے کچھ دھوکے کا شبہ ہو گیا۔ اور آدھی رات کو سیف علی کو کہلا بھیجا کہ کیول تیواری غالباً ہم سب سے غداری کرنے والا ہے۔ سیف علی نے پیر بخش کو بلا بھیجا مگر وہ نہ آیا۔ کیول تیواری نے اپنے اور منشی کے لیے روپے کی ادائی پر اصرار کیا۔ مگر پنڈت نے کسی نہ کسی عذر کی آڑ لے لی۔ اس کے فوراً بعد دوسرے اتوار کو متوقع ضرب آپڑی اور منشی گرفتار ہو گیا۔

خواجہ حسن علی کی رہائی

بہار کے دوسرے مقامات میں متعین رجمنٹوں کے اغوا کے متعلق کچھ مزید معلومات ان کاغذات سے فراہم ہوتی ہیں۔ مثلاً پیر بخش نے اپنے ایک سابق بیان میں کہا تھا کہ چھیاسٹھویں N.I.O بھی روپیہ لینے پر راضی ہو گئی تھی۔ ساتویں ریگولر کیولری (رسالہ) متعینہ سگولی (ضلع چمپارن) کو بھی گوٹ گشت (پٹنہ سٹی کے داروغہ) باقر علی کی معرفت ٹٹولا گیا ہے۔ کمپنی کے سولہ (ساٹھ) اور ایک سو ایک روپے جو دیسی افسران ریگولر کیویلری کے پرائیویٹ کی تنخواہوں کی مساوی رقوم

تھیں راحت علی کے مکان میں ایک کپڑے میں بندھی ہوئی پائی گئیں۔

سازش کی شکست وریخت کے بعد کے ملبے اور اس کے بعض نمایاں ناظموں کی تاریخ مابعد بھی دلچسپ ہیں پیر بخش منشی سرکاری گواہ ہو گیا اور اسے معافی مل گئی۔ دُرگا پرشاد پنڈت اور بھیکھن جمعدار کا کورٹ مارشل ہوا۔ یہ سب مجرم قرار دیے گئے۔ ہر ایک کو تین سال کی قید سخت اور ملازمت سے برطرفی کی سزائیں دی گئیں۔ کمانڈر انچیف کی مداخلت پر جس نے ان سزاؤں کو خفیف تصور کیا یہ سزائیں اور بڑھا دی گئیں۔ پنڈت کو موت کی اور جمعدار کو حبس دوام کی سزائیں دی گئیں۔ کرشمہ تقدیر سے کمانڈر انچیف نے پھر مداخلت کی اور پہلی سزاؤں کو قائم رکھا۔ چونکہ پیر بخش نے اپنے پہلے بیان میں ترمیم کر دی جس سے راحت علی سازش کی شرکت سے صاف بری ہو گیا اس لیے راحت علی بری کر دیا گیا۔ خواجہ حسن علی قریب ایک سال تک روپوش رہا اور حکومت کی انتہائی کوشش پر بھی اُس کا پتا نہ مل سکا۔ آخر اکتوبر ۱۸۴۶ء میں وہ حاضر عدالت ہو گیا اور اُس پر مقدمہ چلا۔ لیکن اہم گواہ استغاثہ پیر بخش نے اس کو شناخت کرنے میں وہی شخص تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس سے وہ حسب بیان سابق ملا تھا۔ حکومت اس کو بری کرنے پر مجبور ہو گئی پرنٹنڈنٹ پولیس کو یقین تھا کہ پیر بخش کو روپے سے خرید لیا گیا۔ مگر گورنمنٹ کچھ نہ کر سکتی تھی اور وہ پاک صاف نکل گئے۔

وہابی تحریک میں پٹنہ کی اہمیت

سیف علی تماشا گاہ سے غائب ہو گیا۔ اور جب اس سے اس کے بارے میں کچھ سُنا نہ گیا۔ اب ہم سازش کو صحیح عینک سے جانچتے ہیں اور اس کے خاص خاص ناظموں کے سابق حالاتِ زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سازش کوئی علیحدہ واقعہ نہیں۔ اس کی شاخیں بہار سے باہر تک پہنچتی تھیں۔ یہ مبنی تھی قسم قسم کے دُور رس شبہات اور بے چینیوں پر جو صوبے میں پھیلی ہوئی تھیں اور جن کو بہار میں اور باہر حکومت کے کچھ مخالف بے چینی پھیلانے والے بڑی ہوشیاری سے کام میں لائے۔

پٹنہ وہابیوں کا ایک مشہور مرکز تھا جس کی خلاف حکومت کارروائیاں مدت سے

جاری تھیں۔ ٹیلر نے ۱۸۵۷ء کے فساد پر لکھتے ہوئے مقامی وہابیوں کو ان کی منضبط باقاعدہ تنظیم اور تربیت یافتہ اور بے غرضانہ رُخ اور تیور سے اُن بادلوں میں شمار کیا ہے جہاں سے اُسے طوفان بلا کی توقع ہے کیا ممکن ہے کہ ایسا پرانا مخالفِ حکومت طبقہ ایسی سازش سے جو ٹھیک ان کے صدر مقام میں جنم پا رہی ہو کنارہ کش رہتا؟

کمشنر پٹنہ کی رپورٹ

اس خیال کو سلبی و قیاسی طرزِ فکر کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے اب ہم زیادہ قطعی اور ایجابی دلائل کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ واقعات کے غائر مطالعہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ سازش دو حصوں میں منقسم تھی: (۱) مقامی بے چینی (۲) اس کا رُخ حکومت کے خلاف شورش کی طرف پھیر دینا اور اسے فوج کے ہندوستانی سپاہیوں تک پہنچا دینا۔ اس موضوع پر اکثر مصنفین نے اس اہم پہلو کی غلط تاویل و تعبیر کی ہے۔ بہرحال معاصر حکام کی نظر کے سامنے دونوں پہلو نمایاں اور صاف تھے۔ پٹنہ کے کمشنر[1] نے لکھا کہ "مخبر جو کہا جاتا ہے کہ کلکتہ سے ستلج تک فوج کے ایک ایک ڈویژن میں بھیجے جاتے تھے قدرتاً ان کو بے چینی کے تمام اسباب کا پتا لگانا تھا تاکہ ان کا خمیر اٹھایا جا سکتا اور ایسے لوگوں سے شناسائی پیدا کی جاتی جو اپنی سازشی افتادِ طبیعت سے ہماری طاقت کے اُلٹنے اور پامال کرنے میں معین ہوتے۔ مسلمانوں کو یہ سبز باغ دکھایا جاتا کہ تختِ دہلی پر دوبارہ خانوادۂ تیموری کا جلوس ہوگا اور ہندوؤں کے سامنے عیسائی بنائے جانے کا ہوا کھڑا کیا جاتا۔ راحت علی مخالفِ حکومت رجحان کا بالکل ایسا ہی مقامی آدمی تھا۔ اس نے بہت پہلے ۱۸۲۹ء میں ایک شخص عبداللہ نامی کے ساتھ افسر بازیابی ایلیٹ کی عدالت میں بازیابی کی کارروائیوں کی سختی کے خلاف ایک تنظیم کا آلہ کار تھا۔ اس لیے شمالی مغرب کے لیے دوسرے فریق کے مخبروں نے

---

[1] کمشنر پٹنہ کی چٹھی سیکریٹری حکومت بنگال کے نام۔ نمبر ۲-۱۰ مورخہ ۸ جنوری ۱۸۴۶ء۔

اسے مقامی رشد کا یا ارکان کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ سیف علی دوسری پارٹی یعنی سازش میں باہر کی پارٹی کی نمائندگی کرتا تھا جو مقامی سرداروں اور باہر (شمالی مغرب) کے ناظموں کو باہم مربوط کرنے والی کڑی تھی۔ یہ حقیقت کہ آخر الذکر ٹولی ہی سازش کی اصل منظم تھی تفتیش کنندہ پولیس افسر کی اس تصدیق سے ثابت ہو جاتی ہے کہ سازش کا منصوبہ ان کے مخبر سیف علی کے ساتھ اوپر سے آیا تھا۔ اس سازش کا وہ روح رواں تھا۔ اسی نے فوجی سپاہیوں سے رابطہ پیدا کرنے کی پہلے پہل تجویز پیش کی، بار بار رجمنٹل احاطوں میں گیا اور نقد روپیہ کا معاملہ کیا، مجسٹریٹ نے بھی اس کارنامے میں اس کے نمایاں حصہ کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے لکھا کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے منشی (پیر بخش) کے کان میں یہ آواز ڈالی اور جس نے اس کا تعارف خواجہ سے کرایا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ رائے زنی بھی کی کہ اگر سیف علی گرفتار ہو جاتا تو اس معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی۔

سیف علی

اب سوال یہ ہے کہ سیف علی تھا کون؟ سپرنٹنڈنٹ پولیس جس نے سیف علی کا مبہم سا پتہ دیا تھا کہ وہ شمال مغرب کی طرف سے کارپرداز تھا۔ بعد میں اپنی چٹھی مورخہ ۱۷ مارچ ۱۸۴۶ء میں زیادہ معین اور اہم خبر دی ہے جس سے اس موضوع پر تمام مصنفین کی نظر چوک گئی، وہ یہ ہے کہ سیف علی مشہور مسلمان سردار امیر خاں کے بیٹے کا ایجنٹ ہے جو اب ٹونک کا جاگیردار ہے۔ سیف علی کی تشریح سے جو پیر بخش کے متذکرہ بالا بیان میں دی گئی ہے۔ مطابقت رکھتی ہے جس میں اسے ایک حکمران شہزادے کا ایجنٹ بتایا ہے۔ پیر بخش نے اس کو ایسا بتایا ہے جو بہت اچھا تعلیم یافتہ اور حساب و کتاب سے واقف ہے ایک سوال کے جواب میں کہ آیا سیف علی ایک ذمہ دار اور باوقعت شخص ہے پیر بخش نے کہا کہ "وہ ایک خوش رو جوان، صورت شکل سے شریف، خوش لباس سیاہ ڈاڑھی مونچھوں والا کشیدہ قامت ہے۔" وزیر الدولہ اور اس کے لیے ان کی بیش بہا خدمات اور سرپرستی محتاج تشریح نہیں۔ اگر ایک دفعہ یہ اصل حقیقت ذہن نشین کر لی جائے تو ان کاغذات کے تمام مبہم اشارات واضح ہو جائیں مثلاً شمال مغرب[1]

---

[1] یہ خود بخود مان لیا گیا ہے کہ شمال مغرب کے ذکر سے پنجاب مراد ہے جہاں (رباتی ص ۲۰۷ پر)

سے مجبروں کا ذکر، راحت علی کے پیر بخش کے نام خط میں قرآن مجید کی آیات "اپنے گھروں سے ہجرت کر جاؤ، اللہ کی راہ میں جہاد کرو" اور ایک خط میں مشہور فارسی تصنیف انوار سہیلی سے بعض نصائح ۔ یہ سب بے شک و شبہ وہابی مصطلحات ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے برعکس فوری طور پر شورش پر زور نہیں دیا گیا بلکہ ضرورت پڑنے پر اگر عملی اعانت حاصل نہ ہو تو خاموش بیٹھنے پر۔ یہ امر بھی وہابی حکمت عملی سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف صاف اشارے ہیں کہ سازش بہار سے آگے اور لوگ کانپور سے آگے اس کا بندوبست کر رہے تھے۔" اور یہ دوسرے لوگ صرف وہابی ہی اپنی ہندوستان گیر انگریز دشمن جدوجہد کے پھیلے ہوئے جال سے ہو سکتے تھے۔

راحت علی

اس سازش میں دوسری خاص شخصیت راحت علی کی تھی۔ وہ صدرالدین سلامت علی کا بیٹا اور قصبہ نیورا[1] ضلع پٹنہ کا باشندہ تھا۔ ہم یقینی طور پر نہیں جانتے آیا وہ وہابی تھا لیکن اس کے بعض قریبی قرابت مندوں کے مندرجہ ذیل حالات یہاں معاون ہوں گے۔ ۱۸۶۸ء میں داناپور کا ایک شخص محمد عمر ایک نمایاں وہابی سردار کی حیثیت سے گرفتار کیا گیا تھا جو حکومت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۶) انگریزوں اور سکھوں کی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور یہ اس زمانے کا مہتم بالشان واقعہ تھا۔ بہرحال ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ٹھیک وہی زمانہ تھا جب کہ برادران علی ہزارہ میں انگریز سکھ فوج سے نبرد آزما تھے۔ کیا ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ پلٹ کر اپنے وطن ہی میں شورش پیدا کر دیں جہاں حکومت کے خلاف ایک منظم جماعت پر ان کا دسترس تھا۔

[1] وہ نیورا کا ایک وقیع زمیندار اور سر علی امام مرحوم کا رشتہ دار تھا۔ اس کا تعمیر کردہ اینٹ کا ایک مینارہ توپ لگانے کے سوراخوں کے ساتھ اب تک نیورا میں موجود ہے۔

تفتیش کے دوران میں حکومت کو معلوم ہوا کہ وہ راحت علی کا بھانجہ ہے۔ راحت علی کے پچھلے حالات اچھی طرح معلوم تھے اس لیے محمد عمر کے قرابت مندوں کے حالات کی پوری چھان بین کی گئی اور معلوم ہوا کہ راحت علی کے تین بہنیں تھیں۔ ان میں ایک کی شادی امداد علی صدر امین ترہت سے ہوئی۔ اس کے دو بیٹے تھے، نجم الدین اور وحید الدین۔ اول الذکر کچھ عرصہ تک پٹنہ افیم گودام کا سررشتہ دار رہا، بعد میں راجہ بیتیا کا دیوان ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں ٹیلر نے اسے حکومت کے خلاف مشتبہ شورش انگیز کی حیثیت سے گرفتار کر لیا۔ اس کی دوسری بہن کے بیٹے فرزند علی وکیل عدالت دیوانی چھپرہ، منشی اسماعیل اور عبدالکریم عملہ عدالت جج پٹنہ اور عبدالوہاب تھے۔ تیسری بہن کے بیٹے کا بیٹا وہابی قائد محمد عمر تھا۔ اس کے دو بھائی محمد یحییٰ منصف پٹنہ اور صادق عدالت جج پٹنہ کے محافظ دفتر تھے۔ ان سب پر وہابیوں کے عملی ہمدرد ہونے کا شبہ تھا۔ الغرض راحت علی کے اکثر قرابت دار حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے اور ان پر پہلے سے حکومت کے خلاف کارروائیوں کا شبہ تھا۔ ۱۸۷۰ء میں واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ ان میں سے اکثر وہابی تھے۔

سازش ۱۸۴۵ء کے بانی

آخر میں ہم جی بی مالیسن کی اس موضوع پر تحریر پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ وہ اس سازش کو صاف صاف وہابیوں کی کارستانی بتاتا ہے۔ بہار میں بے چینی کے متفرق مقامی اسباب کی تنقیح اور پٹنہ میں وہابیوں کی کارروائیوں کا جائزہ لیتا ہوا وہ اپنی تصنیف کے ایک اور مقام پر وہابی جدوجہد اور ۱۸۴۵ء کی سازش کے باہمی تعلق کو زیادہ صاف عیاں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "سازشیوں کا ایک جتھا (پٹنہ میں ۱۸۴۵ء میں) ایک سازش کو جنم دے رہا تھا جب کہ سپاہیوں کو نقد رقمیں تقسیم کی جاتی تھیں، ایک کاغذ ہاتھ آیا تھا جس میں ایک سو خاص خاص خاندانوں کے نام درج تھے۔ ان میں ایک شہر (پٹنہ) تھا جو پیغمبر اعظم (سید احمد) کے دو نامور خلیفوں (برادران علی) کا صدر مقام تھا[1]"

---

[1] جی بی مالیسن جلد ۱ صفحہ ۴۷ ۵ - ۵۰

ان تمام معنی خیز امور کے پیشِ نظر جن کا ان کے صحیح سیاق و سباق میں اب تک جائزہ نہیں لیا گیا یہ واضح ہے کہ ۱۸۵۷ء کی سازش کے اصلی منظم وہابی ہی تھے۔

اہم خطوط کی ضبطی

وہابی پھر ۱۸۵۳ء میں ہندوستانی افواج کی وفاداری میں خلل اندازی کی کوشش میں نمایاں کردار تھے۔ اس بار یہ کوشش شمال میں راولپنڈی کے قریب کی گئی۔ راولپنڈی میں تعینات چوتھی دیسی پیدل فوج کے ایک رجمنٹل منشی محمد ولی کے گھر سے متعدد خطوط ضبط کیے گئے۔ منشی نے اپنے تئیں سید احمد کا مرید ہونے کا اقرار کیا۔ خطوط کا یہ پلندہ جو اُس سے برآمد کیا گیا اور جو وہابیوں کے عام طرزِ تحریر میں لکھا ہوا تھا اس میں کئی ستھانہ کے اکرام اللہ کی طرف سے دیگر ٹولی[1]... پٹنہ سٹی کے حسین علی خاں کے نام سے تھے۔ ان خطوط میں ہندوستان سے سوات میں رضاکاروں کی آمد کی خبر ہے اور آیندہ سرحد کو آنے والوں کی رہنمائی کے لیے مفصل ہدایات ہیں۔

عباس علی کی گرفتاری

ان ضبط شدہ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی اور اسلحہ میرٹھ اور لدھیانہ کے راستوں سے سوات بھیجے جاتے تھے۔ اسلحہ میرٹھ میں قاضی محمد یاسر فراز علی کے پاس امانت رکھ دیے جاتے۔ اور لدھیانہ کا ایجنٹ عباس علی تھا جو مقامی مسجد عبد القادر کی مسجد کے قریب رہتا تھا۔

ڈپٹی کمشنر راولپنڈی نے پٹنہ اور میرٹھ کے مجسٹریٹوں کو اور ڈپٹی کمشنر لدھیانہ کو لکھا کہ اُن اشخاص کے گھروں کی تلاشی لیں جن کے نام ان کے اپنے اپنے علاقوں کے تحت درج ہیں، اور ان کے قبضے سے جو کاغذات برآمد ہوں وہ ضبط کر لیے جائیں۔ لدھیانہ کے عباس علی کو گرفتار کر لیا گیا اور کچھ مزید خطوط اس کے قبضے سے دستیاب ہوئے جن سے ایک شخص ابو عبد الرحیم ساکن پٹنہ کا ملوث ہونا ثابت ہوتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر لدھیانہ فلپ گولڈنی نے بھی پٹنہ کے مجسٹریٹ کو لکھا کہ اس شخص کے بارے میں تفتیش کرے جو "سوات کے قائدوں سے تعلق رکھتا تھا۔"

---

[1] یہ صادق پور پٹنہ سے متصل ایک چھوٹا سا محلہ ہے۔

حسین علی کی خانہ تلاشی

چنانچہ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے تحقیقات کی اور حسین علی کے گھر کی تلاشی لی۔ مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ تحقیقات غلط تھی، کیونکہ حسین علی تو محض احمد اللہ کا ایک خانساماں تھا اور اُس کے گھر کا پتا صرف پردہ داری کے لیے لکھا گیا تھا۔ اصل مکتوب الیہ احمد اللہ ہی تھا۔ مجسٹریٹ کو اس کے گھر کی تلاشی لینے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اس کام کے لیے بہرحال اُس کو فوجی اعانت کی ضرورت تھی۔

احمد اللہ کی دھمکی

احمد اللہ کو اپنی متوقع گرفتاری کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ ان کو یہ خبر لاہور کے ایک حکیم سے ملی تھی جو راولپنڈی سے آنے والے خط سے دو روز قبل پٹنہ پہنچا تھا[1] چنانچہ سارے کاغذات تلف کر دیے گئے۔ مجسٹریٹ نے آگے چل کر یہ رائے زنی بھی کی کہ "شہر میں یہ گروہ بڑھتا جاتا ہے۔ ہر جمعہ کو جلسے (خطبے) ہوتے جن میں اس فرقہ کے عقائد کی وضاحت کی جاتی اور نئے لوگ اس میں داخل ہوتے۔"

زیادہ مخدوش بات یہ تھی کہ احمد اللہ نے کوئی پانسو آدمی جمع کر لیے تھے اور علانیہ کہہ دیا تھا کہ اگر حکومت نے ان کی سرکوبی کے لیے کوئی سخت اقدام کیا تو میں بغاوت کا علم بلند کر دوں گا۔ صورت حال ایسی مخدوش ہو چکی تھی کہ حکومت کو توجہ کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ ابو عبدالرحیم کے متعلق جس کا ذکر گولڈ نے کئی چٹھیوں میں کیا ہے مجسٹریٹ نے لکھا کہ ایسا کوئی شخص موجود نہیں۔ مگر اس کو یہ شک ہو گیا کہ وہ ملوث شخص ولایت علی کے بڑے بیٹے عبداللہ ہیں اور شخص اول الذکر محض ایک نابینا شخص ہے۔

پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (مجلس انتظامیہ) یا حکومت بنگال، کسی نے بھی اپنے ماتحت ملکی افسروں کے خدشہ سے اتفاق نہیں کیا۔ لفٹننٹ گورنر بنگال نے صرف متذکرہ بالا روداد مورخہ ۲۶ اگست ۱۸۵۲ء کے لکھنے پر اکتفا کی۔ حکومتِ ہند کے

---

[1] اس سے سرکاری دفاتر میں وہابی سازشیوں کی موجودگی اور ان کی تنظیم کے چوکس رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔

سیکریٹری نے پنجاب کے بورڈ آف ایڈ منسٹریشن (مجلس انتظامیہ) کے نام ایک علیحدہ چٹھی میں مذکورہ روداد میں مندرج جذبات کا اعادہ کرتے ہوئے مزید لکھا کہ پٹنہ بے شبہ ہندوستان کے وہابیوں کا صدر مقام ہے۔ وہاں سے خطوط ملے ہیں۔ رضا کاروں کی ٹولیاں وہیں سے سرحد کی نوآبادی کو روانہ ہوتی ہیں۔ گورنر جنرل با جلاس کونسل نے یہ ہدایت بھی کی کہ چوتھی۔ N.I (دیسی پیدل فوج) نے رجمنٹل منشی[1] کو ایک مثال سمجھنا چاہیے جو حکومت کے خلاف مراسلت کا واسطہ بنا رہا ہے۔

شمالی ہند میں وہابی تحریک

یہ حقیقت کہ وہابیوں کی متذکرہ بالا کارروائیاں ویسی بے ضرر نہ تھیں جیسی کہ گورنر جنرل با جلاس کونسل ہمیں یقین دلانا چاہتے تھے ان مہموں سے ظاہر ہے جو ان کے فوراً بعد ہی ۱۸۵۲ء میں قبیلہ حسن زئی اور وہابیوں کے خلاف بھیجی گئیں۔ ہنٹر راولپنڈی میں اس اقدام کی معنویت کا صحیح انداز لگاتا ہے۔ وہ رقم طراز ہے کہ "۱۸۵۲ء میں ہماری افواج کے ساتھ باغیانہ مراسلے پنجاب کے حکام نے پکڑے تھے۔ چوتھی دیسی پیدل فوج متعینہ راولپنڈی کو جو ان شورشیوں کی نوآبادی سے بہت قریب ہے اور پہلی رجمنٹ ہے جو ہمارے صوبہ پر دھاوا کرکے ان کے خلاف کارروائی کرنے کو بھیجی جاتی، اسے ورغلانے کو ایک عیارانہ کوشش کی گئی تھی۔"

پشاور میں وہابیوں کے خطوط کی ضبطی

۱۸۵۷ء میں دوسری کوشش پشاور میں کی گئی۔ ایک بار اور پٹنہ کے کچھ وہابیوں کے باغیانہ خطوط پشاور میں متعین چوسٹھویں دیسی پیدل فوج کے نائب شیخ کریم اللہ کے قبضے سے پکڑے گئے۔ وہ شیخ قدرت اللہ ساکن ارکی ضلع گیا کا بیٹا تھا۔ اس کے بہت سے رشتہ دار فوج کے متفرق عہدوں پر مامور تھے۔ اس کے قبضے سے جو خطوط برآمد ہوئے وہ ایک شخص نتھو کے لکھے ہوئے تھے۔ یہ سب خطوط ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع

---

[1] معلوم نہیں اس منشی کو کیا سزا دی گئی۔

پر لکھے گئے تھے۔ کریم اللہ ان کو ستھانہ کے وہابیوں تک پہنچا دیا کرتا اور اپنے لوگوں میں ان کے پیغام پھیلا دیا کرتا۔ ان خطوط کے ترجمے اور خلاصے کاتبوں کا پتا لگانے کے لیے پٹنہ بھیج دیے جاتے۔

ہزارہ کے سیاسی حالات

ان واقعات پر اُس وقت ہزارہ کی سرحد پر سیاسی حالات کے پس منظر میں نظر کرنا چاہیے۔ منظر اگرچہ بظاہر ساکن اور خاموش نظر آتا تھا مگر تھا تاریک اور خطرناک یہ ضلع قبیلہ یوسف زئی کے علاقہ کی سرحد پر واقع تھا جہاں ہیجان کا خمیر اُٹھ رہا تھا۔ سوات کا بے دخل کیا ہوا سردار مبارک شاہ جو انگریزوں سے آزردہ تھا۔ پڑوسی علاقہ پنج تار میں مقیم تھا۔ اس کے قریب ہی منگل تھانہ وہابیوں کا صدر مقام تھا۔ ولایت علی ۱۸۵۲ء میں وفات پا چکے تھے اور ان کے چھوٹے اور زیادہ متہور بھائی عنایت علی وہابیوں کے قائد تھے۔ یہ ۱۸۵۷ء کے واقعے سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں پر جب کہ وہ دوسرے علاقوں کی پریشانیوں میں الجھے ہوئے تھے سخت حملوں کے لیے بے چین تھے۔ اس کی تیاری میں اُن دیسی فوجوں میں جو آس پاس میں متعین تھیں گھس بیٹھ اور مداخلت کی چالوں میں تیزی سے مصروف کار تھے۔

جنگ ۱۸۵۷ء

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت تک ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کی شورش اُٹھ چکی تھی اور اس کے شعلے تیزی سے ایک چھاؤنی سے دوسری تک پھیل رہے تھے۔ پشاور ڈویژن کی مخصوص صورت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی عام تحریک اور وہابی تحریک کے علیحدہ علیحدہ اثرات بیک وقت اپنا اپنا کام کر رہے تھے، اور ان کا ردّ عمل مختلف شعبوں پر مختلف تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نازک وقت میں واقعات کا رشتہ بہت اُلجھ گیا تھا اور اکثر اوقات اُس زمانہ کے حالات پر وہابیوں کے اثر سے انکار کیا گیا ہے۔ لیکن واقعات کے غائر مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ دونوں اثرات جدا جدا کام کر رہے تھے۔ مثلاً اکاون ویں دیسی پیدل فوج کے سپاہی کارتوس کے معاملے پر بہت برافروختہ تھے[۱] اور اس سے وہابی کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ اور

---

[۱] رجمنٹ ۵۱ نے تمام ہیریٹ رجمنٹ (N ۱۰۶ ۴۸) کو ایک خط لکھ کر کارتوس کے (بقایا صفحہ ۲۱۳ پر)

بہت سی پلٹنیں خصوصاً پچپن ویں دیسی پیدل فوج کی (جس کے دستے مردان اور نوشہرہ میں تھے) پشاور کی انہترویں دیسی فوج اور دسویں اور ریگولر رسالہ، یقینی طور پر وہابیوں کے زیر اثر تھے۔ اس ڈویژن کے واقعات پر اپنی رپورٹ میں ایڈورڈز رائے زنی کرتا ہے کہ پچپن ویں اور چوٹھویں دیسی پیدل پلٹنوں کے درمیان اور دسویں اور ریگولر رسالہ اور سوات اور پڑوس کے پہاڑوں کے ہندوستانی مذہبی دیوانوں کے درمیان ایک مدت سے سازباز جاری ہے اور مردان کلکٹری میں وہابیوں کے ایجنٹ دو ہندوستانی مولوی[1] ان جاسوسوں کے میزبان تھے جو ادھر سے اُدھر اُچکے پھرتے تھے۔

برطانوی وقائع نویسوں کا بیان

برطانوی مہموں کے دو مشہور وقائع نویس بیگیٹ اور میسن جو سرحد بھیجے گئے تھے وہ وہابی اثر کے متعلق اپنے اظہار رائے میں زیادہ صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ ضلع پشاور کا صرف ایک حصہ جہاں لوگوں نے ملک میں فتنہ پردازی کے لیے سپاہیوں کے غدر سے فائدہ اٹھایا وہ یوسف زئی کی سرحد تھا۔ اور یہ زیادہ تر ہندوستانی مذہبی دیوانوں کے دباؤ کی وجہ سے ہوا جن کو ہندوستان کے باغی حکمرانوں اور افراد کی طرف سے آدمی اور روپے کی امداد ملا کرتی تھی۔" پچپن ویں دیسی پیدل پلٹن نے اپنی چھاؤنی سے خارج ہونے کے بعد جو کچھ کیا اور جس کا بیان بعد میں ہوگا، اس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ

(بقیہ حاشیہ صتہ ۲۱۲) معاملے میں اپنے اضطراب کا اظہار کیا اور ان کو دعوت دی کہ ان سے آملیں (خط از ایچ بی ایڈورڈز کمشنر پشاور بنام آر مونٹگومری جوڈیشل کمشنر پنجاب ۶۴ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۸۵۸ء) ایڈورڈز اس خط کو نہایت قیمتی دستاویز بتاتا ہے کیونکہ اس "عذر" کے مسئلہ پر ایک رجمنٹ کا دوسری رجمنٹ پر کامل اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔

[1] جس رات ان دستوں سے ہتھیار چھین لینے کے لیے پشاور سے فوج آئی دونوں فرار ہوگئے۔ بعد میں ایک گرفتار ہوگیا۔ اور اسے پھانسی دی گئی۔

سیدھے سوات کی طرف چل پڑے اور وہاں سے وہابیوں کے صدر مقام منگل تھانہ چلے گئے۔

اکبر شاہ کا انتقال

بدقسمتی سے ٹھیک میرٹھ کی شورش کے دن وہابیوں کے زبردست حامی و مددگار شاہِ سوات اکبر شاہ کی ناگہانی اور بے وقعت وفات نے سیاسی پانسہ انگریزوں کے موافق پلٹ دیا۔ اگر صرف سواتی اپنے مذہبی پیشوا اخوند کے تحت پچپن ویں پلٹن کے سپاہیوں اور وہابیوں سے مل جاتے تو اغلبًا اور قبائلی بھی مل جاتے اور انگریز زیر ہو جاتے۔" مگر ہوا یہ کہ متوقع مدد اور تعاون کے عوض پچپن ویں پلٹن کے سپاہیوں کا زیادہ تر سوات کے آخوند کی عداوت سے ہر طرف مخالفت سے سامنا ہوا اور اس طرح کھدیڑے گئے کہ کچھ بے برگ و بار ویران پہاڑوں میں سر ٹکراتے ٹکراتے مر گئے، باقی اور لوگوں نے عنایت علی کے صدر مقام منگل تھانہ میں پناہ لی[1] ان کا مزید ذکر آئندہ باب میں ہو گا۔ الغرض ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع پر اور اس دوران میں برابر وہابی مستعدی سے سرحد پر انگریزوں کے خلاف مصروف کار رہے۔ انہوں نے علیحدہ کام کیوں کیا اور ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۹ء کی تحریک میں شامل کیوں نہ ہو گئے، اس کے اسباب ایک علیحدہ موضوع ہیں جن پر علیحدہ باب میں بحث ہو گی۔

---

[1] KAYE جلد ۲ صفحہ ۴۹۳ ۵۵ کے سوات سے خارج کیے جانے کے بعد ان کا سرگرداں مارے مارے پھرنا اور مقامی لوگوں کا ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک اس تحریک کی تاریخ میں بے شبہ ایک نہایت المناک حادثہ ہے۔

باب ۶

محاربات سرحد ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۳ء

معرکہ ۱۸۵۲ء سرحد پر وہابی معرکوں کا پہلا سلسلہ خود سید احمد کے زیر قیادت ۱۸۲۶ء میں چلتا رہا۔ بعض تاریخی اسباب سے جن پر علیحدہ علیحدہ باب میں بحث کی گئی ہے، ان معرکوں میں سے اکثر سکھوں اور سرحد کے بعض خیرہ سر سرداروں کے خلاف تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سید احمد ملک کے خطرے کی اصل جڑ، انگریز سے بے فکر تھے۔ ان کے بہت سے مکتوب[1] اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان پر یہ حقیقت روشن تھی کہ اصل جنگ انگریز سے ہونی ہے۔

معرکوں کا دوسرا سلسلہ حکومت برطانیہ کے خلاف کچھ بعد میں شروع ہوا، اور ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۳ء تک جاری رہا۔ اس عرصے میں کئی سخت خون ریز جنگیں ولایت علی، عنایت علی اور عبداللہ کی قیادت میں لڑی گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرحد پر وہابیوں کا یہ ننھا سا منبع ایسی طاقت کا حامل تھا۔ جو ایک سیاسی خطرہ بن گیا اور برطانوی حکومت کے لیے ۱۸۵۲ء سے بیس سال تک سخت پریشانیوں کا باعث بنا رہا۔

ہزارہ پر انگریزوں کا قبضہ پنجاب کے الحاق کے بعد ہزارہ کا علاقہ گلاب سنگھ سے علاقوں کے مبادلے کے بعد انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ اور ۱۸۴۹ء میں جیمس ایبوٹ اس کا پہلا ڈپٹی کمشنر ہوا۔ ایبوٹ نے سب سے پہلے اس

---

[1] ان میں سے بعض شائع شدہ مکتوبات میں "انگریز" اور "عیسائی" کے الفاظ کو "سکھ" سے بدل دیا گیا ہے۔ اور بھی تصرفات کیے گئے ہیں۔

علاقے میں ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کے ایک نمایاں آشیانے اور اس کی حرکات و سکنات کی طرف توجہ مبذول کی جو اس کے خیال میں دکن یا مغرب میں درانیوں کی کسی شورش کی صورت میں حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔

وادی کاغان پر انگریزوں کا قبضہ

اُس نے شمال میں وادی کاغان کے سادات سے بالخصوص وہاں کے ضامن خاں سے جو وہابیوں کا زیر دست حامی تھا۔ جھگڑے بھی مول لیے۔ بظاہر سادات کے خلاف جھگڑے کا سبب ان کے بعض گوجر اسامیوں کی ان کے مظالم کے خلاف شکایت تھی۔ مگر یہ محض ایک بہانہ تھا کیونکہ ابوٹ تحقیقات کے دوران میں صرف سادات کے دشمنوں کی داستان پر کان دھرتا تھا۔ اصل سبب یہ شبہ تھا کہ سادات وہابیوں سے سازباز رکھتے ہیں۔ یہ وہابی دوسرے قبائل جیسے ڈھونڈ وغیرہ کو انگریزوں کے خلاف عام شورش برپا کرنے کے لیے اکسا رہے تھے۔ ایک فوج جو چھ رجمنٹوں، اچھ توپوں اور بہت سے قبائلی زنگروٹوں پر مشتمل تھی سادات کے خلاف بھیجی گئی اور ان کو شکست دی گئی۔ ضامن خاں کو بے دخل کر دیا گیا اور وادی کاغان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

فوری مقصد حاصل ہو چکا تو ابوٹ اور اس کے بالادست افسروں کے درمیان ان علاقوں میں مزید اقدامات پر مناقشہ شروع ہوا۔

حسن زئی قبائلیوں کا سرحدی چوکیوں پر قبضہ

مہم کاغان کے فوراً بعد ۱۸۵۱ء میں انگریزوں کو کوہ سیاہ کی پہلی مہم کا بندوبست کرنا پڑا۔ اور یہ وہابیوں کے ساتھ پہلی مسلح آویزش کا باعث ہوئی۔ ہزارہ کا نظم و نسق ہاتھ میں لینے کے بعد انگریزوں نے اپنے مخصوص مکمل طرز پر پنجاب بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (مجلس انتظامیہ) کے مجموعی اختیارات کے تحت انتظامات کے متعدد محکمے قائم کیے۔ ان میں سے ایک محکمہ نمک کی سرحد پار سے درآمد کی نگرانی کرتا تھا محکمہ کے دو مقامی افسروں اکانک اور ٹیپے نے اُن راستوں کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لی جن سے ممنوع نمک آتا تھا۔ ان کو رپورٹ ملی کہ یہ سرزمین آمب کے اُس ماورائے سندھ

حصہ سے گزرتا ہے جو حسن زئی کے آزاد قبائلی رقبے کی سرحد پر واقع ہے۔ اپنی تفتیش و تلاش میں وہ آزاد حسن زئی رقبے سے خطرناک طور پر قریب جا پہنچے۔ یہ ڈھٹائی ان کے اعلیٰ افسروں کی واضح اور مبینہ مرضی کے خلاف تھی۔ انہوں نے اس کا خمیازہ بھگتا اور بعض نامعلوم قبائلیوں کے ہاتھوں جن پر حسن زئی ہونے کا شبہ ہے مارے گئے۔ یہ قتل لالچ اور لوٹ پر محمول کیا گیا۔ حالانکہ دراصل اقتصادی مقاصد کارفرما تھے حسن زئی کو گمان ہوا کہ یہ دونوں افسر ممنوع نمک کا راستہ ان کے رقبے تک وسیع کر کے ان کے نمک کی تجارت کو متاثر کر دیں گے۔ اس فعل کو انھوں نے اپنے وسیلۂ معاشی میں مداخلت اور ناجائز تصرف قرار دیا۔ پہلے انگریزوں نے آمب کے سردار جہاں داد خاں اور اس کے جاگیرداروں پر حسن زئی کے شریک کار ہونے کا شبہ کیا۔ اس لیے حسن زئی سے کہا گیا کہ ان تمام حسن زئی کو جو اس کی سرزمین پر آباد ہیں یرغمال کے طور پر انگریزوں کے حوالہ کر دے۔ جہاں داد خاں نے یہ مطالبہ مان لیا مگر اس سے حسن زئی مشتعل ہو گئے۔ اس پر حملہ آور ہوئے اور اس کی سرحدی چوکیاں چمبیری اور شنگلائی چھین لیں۔

کوہ سیاہ کی پہلی مہم

انگریزوں نے اپنے حلیف کو اس کرتوت کے نتائج سے جو انہیں کی مرضی سے اُسے انجام دینا پڑا تھا۔ بچانے کے لیے مداخلت کی اور اس طرح پہلی مہم کوہ سیاہ کا آغاز ہوا۔ کوہ سیاہ[1] کا سلسلہ ضلع ہزارہ کی شمالی مغربی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ شمال میں علاقہ اگردر سے اور جنوب میں تناول سے گھرا ہوا ہے۔ دریائے سندھ اور پہاڑ کی درمیانی ڈھلوان پر عظیم یوسف زئی قبیلہ آباد ہے یہ حسن زئی اسی کی ایک شاخ ہے۔ ابوٹ نے کارنگ اور ٹیپے کے قتل کے انتقام کے لیے مسلسل مطالبے کیے جو قبائل میں حکومت کا وقار برقرار رکھنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا، مگر گورنر جنرل باجلاس کونسل پہلے کسی ایسے اقدام سے متفق نہ تھا۔ اس لیے

---

[1] سرحد پر برطانوی مہموں کی تاریخ میں کوہ سیاہ اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کے ڈھلوان پر آباد قبائل کے خلاف یکے بعد دیگرے جلد جلد کئی گھمسان کی جنگیں لڑی گئیں۔

نہیں کہ وہ ان بھلے آدمیوں (کرنا ک اور بیٹی) کے انجام کو کوئی وقعت نہ دیتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ رپورٹ کی مجوزہ آویزشیں ہمیں بدتر حالت میں ڈال دیں گی" آخر بڑے تامل و تذبذب کے بعد اور کرنل میکیسن کے اصرار سے جو اس بارے میں ایبوٹ کا ہم خیال تھا۔ ایک فوج جو ہندوستانی فوج کے ایک دستے اور کچھ پولیس کی ٹولی پر مشتمل تھی (دسمبر ۱۸۵۱ء میں) تین کالموں میں ہزارہ کے خلاف روانہ ہوئی۔ یہ کوہ سیاہ پر چڑھ گئی، حسن زئی کو سزا دی اور ان کے گاؤں کو آگ لگا دی۔

اس فوجی مہم کی جس کے بارے میں حکام پہلے متامل تھے نسبتًا سہل کامیابی پر حکومت خود حیرت زدہ ہوگئی۔ اب وہی حکام کرنل میکیسن کی مدح سرائی سے تھکتے نہ تھے۔ وہ خود بھی اس سہل فتح یابی پر متحیر تھا اور کہتا تھا کہ "اس کا سہرا جہاں داد خاں کے سر ہے جس نے میرے بڑے وقت میں اتنی سہولت سے میری مؤثر امداد کی۔" ساتھ ہی وہ شبہ کا اظہار کرتا تھا آیا جہاں داد ہماری امداد کا مستحق ہے اور کب تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ میکیسن کا یہ قول غیبی اشارہ تھا، کیونکہ مہم حسن زئی سے واپس آنے کے بعد فوج ایک نئی مصیبت یعنی وہابیوں سے دوچار تھی۔

انگریزوں کے خلاف عنایت علی کی کوششیں

حسن زئی پر انگریزوں کے حملے سے فائدہ اٹھا کر

عنایت علی نے دوسرے قبائل میں اپنا کام شروع کر دیا۔ اُن کو رغبت دلائی کہ انگریزوں کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنے قبائلی بھائی حسن زئی کی اعانت میں جنگ کریں انھوں نے تمام سرحدی قبائل کی زیادہ وسیع ہمدردی حاصل کرنے کا یہ غنیمت موقع جانا۔ یہ اُن کے اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے بھی نہایت قوی اور ضروری ذریعہ تھا۔ جہاں داد خاں کے علاقے پر جو راستے میں پڑتا تھا ایک بار پھر حملہ کیا گیا اور اس کی مملوکہ چوکی کوٹلا پر قبضہ کر لیا گیا۔ مگر پہلے اور مواقع کی طرح اس بار بھی قبائل متحد نہ ہوئے۔ آخر یہ کام ہندوستانی رضاکاروں کے ایک گروہ پر چھوڑ دیا گیا جو انگریزوں کے زیر ستم ایک سرحدی قبیلہ کی مدافعت کے لیے بہار و بنگال کے دُور دراز ملکوں سے

آئے تھے۔ خود پڑوسی قبائل خاموش اور بے تعلق تماشائی بنے رہے۔ انگریزوں نے وہابیوں کو بھی حسن زئی کی امداد سے باز رہنے کی کوشش کی، مگر عنایت علی نے ان کی پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا، اور کہہ دیا کہ "میں تو مرنے ہی کو آیا ہوں۔" ایک بار پھر حکومت وہابیوں کے خلاف فوج بھیجنے میں متامل ہوئی۔ خود کرنل میکین نے اپنی ایک رپورٹ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۵۲ء بنام مجلس منتظمہ پنجاب میں لکھا کہ "میں نے بہت تامل کیا آیا کوٹلہ کے معاملہ میں کوئی مداخلت کروں۔ صرف وہ علاقہ دیکھ کر جس کو بار بار بہ حفاظت مطیع کرنے کی طرف سے ہمیں اطمینان ہو جائے اور جہاں سے وہابی لشکر کو مجبور اور بے بس کر دے سکیں۔ مجھے یہ ہمت ہوئی کہ ادھر اپنی ایک فوج روانہ کر دوں۔"

قلعہ کوٹلہ پر انگریزوں کا قبضہ

آخر ۱۰ جنوری ۱۸۵۲ء کو قلعہ کوٹلہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے میجر ایبٹ کے زیر کمان ایک فوج روانہ کی گئی۔ یہ قلعہ قصبہ عشرہ میں قریب ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑ کی نکلی ہوئی چٹان پر واقع ہے۔ برطانوی فوجیں اپنے حلیف جہاں داد خاں کی فوج کے شمول سے تین مختلف اطراف سے آگے بڑھیں۔ اسی طرح وہابی تعداد اور اسلحہ میں اپنے سے قوی تر دو فوجوں کے درمیان پھنس گئے۔ جب کہ انگریزی فوج دریائے سندھ کو عبور کر کے آگے بڑھ رہی تھی جہاں داد خاں کے بھرتی کیے ہوئے زنگڑوں نے اپنی واپسی کا راستہ قطع کر دیا۔ وہابی ایک پُر جوش عقبی دستے سے لڑتے بھڑتے کوٹلہ سے نکل گئے اس میں ان کے ستر آدمی ضائع ہوئے جو کرم علی داناپوری کے زیر کمان لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ البتہ عنایت علی اپنے خاص رفقاء کے ساتھ کوٹلہ سے صحیح و سالم نکل گئے۔ وہابیوں کا صدر مقام ستھانہ اب غیر محفوظ اور برطانوی حملہ کی زد میں تھا۔ مگر انگریزوں نے صرف کوٹلہ پر دوبارہ قبضہ کر لینے پر قناعت کی اور ستھانہ پر چڑھائی نہیں کی کیونکہ ستھانہ تمام ذخائر اور اسلحہ سے خالی ہو چکا تھا جو کوٹلہ منتقل کر دیے گئے تھے۔

سرجن لائل کا وہابیوں کو خراج تحسین

اس معرکہ سے متعلق انگریزی کاغذات سے ریاست ستھانہ کی کچھ نہایت اہم جزویات ہمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ہمیں کچھ زخمی وہابیوں کے بیانات بھی ملے ہیں جن کو گائڈ کے دستوں کا اسسٹنٹ سرجن لائل علاج کے لیے پشاور اُٹھا لے گیا تھا۔

لائل ان کی وفاداری اور عزت نفس کے اعلیٰ جذبہ کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اپنی زار و زبوں حالت پر بھی ہر بات سے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور اپنے ساتھیوں کو ملوث کرنے کے خوف سے کوئی بیان دینے سے انکار کیا۔ صرف رجمنٹ کا ایک سپاہی ان کا اعتماد حاصل کر کے ان سے کچھ باتیں دریافت کر سکا۔ ان کے بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ وہابیوں کی تعداد چھ سو ہے اور یہ کہ پہلے ولایت علی ان کی تمام کارروائیوں کی سربراہی کرتے تھے، مگر ایک سال ہوا ان کے انتقال کے بعد قیادت ان کے چھوٹے بھائی عنایت علی کو تفویض ہوئی۔ سوات کے سید اکبر کے چار بھائی ان کی جماعت کے ساتھ رہتے اور اُن میں کافی اثر رکھتے تھے۔ ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تمام ملک میں پھیلے ہوئے مبلغوں کی تحصیل کردہ رقوم تھیں[1] ان کے خاص محسن نواب ٹونک بیس سے چالیس ہزار روپے سالانہ بھجوایا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے نواب نصیر الدولہ بھی روپے بھیجتے تھے۔ آمدنی کا ایک اور بڑا ذریعہ ستھانہ میں نو سو بیگھہ زمین تھی جو اکبر شاہ نے دی تھی، اور سب مزروعہ تھی۔ چالیس آدمیوں کی اپنی زرعی پیداوار تھی جو سب کی سب بیت المال میں دے دی جاتی تھی۔ ان کی خوراک زیادہ تر دال روٹی تھی۔ جماعت کو پابندی سے قواعد کرائی جاتی کمان کا نعرہ اللہ اکبر تھا۔ ان کے پاس اچھی نسل کے کوئی دس گھوڑے تھے۔ جماعت میں سے نصف کے پاس قرابینیں تھیں۔ مجموعی حیثیت سے وہ اچھی طرح مسلح نہ

---

[1] سرحد کے راستے پر ان رضاکاروں کو شہروں اور گاؤں کے رہنماؤں سے گزرتے تھے (چندوں سے خوراک مہیا ہوتی تھی۔

تھے۔

یہ تھا اُس مختصر جاں نثار جماعت کا حال جو آزادی کے لیے لڑ رہی تھی اور جس نے مسلمہ طور پر بہت قلیل مادی وسائل کے باوجود حکومت برطانیہ کی طاقت کو چیلنج دے رکھا تھا۔ برطانوی سے اپنے پہلے محاربوں میں وہ فتح کا جھنڈا تو اڑا نہ سکے، مگر ان کی جدوجہد کا موازنہ محض فوجی فتوحات کے نقطہ نظر سے نہ کرنا چاہیے۔ ان کی عظمت کا اصل معیار آزادی کی لگن اور قربانی کا جذبہ ہے۔ جس نے ان کو سرشار کر رکھا تھا۔

اخوند کی وہابیوں سے سرد مہری

کوٹلہ کی لڑائی کے بعد عنایت علی چملا کے علاقہ نواگائی میں منتقل ہو گئے۔ بعد کے چند سالوں میں وہ سوات اور بنیر کے علاقوں میں مختلف جگہوں میں پھرتے رہے۔ مہر نے اس زمانہ میں عنایت علی کی نقل و حرکت کی متفرق وارداتیں ان کے بیٹے عبدالمجید کے روزنامچے سے نقل کی ہیں۔ اس روزنامچے کے ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ عنایت علی نے سید اکبر شاہ اور اخوند[1] سے انگریزوں کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دینے پر اصرار کیا تھا۔ مگر آخوند نے اس تجویز سے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ شروع سے ہی وہابیوں کی اعانت میں وہ ٹھنڈے نظر آئے۔ شاید وہابیوں کے بڑھتے ہوئے اثر میں اپنے اثر

---

[1] اخوند (بمعنی مذہبی پیشوا) کا نام عبدالغفار تھا۔ وہ ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوا اور ایک نسبتاً غیر معروف خاندان کا فرد تھا۔ وہ یوسف زئی اور سوات کے علاقے میں ایک متقبول اور با اثر مذہبی پیشوا تھا۔ وہ ایک منچلے سیلانی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہابیوں کے ساتھ اُس کا رویہ مختلف مراحل سے گزرا۔ وہابی تحریک کے پہلے دور میں وہ سید احمدؒ کا ساتھی رہا۔ لیکن بعد میں ۱۸۵۷ء میں وہ وہابیوں کی طرف سے سرد مہر اور غیر معاون رہا۔ مگر ۱۸۶۳ء میں معرکۂ امبیلہ میں دل و جان سے ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے بیلو صفحہ ۱۰۲-۱۰۷ اور اولیور کے "اکروس دی بورڈر" کے صفحات ۲۸۰ تا ۲۸۵۔

واقتدار کی تخفیف کا خطرہ محسوس کیا۔ آخوند کی بے اعتنائی نے عنایت علی کو اپنے قدیم مرکز ستھانہ سے تو کچھ کرنے نہ دیا مگر ایسی دشواریوں سے ہمت نہ ہارے اور کسی اور طرف کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

عنایت علی کا منگل تھانہ میں قیام

چنانچہ سید عباس کی دعوت پر عنایت علی اپنے مرکز منگل تھانہ میں آ جو خودی خیل کی سرزمین میں ستھانہ کے مغرب جانب مہابن پہاڑ کی برآمدہ چٹان پر واقع ہے اُستھانہ کا قدیم مرکز یحییٰ علی کے ذمہ کر کے اپنے اور ولایت علی کے خاندان کو ساتھ لے کر منگل تھانہ جا رہے۔ مرکز کے مقام کی تبدیلی کے ساتھ وہابیوں کا مقام بھی ہزارہ سے پشاور کی سرحد میں تبدیل ہو گیا۔

عنایت علی اس نئے مرکز سے یوسف زئی قبائل میں کام کرنے لگے جو پشاور اور مردان سے متصل میدان میں رہتے تھے اور ان کو انگریزوں کے خلاف منظم کرنے لگے۔ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں میں تداخل اور گھس بیٹھ کی کوششیں بھی چلتی رہیں۔ اس زمانہ میں عنایت علی کی حرکات و سکنات کا ذکر اوکنیلی یوں کرتا ہے " عنایت علی نے اپنے متبعین کو منظم کرنے اور ان کے دلوں میں انگریز کافروں سے نفرت کی آگ بھڑکانے کی جدوجہد کی۔ مجاہدین سے روزانہ ڈرل (قواعد) کرائی جاتی، کبھی کبھی دن میں دوبارہ، اور پھر بڑ پر اُن آیات کا تلاوت کرنا سکھایا جاتا تھا جن میں جہاد کی فضیلت کا بیان ہوتا اور جمعہ کے دنوں میں خطبے دیے جاتے جن میں اُن کو نصیحت کی جاتی کہ اس وقت کا صبر سے انتظار کریں جب برطانوی ہندوستان کی تسخیر کی معینہ گھڑی آ جائے۔

انگریزوں کی وہابیوں کو تنبیہ

مہر نے عبدالمجید کے روز نامچے ہی کے حوالے سے اس زمانہ کے بعض واقعات نقل کیے ہیں۔ ان میں سے ایک اندراج کے مطابق دسمبر ۱۸۵۵ء میں قبیلہ مبارک خیل نے عنایت علی کی قیادت قبول کر لی اور ان کی دعوت پر عنایت علی آئندہ جنوری میں نگرائی گئے۔ اس کے فوراً بعد ہندوستان سے ایک قاصد وزیرالدین پٹنہ سے کچھ روپے لے کر آ گیا۔ مہر

یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ اسی زمانہ میں انگریز حکام نے ایک چٹھی تمام وہابیوں کو خطاب کر کے لکھی جس میں یہ پیش کش تھی کہ اُن سب کو معافی مل سکتی ہے اور اُن سب لوگوں کو جو اطاعت قبول کر لیں وطن کو واپسی کے اخراجات ملیں گے۔ اور جو ان شرائط کو تسلیم نہ کریں گے اُن کو تین سال کی قید با مشقت کی سزا کی دھمکی۔ لیکن یہ پیش کش حقارت سے ٹھکرا دی گئی۔

مبارک شاہ کا سوات سے اخراج

مردان میں پچپن ویں دیسی فوج کی آویزش کا مختصر ذکر کیا جا چکا ہے وہابیوں نے اپنی چھاؤنی سے نکل کر سیدھے سوات کا رُخ کیا جہاں وہ سوات کے اکبر شاہ سے مل جانے کی امید رکھتے تھے۔ لیکن عجب سوءِ اتفاق کہ وہ ٹھیک میرٹھ کے ہنگامہ کے روز فوت ہو گیا۔ اور اس کی وفات نے وہاں صورت حال کو بدل دیا۔ سوات میں ایک عجیب قسم کی دوگانہ حکومت تھی جس میں اکبر بادشاہ اور آخوند مذہبی پیشوا کے درمیان اقتدار برابر بٹا ہوا تھا۔ آخوند کو اس کے مذہبی تقدس اور بزرگی کے سبب سے خوش اعتقاد عوام پر زیادہ اثر حاصل تھا۔ اکبر شاہ کے زمانے تک آخوند کی بادشاہ سے اچھی بنتی رہی، لیکن اس کے بعد آخوند نے اس کے بیٹے مبارک شاہ کی جانشینی کی مخالفت کی اور اُسے سوات سے نکلوا دیا۔ مبارک شاہ نے پہلے ستھانہ میں پناہ لی۔ اس کے بعد پنجتار میں اقامت پذیر ہو گیا جس کا سردار مقرب خاں تھا۔ منگل تھانہ اس سے قریب ہی تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد مبارک شاہ عنایت علی سے ملا۔ اور دونوں نے مل کر قلعہ مردان پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ اس قلعہ سے تمام یوسف زئی میدان زیرِ نظر ہو جاتا تھا۔ اس اثناء میں پچپن ویں ایسی فوج آخوند کی مخالفت کے سبب سے سوات سے برخاست کر دی گئی، اور یہ پلٹن کسی مخالف انگریز گروہ سے مل جانے کی تاک میں ماری ماری پھرتی تھی۔ عنایت علی کے آدمیوں نے ان منتشر ٹولیوں کو اکٹھا کیا۔ عنایت علی نے منگل تھانہ میں ان کے خیر مقدم کی پیش کش کی۔

انگریزی علاقے پر حملے

۱۸۵۷ء کی شورش نے عنایت علی کو ایک اور سنہرا موقع بخشا کہ پشاور کے بعض سرحدی گاؤں اور فوجی چوکیوں پر چھاپے مارنے کا انتظام کر کے انگریز حکام ضلع کو پریشان کر دیا۔ اُس وقت پنجتار کی ہمسایہ ریاست اپنے سردار مقرب خاں اور اس کی رعایا بالخصوص توٹالی کی باہمی خانہ جنگی میں اُلجھی ہوئی تھی خود مقرب خاں کا چچازاد بھائی چنگلائی کا مبارز خاں اس کے خلاف تھا۔ اس آویزش کے فوراً بعد مبارز نے عنایت علی کو کہلا بھیجا کہ آئیں اور انگریزی علاقوں پر حملہ کرنے میں اُس کا ساتھ دیں۔ چنانچہ پہلا دھاوا چنگلائی کے قریب ایک نواکلا پر کیا گیا جس کے باشندوں کے بارے میں معلوم تھا کہ وہابیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اُس گاؤں پر مع ایک ملحقہ گاؤں شیخ جانا پر قبضہ کر لیا گیا۔ اسسٹنٹ کمشنر لفٹنٹ ہورن نے پانچویں پنجاب پیدل فوج کے کمان دار میجر واگھان کی کمان میں روانہ کی جس نے جولائی ۱۸۵۷ء کو شیخ جانا پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ سات گاؤں والوں کو قتل کی سزا دی گئی۔

عنایت علی کا نارنجی پر قبضہ

اس کے دو ہفتے کے بعد عنایت علی نے اپنی ذاتی کمان میں نارنجی پر دوسرا حملہ کیا اور اُس پر قبضہ کر لیا۔ یہ گاؤں اگرچہ برطانوی علاقے میں انتہائی حد پر واقع تھا اور وہاں تک پہنچ دشوار تھی۔ اس کے باشندے اپنے جوش اور آزادی کی محبت کے لیے معروف تھے۔ عنایت علی کے آدمیوں کی تعداد کل ڈیڑھ سو تھی اور چالیس آدمی پچپن دیں دیسی فوج کے سپاہی تھے۔ پنجتار اور سوات کے کچھ سوار بھی جماعت میں شریک ہو گئے۔ نارنجی کے اس موافق و مناسب حال مقام سے عنایت علی یوسف زئی قبیلہ کو انگریزوں کے خلاف کھڑے ہونے پر آمادہ کرتے رہے، اس لیے اس قبیلہ کو کچھ حفاظتی اقدامات کرنا پڑے۔ نارنجی کا قبضہ بجائے خود ایک چیلنج تھا۔

۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء کو میجر واگھان کے زیر کمان ایک فوج نے پھر مردان سے کوچ کیا۔ قصبہ نارنجی کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ یہ ڈھلوان پر تعمیر کیا ہوا تھا اور کھڑی

پہاڑی پر اوپر کے حصے میں واقع تھا۔ جنگی کارروائی کا آغاز گاؤں پر گولہ باری سے ہوا اس کے بعد پیدل فوج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بڑھی۔ وہابیوں کی پامردانہ مدافعت کے بعد برطانوی فوجوں نے پہاڑ کے زیریں حصے پر قبضہ کر لیا۔ گاؤں کے بالائی حصے کا زبردست استحکام اور نیز دشمن[1] کی بہادری ان کے آگے بڑھنے میں مانع ہوگئی۔ گاؤں پر قبضہ ہو جانے کے بعد بھی اس کو آگ لگا کر تباہ کر دینے کی کوشش بھی اوپر سے دشمنوں کی بے قاعدہ گولہ باری سے رُک گئی۔ وہابیوں کا نقصان ۵۰ زخمیوں اور ۵۰ مقتولوں پر مشتمل تھا (ان میں پچپن دیسی فوج کے سپاہی بھی شامل تھے جن کی لاشوں کو انگریزوں نے ان کے اسلحہ اور وردیوں سے شناخت کیا (انگریزوں کا نقصان پانچ مقتولین اور پچیس زخمیوں پر مشتمل تھا)

عنایت علی کی شکست و پسپائی

مگر اس سے نارنجی کے معاملے کا خاتمہ نہیں ہو گیا نارنجی گھٹ گیا مگر اُس پر قبضہ نہ ہوا۔ عنایت علی نے شکست کھائی مگر حوصلہ پست نہ ہوا۔ نارنجی کے باشندے اُن کے ساتھ تھے اور انگریزوں نے جب ان کو مانگا تو ان کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ چملا نے ساتھ جھنڈے بھیجے جن کے ساتھ دو سو آدمی تھے اور آنے والی عید کے تہوار کے بعد مزید کمک کی توقع تھی۔ سوات سے بھی مدد کا وعدہ وصول ہوا۔ اس لیے ۳ اگست کو شیوا میں ایک بڑی فوج جمع ہو گئی اور نارنجی سے ڈیڑھ میل آگے ایک مجہول راستے سے اُس پر جا چڑھے اور دشمن کے عقبی حصے پر حملہ کرے۔ دو سو چوبیس پونڈ والے ہوویٹزروں اور پہاڑی توپوں سے گاؤں پر گولہ باری ہونے لگی۔ وہابیوں کے پاس ان کے مقابلے کی توپیں نہ تھیں مگر اپنی بلند جگہ سے توڑے دار بندوقوں سے گولہ باریوں کا جواب دیتے رہے۔ آدھے گھنٹے کی گولہ باری کے بعد حملے شروع ہوئے یہ بڑی بہادری و جانبازی سے لڑے مگر دو طرف سے قوی تر فوجوں کی حملہ آوری سے

---

[1] پیگٹ ایڈیشن صفحات ۸۷-۸۹

پسپا ہونا پڑا۔ عنایت علی نارنجی سے ایک محفوظ تر مقام میں پہاڑ کے اور اوپر چلے گئے۔

نارنجی کی تباہی

کپتان جیمز جو پولٹیکل افسر کی حیثیت سے فوج کے ساتھ تھا گاؤں کی تباہی کا یوں ذکر کرتا ہے:۔ "اس کے بعد تباہ کاری کا کام شروع ہوا۔ ایک گھر بھی چھوڑا نہ گیا۔ بہت سے گھروں کی دیواریں بھی ہاتھیوں سے روندوائی گئیں۔ پھر الیف ایس ٹیلر انجینئر کے زیر ہدایت مینارے اڑا دیے گئے۔ اور بہت جلد گاؤں ملبوں کا انبار اور ایک کھنڈر بن گیا۔" تین آدمی قید کر لیے گئے۔ اور بعد میں قتل کر دیے گئے۔ اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اسیران جنگ کا قتل ایک غیر معمولی فعل تھا۔ وہ باغی ہونے کے بہانے سے بھی قتل نہیں کیے جا سکتے تھے کیونکہ وہ ایسی ریاست سے تعلق رکھتے تھے جو حقیقتاً آزاد تھی۔

احمد اللہ اور محمد حسین کی نظر بندی

نارنجی کی لڑائی کے بعد کے کچھ دن وہابیوں کے سخت صبر آزما مصائب اور دشواریوں کا زمانہ تھا۔ تازہ جھڑپوں میں انگریزوں کی کامیابی نے بعض قبائلیوں کی وفاداری اور ثابت قدمی کو متزلزل کر دیا۔ اپنی مخصوص تنگ دلی سے وہابیوں کے ساتھ تعاون ختم کر دیا۔ اور اس سے بدتر وقوعہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے مسلسل امداد بھی عارضی طور پر بند ہو گئی۔ وہابیوں کے سربراہ احمد اللہ اور محمد حسین کو ان کے گھر پہنچنے کے بعد ٹیلر کمشنر پٹنہ نے نظر بند کر دیا تھا۔ اس سے بھی روپے کی تحصیل و ترسیل کا انتظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد سے دریائے سندھ پر آمد و رفت کے گھاٹوں پر نگرانی زیادہ سخت ہو گئی تھی جس سے قاصدوں کے لیے دریا عبور کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا۔ نتھو خلیفہ کے خطوط جن کا اوپر ذکر ہو چکا اور اس زمانہ کے قریب لکھے گئے تھے ان میں مغرب سے ڈاک بند ہونے کا ذکر ہے۔ یہ پریشانیاں اتنے ہی پر ختم نہ تھیں، قبائلیوں نے بھی عام طور پر ان کو دق کرنا شروع کر دیا اور بھولے بھٹکے وہابیوں کو ادھر ادھر قتل بھی کر دیتے۔

انگریزوں سے عنایت علی کا آخری محاربہ

اس سے ہمیں وہابیوں کے علوئے ہمت اور صبر و استقامت

کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اس انتشار و پراگندگی اور بے بسی میں بھی وہ بے کار نہ بیٹھے۔ اور جنگ میں پہل کرتے رہے اکتوبر ۱۸۵۶ء میں شیخ جانا اور نارنجی کے باشندوں کی مدد سے جو سرحدیہ وو تعذیری مہموں کے باوجود اب بھی وہابیوں کے ہمدرد تھے نواکلا (قلعہ) کے گاؤں پر جہاں یوسف زئی علاقے کے اسسٹنٹ کمشنر ہورن نے چھاؤنی ڈال رکھی تھی۔ ایک دلیرانہ اور بے باکانہ شب خوں مارا۔ یہ حملہ شریعتہ اللہ کی قیادت میں ہوا۔ حملہ آوروں کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا اور ہورن کے پانچ آدمی مقتول ہوئے۔ عنایت علی اور انگریزوں کے درمیان یہ آخری محاربہ تھا۔

وہابیوں کا دورِ ابتلا

وقت گزرنے کے ساتھ بعض متذکرہ بالا دشواریوں کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ فوج کی تنخواہوں میں تعویق ہوگئی۔ خود عنایت علی اور ان کے بیٹے عبدالمجید سخت علیل ہوگئے۔ اس کے کچھ ہی دن پہلے عبدالمجید کی بیٹی کا انتقال ہوگیا۔ آخری کئی مہینوں میں کوئی غلہ دستیاب نہ ہوا۔ اور فاقہ زدہ جماعت درختوں کی جڑیں اور پتے کھاتی رہی۔ ان میں سے زیادہ تر خونی پیچش میں مبتلا ہوگئے۔ خود عنایت علی کو تیز بخار آگیا اور دس دن کسی دوا یا غذا کے بغیر گزارے۔ عنایت علی جیسی وقف رضائے الٰہی شمع کی جان کے لیے حقیقتاً یہ ایک سخت آزمائش کی گھڑی تھی۔ پھر بھی ان کے قدم نہ ڈگمگائے اور انگریزوں کی تسلیم و اطاعت کی پیش کش کو قبول کرنے کی بجائے اپنے وسائل کی تنظیم نو کی کوششیں جاری رکھیں۔ فوراً ہی بعد مارچ ۱۸۵۸ء کے اواخر میں ان کا انتقال ہوگیا اس طرح شدید مصائب میں اُس شخص کے کارناموں کا اختتام ہوگیا جس نے اپنے ملک کو اغیار کی غلامی سے نجات دلانے کے مقصدِ عظیم کے لیے اپنی زندگی وقف کر کے اپنے پیچھے شاد و آباد وطن چھوڑا۔[ع] ان کی یاد میں ان کا کم سے کم حق جو ہم پر عائد ہوتا ہے وہ آزادی وطن کے حصول کی تاریخ میں ان کے درجہ کا اعتراف ہے۔

مجلس اربابِ ثلاثہ

ان کے انتقال کے بعد قدرتاً وہابی مرکز میں تزلزل و تنزل واقع ہوگیا۔ اور کچھ مدت کے لیے حالات منتشر و پراگندہ رہے۔ ان کے بعد فوری طور پر کوئی جانشین منتخب نہ ہوا

ع ؎ رکھو گیا چھوڑ کے صحرا میں نشان منزل میں یہ میدان تو جیتا نہیں، ہارا بھی نہیں" (مسلم)

ان کے بیٹے عبدالمجید گفتگو میں خفیف سی لکنت کے سبب سے اس منصب کے قابل نہ سمجھے گئے۔[1]
اس لیے اکرام اللہ، نور اللہ اور میر تقی کے ساتھ ایک مجلس اربابِ ثلاثہ بنالی گئی۔ نور اللہ ان میں سب سے بڑے تھے اس لیے وہ تینوں سردار بنائے گئے۔ ان میں سے اکرام اللہ ستھانہ کے قریب ایک معرکہ میں جو فوراً بعد ہوا تھا شہید ہو گئے۔

وہابیوں کے خلاف لارنس کی جدوجہد

یہ بتایا جاچکا ہے کہ کس طرح ۱۸۵۷ء میں یوسف زئی کے علاقے میں عنایت علی کی جدوجہد سے وہاں انگریزوں کی طاقت کا ثبات خطرے میں پڑ گیا تھا۔ شروع میں ادھر اُدھر چھوٹے چھوٹے جوابی حملوں سے وقتی طور پر اس سے نمٹا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے نصف آخر میں جب کہ لارنس کی ان تھک جدوجہد اور سخت ہدایت کے تحت پنجاب کے تمام وسائل دہلی کی بازیابی کے داؤ پر لگا دیے گئے تھے۔ جنگ کی فوری ضرورتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ صورت حال کے رو باعتدال ہوتے ہی فیصلہ کیا گیا کہ وہابی مسئلہ کو خاص توجہ سے نپٹا لیا جائے۔

پنجتار اور جنگلائی کی تاراجی

معرکہ ۱۸۵۸ء سر سڈنی کاٹن کے زیر کمان ستھانہ اور منگل تھانہ کے وہابی مرکزوں کو تباہ کر دینے کے واضح مقصد سے ایک زبردست فوجی مہم[2] تیار کی گئی۔ یہ فوج قریہ سلیم خان میں جمع ہوئی اور ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو چل پڑی۔ یہ حملہ ٹھیک سرحد پہ وہابی مرکز کی تاریخ میں سخت خستگی و درماندگی کے دور میں ہوا۔ عنایت علی کی وفات کے بعد ہندوستان سے سلسلۂ امداد کے انقطاع کے سبب سے مرکز کی حالت نازک ہو گئی۔ ان کی تعداد بھی افسوس ناک طور پر گھٹ گئی۔ وہابیوں کے خاص معاون، سادات نے عثمان زئی کے ہاتھوں ایک معرکہ میں سخت زک اٹھائی تھی۔ جس کا بیان ابھی آتا ہے۔

---

[1] اس سے ظاہر ہے کہ قائد تحریک کے انتخاب کے شرائط کتنے سخت اور بے لچک تھے۔

[2] اس معرکے کی پوری تفصیل جنرل ایس کاٹن کے (NINEYS RSINDIA) (ہندوستان میں نو برس) میں درج ہے۔ مؤلف اس مہم کا قائد تھا اور اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ جنگ امبیلہ کے منظوم حالات کا مصنف عبدالحق بھی اپنی کتاب "دُرِّ مقال" کے دیباچے میں اس معرکہ کا مختصر تذکرہ کرتا ہے۔
نیز پیگٹ اور لیس ص ۹۰-۹۷

قبائل نے جیسے ہی دیکھا کہ وہابیوں کے خلاف ایک تعذیری مہم بھیجی جا رہی ہے وہ اپنی عادت کے مطابق ان کے خلاف ہو گئے۔ پہلا قبیلہ جس نے وہابیوں سے درکنار، خود اپنے سردار سے انحراف کیا وہ خودوخیل تھا۔ اس نے پنجتار پر حملہ کر کے مقرب خاں کو وہاں سے نکال دیا۔ انگریزی فوج پنجتار پہنچی تو اُسے آدمیوں سے خالی پایا جو بچے کھچے لوگ رہ گئے تھے اُن سے بھی خالی کرا لیا اور ۲۵ر اپریل کو پنجتار کو نذرِ آتش کر دیا۔ اسی روز جنگلائی کو بھی تباہ کیا گیا۔

منگل تھانہ کی تباہی

دوسرا دھاوا منگل تھانہ پر ہوا۔ وہابیوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی تمام طاقت ستھانہ میں مجتمع کر لیں اور منگل ستھانہ سے نکل آئے تھے مگر مقرب خاں نے پنجتار سے نکالے جانے کے بعد اپنے خاندان کو اُسی خالی قلعہ میں پناہ لینے کو بھیج دیا تھا۔ انگریزوں نے اس کی تباہی کو بھی ضروری سمجھا تاکہ یہ بچا کھچا حصّہ قلعہ بھی تباہ کر دیا جائے تو مقرب خاں کی سزا کامل اور زیادہ عبرت ناک ہو جائے۔ قبائل میں اس قلعہ کی بڑی وقعت و اہمیت تھی کیونکہ یہ پہاڑی استحکامات میں اس قدر گھسا ہوا اور محفوظ تھا کہ بظاہر ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ آس پاس کے قبائل میں مایۂ فخر و ناز تھا۔ اور اس کی وقعت و اہمیت اس قدر تھی کہ صرف اس کی تباہی تمام قبائل کو مرعوب کرنے کے لیے کافی خیال کی گئی۔ منگل تھانہ کی خوش حال آبادی اور اس کی بربادی کا ایک تنہا واضح تذکرہ خود اس کے غارت گر کاٹن کے لفظوں میں محفوظ ہے:" منگل تھانہ کوہ مہابن کی ایک سب سے بڑی۔ برآمدہ چٹان پر واقع ہے۔ اور عنایت علی کا صدر مقام تھا جس نے نارنجی اور دوسرے مقامات ۱۸۵۷ء-۱۸۵۸ء میں نہایت صبر و استقلال سے یوسف زئی کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ یہ بالائی اور زیریں دو گاؤں پر مشتمل ہے۔ زیریں گاؤں میں تیس چالیس گھر ہیں جن میں سادات رہتے ہیں۔ بالائی منگل تھانہ تین چوٹیوں کے درمیان ایک سطح مرتفع پر واقع ہے یہ چوٹیاں خود فصیل کا کام دیتی ہیں۔ اس سطح مرتفع پر پہلے عنایت علی کا قلعہ بند مکان ہے جس میں اس کے ہندوستانی متبعین کے لیے احاطے ہیں، دوسرا اسید عباس کا قلعہ بند گھر ہے۔ تیسرا اسید اکبر کا قلعہ ہے جس میں ایک سفید پختہ مینار ہے۔ پورے رقبہ میں تیس چالیس گھر ہیں۔ قلعہ بندیاں بڑے پتھروں اور عمدہ لکڑی سے بڑی محنت سے تعمیر

کی گئی تھیں، اور ہندوستان کے مذہبی دیوانے اور چور جو اکبر کے اس قلعہ میں جمع ہوتے تھے۔ بڑی راحت اور حفاظت سے رہتے ہوں گے اور جو وقعت و اہمیت اس سے منسوب ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔"

یہ سرسبز و شاداب منزل ۲۹ اپریل کو برباد کر دی گئی۔ اور اس کے استحکامات منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیے گئے۔ فوج تمام رات اپنے ہی ساختہ کھنڈروں میں بسر کر کے دوسرے دن سلیم خاں لوٹ گئی۔

منگل تھانہ اور ستھانہ کی غارت گری کے درمیان مختصر سے وقفے میں ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا جس کے آغاز کا اگرچہ اس سے بہت پہلے سے پتا ملتا ہے اس کا براہ راست تعلق ستھانہ کی تباہ کاری سے تھا اور اس میں بہت سہولت بہم پہنچا دی۔

ستھانہ دریائے سندھ کے دائیں جانب کی سرزمین اور یوسف زئی کی وادی اور ٹوپی برطانوی سرحدی چوکی کے درمیان دریا کے کنارے اور کوہ مہابن کی چھاؤں میں زمین کی ایک پتلی دھجی ہے۔ برطانوی ہند کی حدود سے باہر یہ زمین عثمان زئی قبائل کی ملکیت تھی۔ اس میں کچھ اور بستیوں کے علاوہ، بالائی اور زیریں کیاہ اور کھبال اور بالائی و زیریں ستھانہ کے گاؤں بھی شامل تھے ایک مدت دراز سے ستھانہ بطور آلتمغہ بنیر میں تخت بند کے سید ضامن شاہ کو عطا ہوا تھا۔ یہ ایک محترم تارک الدنیا بزرگ تھے اور کسی جھگڑے میں ان کو اپنے ہی علاقے سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ ان کے پوتوں عمر شاہ اور اکبر نے شروع سے وہابی تحریک میں حصہ لیا تھا اور اکبر سید احمدؒ کے خازن کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انہیں نے وہابیوں کو ستھانہ میں دعوت دی اور ان کو وہاں بسا دیا تھا۔ وہ ۱۸۴۶-۴۷ء میں زیریں ہزارہ میں سکھ دربار کے خلاف بغاوت میں قائد منتخب ہوئے تھے۔ جس کا اوپر ذکر ہو چکا۔ جب ہزارہ انگریزی قبضہ میں چلا گیا وہ سوات لوٹ آئے اور وہاں بادشاہ منتخب ہو گئے۔ ان کی غیر حاضری میں عمر شاہ ستھانہ کے سردار تھے۔ انھوں نے اور اکبر شاہ دونوں نے کیاہ اور کھبال کے گاؤں سے اپنی سیاسی بالادستی کی حیثیت سے اور وہاں وہابی مرکز کا خرچ چلانے کے لیے بھی کچھ عشر وصول کیا تھا۔ عثمان زئی نے اس لگان پر عذر کیا مگر اس کی مخالفت کے لیے اپنے آپ میں طاقت نہ پائی، بالخصوص

اس لیے کہ دونوں گاؤں کے مقامی لوگوں نے ان سیدوں کی حمایت کی۔ اب کاٹن کی اس مہم کے توقع پر انہوں نے ان سیدوں کو کاٹن کی فوج کے ذریعے سے نکال باہر کرنے کا عمدہ موقع تصور کیا۔ کمشنر پشاور ایڈورڈز سرحدی قبائل سے بزور یہ معاہدہ لینا چاہتا تھا کہ سیدوں یا وہابیوں کو پناہ نہ دیں۔ چنانچہ عثمان زئی نے ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو ستھانہ پر حملہ کر دیا اور جنگ میں عمر شاہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ منگل تھانہ تباہ کر دیا گیا اس لیے کہ قبائلی اپنے ہی سردار مقرب خان کے خلاف ہو گئے تھے۔ اب ستھانہ کی تباہی کی نوبت تھی اس لیے کہ ٹھیک حملہ کے وقت عثمان زئی نے مدافعت کا دم باقی نہ چھوڑا تھا۔ انگریزوں کے لیے یہ حسن اتفاق مبارک لیکن قبائلیوں کی ذہنیت پر نفریں!

معرکہ ستھانہ

۴ مئی ۱۸۵۸ء کو کاٹن کے زیر کمان انگریزی فوج ستھانہ کے خلاف بڑھی۔ انگریز سندھ کو عبور کر کے دکھن سے بڑھے ادھر امب کے جہان داد خاں کے رنگروٹوں نے شمالی پہاڑیوں پر پڑاؤ کیا۔ درمنقال کے مصنف کے بیان کے مطابق مقامی قبائلیوں نے ستھانہ پر انگریزوں کی چڑھائی کی خبر مبارک شاہ کو دے دی تھی اور اول الذکر اپنے آپ کو مدافعت کے قابل نہ دیکھ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ ستھانہ سے بیس میل اوپر کوہ مہابن کے شمالی ڈھلوان پر ملکہ میں لوٹ گیا۔ صرف وہابیوں کی چالیس آدمیوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی اور کچھ جادون قبائلی ستھانہ میں رہ گئے۔ انہوں نے ستھانہ سے کچھ دور آگے ایک پہاڑی شاہ نور کی لاری پر پڑاؤ کیا اور انگریزوں کی آمد کا انتظار کیا۔ ان کا سردار اتحاد ثلاثہ کا ایک رکن اکرام اللہ تھا۔ نتیجہ معلوم تھا مگر وہابیوں کی مختصر ٹولی نے بڑی بہادری دکھائی۔

وہابیوں کی سرفروشی

نیول سرحدی قبائل کے خلاف برطانوی معرکوں کی مستند تحریروں سے وہابی غازیوں نے شدید موانع کے مقابلے میں اپنے سے بہت بڑی فوج سے لڑنے میں جس صبر و سکون اور استقامت کا ثبوت دیا نیول اس کی کیفیت یوں نقل کرتا ہے:۔ "ہندوستانیوں کی لڑائی کی نمایاں خصوصیت ان کی مذہبی سرشاری تھی وہ دلیری اور دلجمعی سے بڑھے چلے آتے تھے۔ کامل خاموشی سے کسی قسم کے نعرہ یا آواز کے بغیر سب کے سب اس موقع کے لیے اپنے بہترین لباس میں ملبوس تھے (زیادہ تر سفید لباس

ہیں، البتہ بعض سردار مخمل کی قبائیں پہنے تھے۔"

ایک اور مصنف وہابیوں کی جانبازانہ مدافعت کا استحسان کرتا ہے جو پٹھانوں کی بلند بانگ حربی اوصاف سے نمایاں امتیاز رکھتی ہے "پٹھان جب موقع پاتے چپکے سے میدان جنگ سے کھسک جایا کرتے مگر ہندوستانی سپاہیوں کا ایک ایک فرد آخر دم تک جما رہتا۔ ان کی جنگ مختصر، جانبازانہ، فیصلہ کن ہوا کرتی اور آخر یہ بہادر، گو برخود غلط، غازی مارے جاتے یا قید ہو جاتے۔"

ستھانہ کی تباہی

کوئی تیس وہابی ان کے قائد سمیت شہید ہو گئے۔ انگریزوں کا بھی کچھ نقصان ہوا۔ منگل تھانہ کی طرح ستھانہ بھی بے رحمی سے تباہ کیا گیا۔ تمام تعمیرات کو منہدم کرنے کے لیے ہاتھی استعمال کیے گئے۔ حصار اور استحکامات اڑا دیے گئے۔ درخت کاٹ کر گرا دیے گئے اور جو کاٹے نہ جا سکے ان کی چھالیں نوچ ڈالی گئیں تاکہ وہ پھر نہ پنپ نہ سکیں۔ دوسرے قبائل جیسے جادونوں کے خلاف تعزیری اقدامات کیے گئے، اور ان سے اور عثمان زئی سے اقرار نامے لیے گئے کہ وہابیوں کو واپس نہ آنے دیں اور ستھانہ میں پھر آباد نہ ہونے دیں۔ بظاہر انگریزوں نے ستھانہ کو عرصۂ وجود سے مٹا دینے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، مگر اپنے دشمن کی استقامت اور تحمل کا اندازہ نہ لگا سکے۔ دوسری زندگی ستھانہ کا مقدر تھی۔

معرکہ ستھانہ کے بعد سادات نے وہابیوں کو ملکہ میں دعوت دی کہ وہ بھی انہیں کی ملکیت تھا مگر ویران پڑا تھا، اب سادات اور وہابیوں کے وہاں آباد ہو جانے سے بہت جلد ایک سرسبز و شاداب آبادی بن گیا۔

نور اللہ کی وفات

اب وہابی اتحاد ثلاثہ کے دو باقی ماندہ ارکان نور اللہ اور محمد تقی کے زیر قیادت تھے انہوں نے ایک بار پھر دھاگے کی لچھی کا کھویا ہوا سر ڈھونڈ نکالنے اور مرکز کو از سر نو منظم کرنے کی مشقت شروع کر دی۔ پٹنہ سے سامان کی آمد بند ہو جانے سے جو نازک حالت پیدا ہو گئی تھی وہ احمد اللہ اور دوسرے قائدین کی برأت کے بعد سنبھل گئی۔ اسی زمانہ کے لگ بھگ مقصود علی جو کمک کے لیے پہلے ہی پٹنہ روانہ ہوئے

تھے میرٹھ کے راستے سے جہاں وہ گرفتار ہو گئے پھر آزاد کر دیے گئے تھے، ایک خطرناک سفر طے کر کے سرحد واپس پہنچ گئے۔ وہ پشاور بھی گئے، وہاں تین مہینے کے قریب ٹھہر گئے، معینہ راستوں سے آدمی اور روپے کی فراہمی کا بندوبست کرنے اور رضاکاروں اور امداد کی اپیل کے لیے برادران علی کے اعلانات کی اشاعت کے انتظامات کیے۔ وہ ۱۸۵۹ء کے اوائل میں پٹنہ سے چلے تھے اور دوسرے سال سرحد پہنچے اس درمیان میں نور اللہ بھی جو امیر کابل سے ملنے جا رہے تھے راستے میں انتقال کر گئے۔ اس سفر کا مقصد وہابیوں کی ان مصائب میں امیر سے استمداد ہو گا۔ نور اللہ کی وفات سے ۱۸۶۲ء تک مقصود علی جماعت کے قائد رہے۔ ۱۸۶۲ء میں وہ بھی چل بسے۔ ان کے انتقال کے بعد دو جانشین ممکن تھے۔ ولایت علی کے بیٹے عبداللہ اور مقصود علی کے بیٹے اسحاق۔ ان میں سے عبداللہ اپنی زیادہ تجربہ کاری اور حربی معاملات کے علم کے سبب سے منتخب ہو گئے۔ اسحاق دوسرے بڑے عہدے خازن کے لیے منتخب کیے گئے۔

عبداللہ اپنے والد کے انتقال کے بعد پہلے ہی پٹنہ جا چکے تھے ان کو اپنے چچا فرحت حسین کی علالت کے سبب سے کچھ دن وہیں رک جانا پڑا۔ فرحت حسین داخلی تنظیم کے سربراہ تھے اوائل ۱۸۵۸ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد مکہ اور افغانستان کے سفر کے بعد وہ سرحد کو روانہ ہوئے۔ اور مقصود علی کی وفات (۱۸۶۰ء[1]) سے دو سال قبل وہاں پہنچے ان کی قیادت کی مدت چالیس سال سے زیادہ قائم رہی اور اس زمانے کا سب سے زیادہ ہیجان انگیز واقعہ غزوہ امبیلہ تھا جس کا اب ذکر کیا جاتا ہے۔

معرکہ امبیلہ ۱۸۶۳ء: امبیلہ[2] وہابیوں کے خلاف انگریزوں کا واحد اہم ترین اور زبردست معرکہ تھا۔ آدمی اور روپے دونوں اعتبار سے یہ وہابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی انگریزوں کی

---

[1] تذکرہ صادقہ ص ۱۴۷۔ مہر (جلد ۴ ص ۳۱۹)، پٹنہ سے سفر کی تاریخ جنوری ۱۸۵۹ء بتاتے ہیں اور مکہ و افغانستان کے سفر کا کوئی ذکر نہیں کرتے [2] اس معرکہ کا ایک خاص فوجی تذکرہ کرنل ایڈائی ۷۴ ھ کی کتاب ستھانہ مطبوعہ لندن ۱۸۶۷ء میں مندرج ہے یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو اب نہایت نایاب ہے۔ یہ اس غزوہ کا خلاصہ بیان کرتی ہے۔ اس میں مولف خود توپ خانے کا ایک افسر تھا۔ نیز ملاحظہ ہو بیگٹ ولسن و نیول متذکرہ صدر، غیر انگریزی مآخذ میں دُرِ مقال اس قسم کی تنہا کتاب ہے اس کا مصنف بھی مذکورہ واقعات کا چشم دید شاہد تھا۔

سخت ترین جدوجہد کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ خالصتاً وہابیوں کے استیصال کے لیے لڑا گیا۔ اکثر اگلے معرکوں میں تعزیر کے مقصود وہابی اور قبائل دونوں تھے۔ قبائل اکثر اوقات وہابیوں کی اعانت کی بدولت ملوث ہو جاتے۔ اس موقع پر معاملہ برعکس تھا۔ مہم در اصل وہابیوں کے خلاف چلائی گئی تھی۔ مگر طول پکڑ گئی، کیونکہ وہابی قبائلیوں کو (اگرچہ بہت تھوڑے ہی عرصے کے لیے) مدافعت میں شریک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جنگ کی بنا سادات اور عثمان زئی کے درمیان مسلسل آویزشوں میں پنہاں ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا سیدوں اور وہابیوں کے ستھانہ سے نکل جانے کے بعد عثمان زئی نے اس گاؤں پر پھر قبضہ کر لیا اور کھیتوں کو جوتنا۔ اکبر شاہ کے بیٹے مبارک شاہ نے جو اب سیدوں کا قائد تھا اپنی آبائی جائداد ستھانہ کے مطالبے سے اب تک ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ اپنی جلاوطنی کے وقت سے ہی اُس پر دوبارہ قبضے کے منصوبے بنا رہا تھا اس کے لیے اس نے پہلے جادون قبیلوں سے مدد طلب کی اور انہوں نے منظور کی۔ ان کی اور وہابیوں کی مدد سے اس نے مینارہ سری کے نام سے ایک قلعہ نما مینار تعمیر کیا۔ یہ کیاہ اور ستھانہ کے درمیان میں واقع ہے۔ وہاں سے اُس نے ستھانہ اور دوسرے گاؤں پر چھاپے مارنے کا بندوبست کر لیا۔ ان پریشان کن حرکات سے وہ عثمان زئی کو ان کے نئے مقبوضہ کھیتوں سے بھگا دینے میں کامیاب ہوا یہاں تک کہ انہوں نے مبارک شاہ کو کہلا بھیجا کہ ہم اب رخصت ہو رہے ہیں، آپ ستھانہ کو اپنے آدمیوں سے جتوا سکتے اور ہم سے لگان لے سکتے ہیں۔ اُس نے ستھانہ کی سرزمین سے گزرنے والے تجارتی مال پر چنگی لگانا بھی شروع کر دیا۔ ان پریشان کن چالوں سے مبارک شاہ کا مقصد عام طور پر عثمان زئی کو مرعوب کر کے بھگا دینا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہو گیا تھا، مگر کچھ ہی عرصے میں کچھ نالائق عناصر اس کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ اور مینار سری رہزنوں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کے اڈے کی حیثیت سے بدنام ہو گیا جو ان کی پناہ گاہ تھا اور جہاں سے معمولی معمولی چھاپے ڈکیتیاں اور سرحدی گاؤں کے مالدار تاجروں کا اغوا[1] عمل میں آتا۔

محمود شاہ : یہ تھی صورت حال جب کہ عمر شاہ کا بیٹا اور مبارک شاہ کا عم زاد بھائی محمود شاہ ستھانہ

---

[1] جو مالدار تجار بطور یرغمال قید کر لیے جاتے تھے ان میں زیادہ تر ہندو ہوتے تھے انگریز مصنفوں نے اس پر بہت شور و غوغا بلند کیا ہے۔ بہرحال وہابی نے ایسی مجرمانہ حرکت کبھی نہیں کی۔ (فورین ڈیپارٹمنٹ پالیسی A دستاویزات نمبر ۱۹۱-۱۹۳ مورخہ اگست ۱۸۶۳ء کے ملاحظہ ہو)

پہنچا۔ محمود شاہ کو باپ کے مرنے پر انگریزوں کے ماتحت ایک نام نہاد نوکری رسالدار کی مل گئی تھی پہلے اُس نے سگریو کے ہارس کالم میں پھر لاہور پولیس میں ملازمت کی۔ اس کی یہ نوکری انگریزوں کے حلیف جہاں داد خاں کی سفارش سے ملی جو اس کا رشتہ دار بھی تھا، یہ ملازمت دینے میں انگریزوں کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا کیونکہ توقع کی جاتی تھی کہ اس مصروفیت سے وہ سرحد سے دُور رہے گا۔

اور وہاں امن و قانون میں خلل اندازی سے الگ رہے گا۔ غدر کے دوران میں وہ دہلی اور لکھنؤ تعینات کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا رسالہ برخاست ہو گیا؛ اس کو سرحد کی فوج میں کیویلری (رسالہ) افسر کی حیثیت سے ریگولر عہدہ نہ ملا[1] اس لیے اس نے حکومت سے درخواست کی کہ ستھانہ اس کو واپس دے دیا جائے۔

محمود شاہ کی ستھانہ میں آمد

لفٹنٹ گورنر نے اس کی درخواست اس عذر سے نامنظور کر دی کہ ستھانہ برطانوی ہند سے باہر ہے اور جو چیز حکومت کی ملکیت ہی نہیں وہ اسے نہیں دی جا سکتی۔" تب اس شاہزادے نے اپریل ۱۸۶۳ء میں درخواست کی کہ اسے اجازت دی جائے کہ انگریزوں کی مدد کے بغیر اسے خود ستھانہ پر قبضہ کرے۔ اسے بھی اس عجیب جواب کے ساتھ رد کر دیا گیا کہ "اس سے کہہ دو کہ اس قسم کی بات سُنی نہ جائے گی۔" محمود شاہ کے ساتھ انگریزوں کا رویہ نہایت مبہم اور خشم انگیز تھا۔ وہ نہ اس کو اس کی آبائی جائداد واپس دینے پر راضی تھے نہ اُس پر اپنے طور پر قبضہ کرنے دیتے تھے۔ عاجز آ کر وہ اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر ستھانہ جا پہنچا۔ وہ اُس وقت وہاں پہنچا جب کہ مبارک شاہ اپنی متذکرہ بالا کارروائیوں میں مصروف تھا۔ اس لیے معتدل پالیسی اختیار کی اور صلح و امن کے ساتھ ستھانہ کی بازیافت کی جدوجہد کرنے لگا۔ بہر حال انگریزوں کی نامنظوری نے اسے اپنے عم زاد بھائی سے مل جانے پر مجبور کیا جو اس معاملہ میں زیادہ عملی پالیسی چلا رہا تھا۔

وہابیوں کے خلاف افواہیں

عثمان زئیوں میں بھی دو گروہ تھے۔ ایک سیدوں کی مراجعت کے حق میں تھا اور دوسرا انگریزوں کی مدد سے اس کی مخالفت کرتا تھا۔ سیدوں نے ستھانہ پر قبضہ کر لیا تو دوسرا گروہ خیال کے مقابل

---

[1] یہ نامنظوری انگریزوں کے تحت نوکری نہ کرنے کی جذباتی بنا پر تھی۔

تربیلا کی انگریزی چوکی پر چلا گیا اور انگریزوں سے شکایت کی کہ سادات اور وہابی جنگ کی تیاری میں معروف ہیں۔ آمب کے لوگوں میں بھی بے چینی پھیل گئی اور اس کا نوجوان سردار اکرم خاں ولد جہانداد خاں بھی بھاگ گیا۔ مقامی انگریز افسروں نے بھی وہابیوں کے مفروضہ مخالفانہ عزائم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا اور حکومت کو اس مضمون کی مبالغہ آمیز رپورٹیں بھیجیں۔ یہ بات اس امر سے ظاہر ہے کہ خود انگریزوں کو شروع میں یہ شبہ تھا کہ عثمان زئیوں کا مخالف سادات گروہ انگریزوں کی مداخلت کے لیے قصداً بے چینی پھیلا رہا ہے۔ ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر نے اپنی چٹھی بنام کمشنر پشاور مورخہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء میں سچائی سے اقرار کیا تھا کہ "اس تحریک کا اصل مقصد ستھانہ میں آباد ہونا ہو سکتا ہے، مگر سادات کے دوسرے ارادوں کی طرح طرح کی افواہیں بھی اڑ رہی ہیں مثلاً یہ کہ ان کا مقصد کیاہ اور خبال کی غارت گری ہے اور یہ کہ آمب کا وزیر محمد سفہان (؟) آمب کی تاخت و تاراج کا اندیشہ رکھتا ہے۔"

مبارک شاہ

معرکہ امبیلہ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس لیے بیان کیا گیا کہ اس میں سیدوں اور وہابیوں کی کارروائیوں اور انگریزوں کی مخاصمانہ پالیسی کو الگ الگ واضح کر دیا جائے۔ وہابی کئی لحاظ سے سادات کے ممنون تھے۔ ستھانہ سادات کی ملکیت تھا اور وہابی اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کی ان کی جدوجہد کو برحق سمجھتے تھے اور ان کو پورا سہارا دینے کے علاوہ محدود امداد بھی دی۔ مگر محض عثمان زئیوں کو خوف زدہ کرنے اور ان کے حامی انگریزوں پر اپنی طاقت جتانے کی غرض سے مبارک شاہ کے آدمیوں کی تاخت و تاراج ڈکیتیوں اور عام لوٹ مار کے سلسلہ میں وہابیوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ پھر بھی اس موضوع پر اکثر انگریز مصنفوں نے وہابیوں اور مبارک شاہ کے آدمیوں کی کارروائیوں کو گڈمڈ کر دیا ہے۔

وہابیوں کا اعلیٰ کردار

یہ مصنفین اس معرکے کو انگریزوں کا انتقام بتاتے ہیں جو وہابیوں کی خلاف قانون کارروائیوں کے خلاف بادل نخواستہ اختیار کیا گیا۔ مگر ڈپٹی کمشنر ہزارہ وہابیوں اور قبائلیوں کی حرکات کے درمیان نمایاں فرق دکھاتا ہے۔[1] وہابی ایک سیاسی خطرہ تھے مگر لوٹ مار اور ڈکیتیاں باہر کے بعض غنڈوں کے کرتوت

---

[1] فورین ڈیپارٹمنٹ POL "A" ۱۹۳ء اگست ۱۸۶۳ء

تھے۔ جنہوں نے مینادرسری میں پناہ لے رکھی تھی۔ حکومت پنجاب کے سیکریٹری کی ایک چٹھی میں ڈپٹی کمشنر کے سچے اور کھرے خیالات کی جو تلخیص درج ہے اس کا ضروری اور متعلقہ حصّہ درج ذیل ہے:۔

ہندوستانی خود ہر قتل اور ڈاکا زنی سے محترز رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کے کسی فرد نے کبھی ہماری ہندو رعایا کے اغوا اور قتل میں حصّہ لیا ہو۔ البتہ انہوں نے سیاسی سازش کا ایک مرکز بنا رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً غازیوں کو بھیجتے ہیں تاکہ کافر فرنگیوں کے قتل کی تاک لگائیں۔ فی الحال ہمیں ان سے جو خدشہ ہے وہ یہ کہ انہیں کی موجودگی اور حمایت سے مبارک شاہ نے طاقت اور اہمیت حاصل کر رکھی ہے جنگی کارروائیاں شروع کرنے اور ان کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنا ناممکن ثابت ہونے کی صورت میں نہایت ضروری ہوگا کہ ہماری سرحد کے قریب ان کی نو آبادی کے قیام کے خلاف نگرانی رکھی جائے۔"[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہابیوں کا تصور صرف ان کا وجود تھا۔ وہ سیاسی خطرے کا قوی موجب تھے۔ اور بعض غنڈوں اور بدمعاشوں کی معمولی معمولی لوٹ مار جس سے عموماً ان کا کوئی تعلق نہ تھا ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ایک اچھا بہانہ سمجھا جاتا تھا۔ صوبائی حکومت پنجاب جارحانہ جنگ پر تلی ہوئی تھی، اور اپنے اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے شوق میں انہوں نے حکومت ہند یا کمانڈر انچیف کو بھی پوری طرح آگاہ نہ کیا۔ واقعتہً یہ مہم کمانڈر انچیف کے مشورے کے خلاف اختیار کی گئی۔

ساداتِ کا ستھانہ پر قبضہ

آخر میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سادات اور عثمان زئی کے درمیان جھگڑا اُس علاقے کے لیے تھا جو برطانوی ہند سے باہر آزاد قبائلی رقبوں میں تھا۔ حکومت نے محمود شاہ کی درخواست امداد اسی بنا پر رد کر دی تھی۔ پھر بھی جب اس نے اپنی غرض حاصل کرنے کے لیے آزادانہ اقدامات کے عدم مداخلت کا اصول طاق پر رکھ دیا اور اپنے جاگیردار سردار آمب کو ایک فرضی خطرے سے بچانے کا عذر لنگ تراش کر انگریزوں نے مداخلت کی کوشش میں

[1] ADYE صفحہ ۲۹-۳۲

اتنا کچھ داؤں پر لگا دیا۔

مبارک شاہ کے ستھانہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی جدوجہد پہلے ۱۸۶۱ء میں شروع ہو چکی تھی اور واقعات متذکرہ بالا ۱۸۶۱-۶۲ء میں رونما ہوئے۔ جولائی ۱۸۶۳ء میں سیدوں نے جادون اور عثمان زئی کی کسی مخالفت کے بغیر ستھانہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اس کے بعد سرحد پر حملے شروع ہو گئے۔ قبل اس کے کہ لوٹی پر جہاں متوقع پیش قدمی کے لیے سپاہ اور ذخیرے جمع کیے جا رہے تھے باقاعدہ لڑائیاں شروع ہوں ۱۸۶۳ء میں اس پر حملہ کر دیا گیا۔

وہابیوں کے فوجی دستے

اس وقت سرحد پر وہابی فوج کی عددی طاقت اور ساخت کا ایک مفصل حال ہمارے پاس موجود ہے[1]۔ ان کی تعداد بارہ سے چودہ سو تک تھی اور زیادہ تر بنگال[2] اور صوبہ جات وسطی و شمالی (صوبہ متوسط یوپی) اور زیریں پنجاب کے رنگروٹوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے فوجی تنظیم اختیار کر لی تھی اور روزانہ قواعد (ڈرل) کرتے تھے۔ وہ سب ہتھیاروں سے اچھی طرح مسلح تھے جن میں دو چھوٹی توپیں بھی تھیں۔ مرکز ملکہ میں ان کے ایک دھات گلانے اور ایک بارود بنانے کے کارخانے موجود تھے۔ پوری فوج دس کمپنیوں میں منقسم تھی اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ افسر ہوتا تھا۔ اس طرح:-

(۱)	جماعت میاں عثمان	سپاہی ۱۲۰	گز والی بندوقیں ۲۰	چقماق بندوقیں ۱۰۰
(۲)	جماعت شریعۃ اللہ	سپاہی ۱۵۰	" ۳۰	" ۱۲۰
(۳)	جماعت قائم خاں	" ۱۳۰	" ۳۰	" ۲۰
(۴)	جماعت قائم خاں	" ۱۳۰	" ۶۰	" ۲۰

یہ سب سے پرانی جماعت تھی جو ہندی جماعت کہلاتی تھی اور خالصتہً ہندوستانیوں پر مشتمل تھی۔

(۵)	جماعت نجف خاں	" ۱۳۰	" ۱۵	" ۳۰
(۶)	جماعت نعیم الدین	" ۱۲۵ (زیادہ تر بنگالی)	" ۶	" ۳۶

---

[1] بیلیو صفحہ ۹۹-۱۰۲۔ ان دقیق مفصل اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اطلاع کسی جاسوس نے مہیا کی ہے جو خاص اسی مقصد کے لیے متعین کیا گیا ہوگا۔ [2] مندرجہ ذیل فہرست میں بنگال سے وہ رقبہ مراد ہیں جن میں قدیم صوبہ بنگال مع بہار شامل ہے۔

(۷)	جماعت توقیر اللہ	سپاہی	۱۰۰	۱۰ ″	۲۰ ″
	یہ نئی جماعت کہلاتی تھی				
(۸)	جماعت منشی بشیر الدین	″	۱۰۰	۶ ″	۲۰ ″
(۹)	جماعت محمد ابراہیم	″	۱۳۰	۴ ″	۲۰ ″
(۱۰)	جماعت بہرام الدین بیبزی	″	۴۰	× ×	× دیسی

جماعت کہلاتی تھی اور ہزارہ بنیر اور ہمسایہ علاقوں پر مشتمل تھی۔

وہابیوں پر حملہ کا منصوبہ

ملکی اور فوجی حکام کے درمیان کوچ کے مختلف راستوں اور ہر راستے کی جدا جدا فوجی سہولتوں کے متعلق طویل بحث و تمحیص کے بعد آخر طے پایا کہ وادی چملا کے راستے سے کوچ کر کے کوہ مہابن کے نسبتاً آسان اور قابلِ عبور پہلو سے اقدام کیا جائے اور ملکہ پر عقب سے حملہ کیا جائے تاکہ اوپر وہابیوں کے کسی اور پہاڑی قلعہ کی طرف پسپا ہو جانے اور پناہ گزین ہونے کا موقع بھی باقی نہ رہے۔ وادی چملا میں داخل ہونے کا راستہ یوسف زئی میدانوں کے پہلو سے ایک تنگ درے سے ہو کر تھا۔ اس کے دوسرے سرے پر امبیلہ کا گاؤں واقع تھا اور اسی سے درّے کو اس نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک تنگ درہ تھا۔ جس کی نو میل لمبی پگڈنڈیاں جنگل اور چٹانوں سے بھری تھیں۔

انگریزوں کی پیشقدمی

پیش قدمی کا نقشہ ایک اہم مفروضہ پر بنایا گیا تھا۔ وہ تھا قبائل بنیر کی عملی مدد نہیں تو کم سے کم غیر جانبداری۔ بنیر کی زمینیں بہت نیچی پہاڑیوں کی ایک پتلی دھجی سے وادی سے علیحدہ ہوتی تھیں۔ خود امبیلہ انہیں کی ملکیت تھا۔ اس طرح انگریزی فوجوں کو خطرہ مول لے کر ایک زبردست قبیلہ کی سرحدوں کے قریب سے گزرنا تھا۔ انگریز اس قبیلے کی تاریخ اور سیاسی رجحان سے ناواقف تھے۔ اس سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اہل بنیر کو مجوزہ کوچ کی اطلاع نہ دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اپنے راستے کو مخفی رکھنے کی کوشش میں انگریزوں نے ان قبائل سے بھی مشورہ نہ کیا جو بنیر کے حلیف تھے اور سرزمین کے پہلو سے انگریزوں کے مجوزہ خفیہ کوچ کے ممکن ردعمل سے زیادہ واقف تھے۔ بنیر والوں سے مشورہ کرنا اس لیے بھی قرین مصلحت نہ سمجھا گیا کہ یہ زیادہ قرین قیاس

تھا کہ وہ نہ مانیں گے، اس کے علاوہ نقشے کا افشا ہو جانا اور اچانک حملہ کی مصلحت جو کامیابی کے لیے ضروری تھی فوت ہو جاتی، تجویز یہ قرار پائی کہ درے میں داخل ہوا جائے اور وادی چملا ہیں فوراً اور اچانک پڑاؤ کر لیا جائے تاکہ اہل بنیر اسے نوشتۂ تقدیر مان لیں۔ اُمید کی گئی تھی کہ دو ہفتے کے اندر سارا قصہ ختم ہو جائے گا۔

ٹیلر کا قبیلہ بنیر کو پروانہ

چنانچہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو جب کہ چملا یا دوسرے قبائل کو انگریزی فوجوں کا راستہ روکنے کے لیے کوئی تیاری کرنے کا وقت نہ تھا ٹیلر کمشنر پشاور نے جو فوج کے ساتھ تھا قبیلہ بنیر کو ایک پروانہ بھیج کر مطلع کیا کہ یہ مہم ہندوستانیوں کے خلاف ہے اور تمہیں کوئی اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ٹیلر کے جانشین پشاور جیمز کی رائے میں یہ نامعقول اقدام ہے اور ممکن ہے کہ اس کے نتائج مقصود کے برعکس ظہور پذیر ہوں۔ اس کی رائے میں یہ قرین قیاس نہیں کہ "جاہلوں کی ایک دلیر قوم کسی ایسے کاغذ کا جسے وہ پڑھ نہ سکتی ہو خلاصہ مضمون سمجھنے کے لیے ٹھہری رہے گی جب کہ ایک متوقع حملہ آور کے ہتھیار اس کے دروازوں پر چمک رہے ہوں۔" اس کے علاوہ عبد اللہ کو نظر انداز کر کے یہ ساری قیاس آرائی کی گئی تھی۔ حکمت عملی کے ایک استادانہ داؤں سے انہوں نے بھی ایک اعلان[1] بھیج کر قبائل سے اصرار کیا کہ "انگریزی افواج کی پیش قدمی کو روکیں اور صورت حال کے اصل خطرے سے اُن کو متنبہ کیا۔ ابھی تو اصل مقصود وہابی ہیں مگر تمہاری نوبت آنے میں بھی کیا دیر لگے گی؟ دشمن عیار اور غدار ہے اور ممکن ہے کہ تمہیں بھی زر و مال سے پھسلائے مگر تمہیں ہوشیار رہنا چاہیے۔"

انگریزی فوج محصور

یہ عظیم الشان فوج جنرل چیمبرلین کے زیر کمان مجتمع ہوئی اور ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو یوسف زئی کے میدان سے گزرتی ہوئی بڑھی اور ۲۰ اکتوبر کو درّے پر پہنچ گئی۔ فوج کا ایک حصہ وادی چملا میں داخل ہو گیا اور بلا مزاحمت دہانے پر قابض ہو گیا۔ مگر یہ دشواریوں کا آغاز تھا۔ سامان اور ذخائر ابھی درے میں اُتر رہے تھے اور ان کا انبار راستہ بند کیے دیتا تھا۔ اس لیے چیمبرلین نے فیصلہ کیا کہ جب تک

---

[1] اسی اعلان کو پورا متن تتمہ میں نقل کر دیا گیا ہے۔

فوج کا عقبی حصہ درّے کو طے نہ کرلے آگے قدم نہ بڑھایا جائے۔ بہر حال اس وقت تک عبد اللہ کا اعلان اپنا کام کر چکا تھا۔ بنیری چونک گئے تھے اور انگریزوں کے خلاف ہو چکے تھے۔ جنرل چیمبرلین نے اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۲۳ر اکتوبر میں لکھا: "کوئی شک نہیں کہ ان کا رویہ (بنیریوں کی مخالفت) ستھانہ کے ہندوستانی مذہبی دیوانوں کی کارستانی ہے۔ بعض ضبط کیے ہوئے کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب سے ان کو معلوم ہوا کہ موجودہ مہم ان کے خلاف تیار کی گئی ہے ہندوستانی اہل بنیر کو ہمارے ارادے اور ان کے ملک کے الحاق سے ڈرا کر ان کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بنیریوں کے دشمن ہو جانے سے انگریزوں نے اپنے آپ کو یوں پھنسا ہوا پایا کہ مراجعت کا ایک ہی راستہ جو درے کے نشیب سے تھا آدمیوں، جانوروں اور ذخائر سے جو اب تک اوپر آرہے تھے بند ہو گیا تھا۔ انگریزی افواج ایک گہری گھاٹی میں تھیں جس کے دونوں جانب اونچے پہاڑ کھڑے تھے اور ان کے ڈھلوان پر ایک طاقت ور قبیلہ ان پر حملہ آور ہونے کے لیے پینترے بدل رہا تھا۔ صرف یہ کہ مہم کے اعلیٰ مقصد کو ملتوی کر کے اسے ثانوی مقام دے دیا گیا تھا بلکہ خود فوج کی سلامتی خطرے میں تھی۔" اس تمام صورت حال سے عبد اللہ نے بڑے کمال سے فائدہ اٹھایا۔ ہنٹر اس کی تصویر یوں کھینچتا ہے "اب ایک عظیم سیاسی آفت کا اندیشہ تھا، ہماری فوج روزانہ کے حملوں سے چور ہو کر کسی لحظہ میں انتشار اور گھبراہٹ سے تتر بتر ہو کر درّے میں قتل و غارت کا شکار ہو جاتی"[1]

جنرل چیمبرلین کی امداد طلبی

آئندہ کئی دن وسط نومبر تک انگریزوں کی فوج تنگ گھاٹی میں محصور، وہابیوں اور قبائل کی لگاتار گولہ باری جھیلتی رہی۔ جنرل چیمبرلین نے کمک طلب کی جو دہشت زدہ صوبائی حکومت نے فوراً روانہ کر دی۔ اس کو حالات کے اس طرح بگڑ جانے پر سخت تشویش تھی، زیادہ تر اس لیے کہ اس نے یہ مہم کمانڈر انچیف کے اعتراض و خدشات کے باوجود تیار کی تھی جن میں سے بعض حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئے۔ صوبائی حکومت کی گردن شرم سے جھک گئی اور حکومت ہند کو رپورٹ لکھتے ہوئے اس نے بڑے دکھ سے بتایا کہ قبیلہ بنیر کی غداری قطعاً

---

[1] در مقال صفحہ ۵۲-۵۱

غیر متوقع تھی۔ یہ بات نہ ہوتی تو سب مراحل بالکل سہل ہوتے۔

عظیم سرحدی جنگ

کمکوں کا سیلاب اتنا بڑھا کہ اس گھری ہوئی آفت زدہ فوج کو اعانت مہیا کرنے کی کوشش میں سارا پنجاب افواج سے خالی ہوگیا۔ خود کمانڈر انچیف جھپٹ کر لاہور پہنچا۔ انگریزوں کی کمکوں کے جواب میں مختلف قبائل کی طرف سے رضا کاروں کی نئی نئی ٹولیوں کا مستقل سیلاب بھی امنڈ آیا۔ عبداللہ اور مبارک شاہ کے چچا سید عمران نے سوات کے اخوند کو خط لکھ کر اس کے تعاون اور بیش بہا امداد کی درخواست کی۔ اخوند نے اس صدا پر فوراً لبیک کہی اور ایک وسیع رقبے پر اپنے مذہبی اقتدار کی بدولت قبائلیوں کی ایک کثیر تعداد فراہم کر لی۔ دوسرے قبائلیوں، اچملا اور دیر نے بھی جہاد کی دعوت قبول کر لی۔ اکیلے باجور کا فیض طلب خاں تین سو آدمی لایا۔ افریدیوں اور عثمان زئیوں نے بھی رنگروٹ بھیجے۔ اب یہ انگریزی مہم اپنے پہلے محدود مقصد سے آگے بڑھ کر قبائلیوں کے گٹھ جوڑ (جس کی کوئی نظیر اس وقت تک دیکھی نہ گئی تھی) کے خلاف عظیم سرحدی جنگ میں منقلب ہوگئی تھی[1]

وہابیوں کی داد شجاعت

اس زمانے میں بہت سی مقامی لڑائیاں ثابت قدمی سے لڑی گئیں، جن میں فریقین نے سخت نقصانات اٹھائے ہمیں یہاں ان مقامی لڑائیوں سے بحث نہیں۔ یہاں ہم ان متعدد جھڑپوں کا حال بیان کرتے ہیں جو کریگ پکٹ میں ہوئیں، اولاً اس لیے کہ یہ متعدد مقامی لڑائیوں کا صحیح نمونہ ہیں، ثانیاً اس لیے کہ ان حملوں میں وہابی بہت نمایاں رہے۔ چیمبرلین نے ایک عرصہ دراز تک عملاً تنگ گھاٹی میں محاصرے میں رہ کر اپنے پڑاؤ کے دونوں جانب پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں پر قبضہ کر لیا، اور وہاں محافظ دستوں کی چوکیاں قائم کر دیں جو کریگ پکٹ اور "ایگلس نسٹ" (آشیانہ عقاب) کے ناموں سے مشہور ہوئیں۔ دونوں اہم مقام تھے اس لیے ان میں متعدد خونریز جھڑپیں واقع ہوئیں۔ وہابیوں نے صرف کریگ پکٹ پر چار بار حملے کیے اور قبضہ کیا اور چار بار ان کے ہاتھوں سے واپس لے لیے گئے۔ فریقین نے نمایاں شجاعت اور پامردی دکھائی لیکن ایڈائی ADYE نے وہابیوں کی بہادری اور تندی اور انگریزی فوج کی پر استقلال مدافعت

---

[1] ADYE صفحہ ۵۴

کے درمیان نمایاں فرق اور انگریزوں پر طویل المدت مدافعتی جنگ کے حوصلہ شکن اثر کی تصویر کشی کی ہے۔
۳۰؍ اکتوبر اور ۲۰؍ نومبر کے درمیان وہابیوں نے متعدد پرجوش اور دلیرانہ حملے کیے۔ انہوں نے پہاڑ کی چوٹی پر بھی قبضہ کر لیا مگر انگریزوں کی مددگار فوجوں کی بہت بڑی تعداد نے ان کو پھر وہاں سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ ۱۳؍ نومبر کو تیسرے حملے میں وہابیوں کی یورش اتنی زبردست تھی کہ "انگریزوں کی حفاظتی چوکی ہی (جو اب ۱۲۰ مضبوط جوانوں پر مشتمل تھی) مار نہیں بھگائی گئی بلکہ چھاؤنی کے سپاہیوں میں بدحواسی پھیل گئی۔" مددگار فوج غازیوں کے ہجوم کو جو مقید مقصد مقام پر مضبوطی سے جما ہوا تھا اپنی جگہ سے ہلا نہ سکی۔ ۲۰؍ نومبر کو کریگ پیکیٹ پر حملے کی آخری کوشش کی گئی۔ یہ حملہ اتنا جم کر ہوا کہ برطانوی فوج پہاڑ سے نیچے دھکیل دی گئی جس نے اس کو کافی نقصان پہنچا۔ صورت حال ایسی نازک ہو گئی کہ چیمبرلین نے فیصلہ کر لیا کہ جو دستہ حملہ آوری اور کریگ پیکیٹ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے متعین کیا گیا تھا اس کی قیادت وہ خود کرے۔ چوکی پر دوبارہ قبضہ تو کر لیا گیا مگر انگریزوں کو ۱۵۳ آدمیوں کا نقصان اٹھانا پڑا جس میں فوج کا کمان دار بھی تھا، خود چیمبرلین کا بازو سخت زخمی ہو گیا۔ اسلحہ اور ذخائر کی ایک بہت بڑی مقدار وہابیوں کے ہاتھ لگی۔ کئی انگریز گرفتار بھی کر لیے گئے۔

سڑک کی تعمیر و انہدام

صوبائی حکومت سرحد کی صورت حال سے بے خبر، اب تک پہلے مقصد (ملکہ کی تباہی) کی تکمیل پر زور دیے جا رہی تھی۔ لیکن چیمبرلین نے مناسب نہ سمجھا کہ قبائلیوں کے گٹھ جوڑ سے اپنی فوج کے بازوؤں کو خطرے سے نجات دلائے بغیر مزید پیشقدمی کی جائے اس نے اس صبر آزما جنگ میں مبتلا رہنے کے سبب سے اور یوسف زئی واپس جانے کے لیے ایک متبادل راستہ حاصل کرنے کے لیے پہاڑ کے ڈھلان پر ایک سڑک تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ سیدھی ملکہ جانے والی ایک اور سڑک کی تعمیر میں بھی ہاتھ لگا دیا گیا تاکہ اگر ممکن العمل ہو تو اس پر چڑھائی کرنے میں آسانی ہو۔ مگر وہابی بھی اس کا جواب دینے کو تیار تھے۔ انجینروں کی جماعتیں اکثر الگ ہو کر مختلف خطوں میں پھیل جاتیں اور اس کے افراد گرنے والوں سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے۔ ان پر حملہ کر کے بھگا دیا اور سڑک کے تعمیر شدہ حصے توڑ دیے جاتے یا چٹانوں اور درختوں سے بند کر دیے جاتے[1]

---

[1] وہابیوں کے گوریلا طرز جنگ کے مفصل بیان کے لیے ملاحظہ ہو در مقال صفحہ ۱۹۶-۲۰۶

انگریزی سپاہ کی بدحالی

دسمبر تک تقریباً نو ہزار باقاعدہ فوج جس میں ۹۳ ہائی لینڈرز وغیرہ کی چیدہ رجمنٹیں شامل تھیں سرحد پر تعینات کر دی گئیں اور یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی کہ ایک زبردست برطانوی فوج پورے ہفتوں درے میں بند دشمن کے حملوں سے بے بس اور لاچار پڑی رہے اور ایک ضرب بھی نہ لگا سکے[1] ہنٹر کے قول کے مطابق اس کا اصل سبب یہ تھا کہ انگریزوں نے مذہبی دیوانوں کی نوآبادی کے اُس اثر و اقتدار کا غلط موازنہ کیا جو اُسے سرحد میں حاصل تھا جو لوگ دین کی خاطر ان سے مل گئے تھے وہ مالِ غنیمت کے لالچ یا شہادت کی آرزو میں بے تاب تھے۔ اور ان سے کم ایمان والوں کو ان کی سرزمین پر انگریزوں کے قبضے کا خوف دلایا جاتا تھا۔ صورت حال فوجی اور سیاسی دونوں اعتبار سے دشوار ہوتی جا رہی تھی۔ فوج کا کمان دار جنرل چیمبرلین زخمی ہو کر ناکارہ و مجبور پڑا تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ایلجن "اندرونی پہاڑوں" میں حالات سے بے خبر اور کوئی ہدایت دینے سے مجبور بستر مرگ پر پڑا تھا۔ تمام حالات کا بھاری بوجھ حیران و پریشان و فکر مند لفٹنٹ گورنر کے کاندھوں پر تھا۔ ۲۰ نومبر کی لڑائی کے بعد جنرل چیمبرلین کے مراسلے نے صوبائی حکومت کو اس قدر مختل و بدحواس کر دیا تھا کہ وہ عام پسپائی کا حکم دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر سر ہیف روز HUGH ROSE کمانڈر انچیف کے استقلال اور ایک زبردست کمک کی فراہمی نے اس رسوا کن اقدام سے بچا لیا۔ ایک خطرہ اور تھا" ہر چند ہماری دیسی سرحدی رجمنٹوں نے اب تک اپنی وفاداری اور ہمت کا ثبوت دیا تھا پھر بھی یہ سمجھ لینا کہ وہ ہفتوں پر ہفتے اپنے ہی عزیزوں اور قرابت داروں سے لڑتے چلے جائیں گے فطرت انسانی کے خلاف تھا۔"

سیاسی صورت حال اور بھی خراب تھی۔ سارے سرحد میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کابل میں بھی قبائلی حلیفوں کے لیے عملی امداد نہیں تو کافی ہمدردی ضرور تھی۔

برطانوی حکام کا قبائلیوں سے سیاسی گٹھ جوڑ

برطانوی حکام نے کھلم کھلا جنگ سے اپنا مقصد حاصل ہوتے ہوئے نہ دیکھا تو سیاسی جوڑ توڑ شروع کر دیا جس میں وزنی زر دھات کے کبھی پٹ نہ پڑنے والے

---

[1] ہنٹر اور انڈین مسلمان صـ ۳۶

پالنسون کی تحریص کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ کمشنر جیمز اور بالخصوص پولیٹیکل افسر نے حلیف قبائل کے آپس میں نفاق کے بیج بونا شروع کر دیے۔ ہنٹر[1] سچائی سے اقرار کرتا ہے کہ "پہاڑی قبائل کے ائتلاف میں ہمیشہ تلون رہتا ہے۔ اور جس چیز کو ہمارے اسلحہ حاصل نہ کر سکے وہاں پھوٹ اور حکمت عملی اپنا کام کرنے لگی" شروع دسمبر میں جیمز نے میجر جنرل گارواک کو جو جنرل چیمبرلین کا جانشین ہوا ایک یادداشت بھیجی جس میں اہل بنیر کے درمیان اندرونی نزاع اور عداوت کے وجود کی خبر دی۔ قبائل بنیر جو پہلے اپنے وطن کی محافظت و مدافعت میں لڑا کرتے تھے اب جنگ سے تنگ آ چکے ہیں اور آپس میں متفرق ہو گئے ہیں۔ چیمبر[2] کا مسلسل دباؤ اور مالی تحریص آخر بنیریوں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ جنگ جو وہابیوں کی اتنی امیدوں کے ساتھ بے نظیر جوش و خروش اور قبائل کے تعاون سے شروع ہوئی تھی محض قبائل کے نفاق اور خود غرضی سے ناکامی پر انجام پائی۔ آخوند نے شروع میں کوشش کی کہ وہ قبائلی غداریوں کی ہولناک موجوں سے بے داغ نکل جائے مگر ناکام ہوا اور آخر میں محض ایک بے بس تماشائی بن کر رہ گیا۔

وہابیوں کا جذبہ شہادت

جنگ کے آخری مرحلوں میں وہابی چند باجوڑیوں کے ساتھ زبردست حریف کے مقابلے کے لیے تنہا رہ گئے تھے۔

عبداللہ نے اپنے رفقا کی مختصر جماعت کے ساتھ جنگ کرنے کی اس امید پر کہ قبائل کی رگ حمیت و عزت نفس کو متحرک کر کے جنگ میں دوبارہ شرکت کے لیے آمادہ کر دیں ایک عظیم الشان گو خلاف مصلحت کوشش کی۔ اس آخری محاربہ کے آغاز سے پہلے ایک پرجوش تقریر کی جس میں اپنے متبعین پر زندگی کی ناپائیداری اور ہتھیار ڈالنے کی بجائے لڑائی میں جان دینے کی فضیلت پر زور دیا۔ وہابی ان کی فصاحت سے متاثر ہو کر اور ایک خود فراموشانہ جوش سے مشتعل ہو کر بڑی جانبازی سے لڑے۔ ان کی صفیں ایک فولادی دیوار کی طرح بے لچک جمی رہیں۔ وہابیوں کی ایک بڑی تعداد لڑتے لڑتے گر گئی عبداللہ پھر ایک بار دوسرے مرحلے میں انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پیچھے ہٹ گئے۔

ملکہ کی تباہی: جنگ تو ختم ہو گئی مگر اس مہم کا قرار دادہ مقصد یعنی ملکہ کی تباہی کی تکمیل باقی

---

[1] ایضاً صفحہ ۳۷ [2] در مقال صفحہ ۳۴۸-۳۴۹

رہ گئی۔ بنیریوں کی پسپائی کے بعد بھی انگریز جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ ایک دفعہ وہ بنیریوں کی غیر جانبداری پر یقین کر چکے تھے اور اس کا خمیازہ بھی بھگت چکے تھے۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ وہ ایسے دہشت زدہ تھے کہ اب وہ اور آگے افرائی اور عدی خیل قبائلی علاقے میں قسمت آزمائی کے لیے تیار نہ تھے جہاں سے گزرنا ضرور تھا اگر ملکہ جانا تھا۔ درمقال کا مصنف انگریزوں کی فتحیابی کے بعد بھی ان کے خوف اور تذبذب پر طویل بحث کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح اُن کو ملکہ کی تباہی کے لیے افرائیوں اور بنیریوں کی اعانت خریدنا پڑی تھی۔ وہ طنزاً لکھتا ہے کہ بنیری کس طرح کوچ میں آگے آگے تھے اور بہادر انگریز پیچھے پیچھے رینگتے رہے۔

اب جیمز ہی نے پھر ایک انوکھا منصوبہ گانٹھا۔ تباہی کا اصل کام بنیری افرائی اور خودی خیل قبیلوں کو انجام دینا تھا کیونکہ ایک بار کھل کر مذہبی دیوانوں کی مخالفت کرنا اس بات کی یقینی ضمانت تھی کہ وہ ان کو پھر آنے نہ دیں گے۔ لیکن معاملہ کو زیادہ یقینی بنانے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ تباہی واقعی انجام پذیر ہو گئی، چند برطانوی افسروں کا بھی اس گروہ کے ساتھ جانا قرار پایا۔ وہ ۱۹ر دسمبر کو پولیٹیکل افسر کرنل ٹیلر کے ساتھ روانہ ہوئے ۲۱ر دسمبر کو وہ اُس جگہ پہنچے اور ایک رات ٹھہرنے کے بعد تباہی کا کام شروع ہو گیا۔ جیمز اُس جگہ کا اور اُس کی تباہی کا حال یوں بیان کرتا ہے۔

"ملکہ مہابن پہاڑ کے شمالی برآمدہ چٹان پہ ایک سب سے بلند سطح مرتفع پہ واقع ہے۔ یہ ان پہاڑوں میں تمام معلوم مقامات سے بہت بڑا اور کثیر المنفعتہ تھا۔ ان میں بہت سی عمارتیں تھیں اُن میں مولوی کے خطبات کا ہال، سپاہیوں کے بارگ، اصطبل اور بارود کا کارخانہ نمایاں تھے۔ کوئی باقاعدہ قلعہ بندی تو نہ تھی لیکن گھروں کی بیرونی دیواریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی اور عقبی دروازے سب مل ملا کر ایک مسلسل خط مدافعت بناتے تھے۔ باہر کے پھاٹک پہ ایک مینارہ بھی تھا۔ یہ مقام آدمیوں سے خالی پایا گیا اور دوپہر تک مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ (۲۲ر دسمبر) مہر سید محمود شاہ ستھانہ کے براہ راست اولاد عبدالجبار شاہ کی اس مضمون کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ملکہ کو واقعی آگ نہیں لگائی گئی۔ مگر اس واقعہ پہ انگریزی دستاویزات

---

[1] عبدالحق۔ صحیح رقم جو ان کو اس کام کے لیے دی گئی ۴۰۰ دینار بتاتے ہیں۔ درمقال ۳۴۹

کی شہادت واضح ہے جیمز بھی اپنے منقولہ بالا خط میں بعض افرائیوں کے گاؤں سے ایک کو بچا لینے کی کوشش کا ذکر کرتا ہے، اس دلیل سے کہ وہ ان کی ملکیت ہے، نہ کہ وہابیوں کی۔ مگر یہ عذر رد کر دیا گیا اور پوری جگہ جلا دی گئی۔

انگریزی سپاہ کا بھاری نقصان

یہ معرکہ انگریزوں کو آدمی اور روپے دونوں اعتبار سے بہت مہنگا پڑا۔ ان کے نقصانات ۸۴۷ مقتول و مجروح یا پوری فوج کی چوتھائی تک پہنچ گئے، جب کہ اس کی کل تعداد نو ہزار تھی۔ یہ صرف درے میں نقصانات کا ذکر ہے اور ان آدمیوں کے علاوہ ہے جو ٹھنڈ اور بیماری سے ہلاک ہوئے دوسری طرف کا نقصان قبائلیوں سمیت تین ہزار تھا۔

جنگ امبیلہ انگریزوں کی نظر میں

صوبائی حکومت نے مہم کے نتیجہ پر یوں تبصرہ کیا کہ پہلے کبھی کسی موقع پر پہاڑوں میں لڑائی اتنی شدید، مستقل و دیرپا نہیں ہوئی، قبائلیوں کے درمیان وہابیوں نے زبردست اتحاد قائم کر دیا تھا جس میں وہابیوں کی رائے کو غلبہ رہتا تھا۔ اتنی بڑی برطانوی فوج کے ایک نسبتاً معمولی سے مقصد کے حصول کے لیے اتنی مدت لگانے سے قبائلیوں کی نگاہ میں انگریزوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ اور اتنی قربانیوں پر بھی زیادہ اہل نظر انگریز افسر اور معاصر اہل قلم یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ اختلاف کی دائمی علت کا خاتمہ نہ ہو پایا۔ ADYE[1] اڈائی رائے زنی کرتا ہے کہ "من حیث المجموع یہ جنگی مہم بالکل قابل اطمینان نہ تھی" ہنٹر اس بات کا رونا روتا ہے کہ "ہمارے زندان کے پھاٹک اُن جوق در جوق نامراد شوریدہ سر باغیوں کے لیے بند ہو گئے، ہماری عدالتوں نے سرغنوں کی جماعتوں کو یکے بعد دیگرے سمندر پار خاموش جزیروں میں بھیج دیا۔ پھر بھی سارا ملک ہماری سرحد پر اسلام کے یاس زدہ لوگوں کو روپے اور آدمی بھیجے جاتا ہے اور مسیحی حکومت کے خلاف خونیں احتجاج پر سختی سے جما ہوا ہے"[2] جیمز نے اپنے خط منقولہ بالا میں یوں رائے زنی کی ہے۔ مذہبی دیوانوں کی نوآبادی جو اس ہمت و استقلال سے ہماری سرحدوں پر منڈلا رہی تھی اور ہمارے انتظامیہ پر ایک داغ تھی۔ اب نصف تباہ ہو چکی اور مہمان کش اور ناموافق علاقوں

---

[1] صفحہ ۹۱ [2] آور انڈین مسلمان صفحہ ۱۲۲ - ۲۳

(جزائر انڈمان) میں بسا دی گئی ہے) مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ہمیشہ کے لیے جڑ سے اکھاڑ پھینکی جائے گی۔" جیمز اپنے اس یقین میں غلطی پر تھا۔ یہ حقیقت دوسرے معرکہ (یعنی دوسری مہم کوہ سیاہ) سے پھر اس کے بعد کے معرکوں سے واضح ہو جائے گی۔

وہابی تحریک کا مقصد

اوپر کے بیانات سے یہ واضح ہو چکا ہو گا انگریز سرحد پر وہابی ریاست کے وجود کو ہندوستان میں اپنی حکمرانی کی استقامت کے لیے بالقوہ خطرہ سمجھتے تھے۔ صورت حال کا جو اندازہ انگریزوں نے لگایا تھا وہ درست تھا کیونکہ وہابیوں کے خلاف انگریزوں کی بعد کی آویزشوں کے بیان سے واضح ہو جائے گا کہ وہابی جب کھلم کھلا حریف نہ بھی ہوتے تھے "تو اکثر قبائلی کشمکشوں میں اندر اندر ان کی ریشہ دوانی ثابت ہوتی تھی۔ وہ عناد پیدا کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ وہ کسی بھی غنڈے خاں جو انگریزوں کے خلاف اقدام کے لیے آمادہ کیا جا سکے گٹھ جوڑ کر لینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔"[1] ان ناقابل تردید حقائق کے مقابلے میں یہ نظریہ رکھنا کہ وہابی تحریک قطعاً سکھوں کے خلاف چلائی گئی تھی نہ کہ انگریزوں کے خلاف، تحریک کی تاریخ کے بہت بڑے حصے سے بالکل انکار کرنا ہے۔

---

[1] اولیور صفحہ ۲۹۰-۹۱

باب ۷

وہابی ۵۹-۱۸۵۷ء کی تحریک میں

جنگِ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد کی صدی میں ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی تدریجی توسیع اور استحکام پیدا ہو گیا۔ ساتھ ہی سازشوں، شورشوں اور عموماً مختلف کیفیت اور کمیت کی انگریزوں کے خلاف تحریکوں نے سر اٹھایا۔ ان تحریکوں میں ۱۸۵۷ء کی تحریک اور وہابی تحریک سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان میں جہاں اول الذکر تاریخ وقوع کے فوراً بعد ہی سے بعض مستند و وسیع النظر مطالعہ کا موضوع رہی ہے اور فی الحال بھی ان میں بعض بیش بہا تحریروں کا اضافہ ہوا ہے، وہاں آخر الذکر پر اب تک کافی کام نہیں ہوا۔

۵۹-۱۸۵۷ء کی تحریک کے بعض مستند مورخین نے وہابی تحریک کے صرف اُس پہلو پر جس کا تعلق ۵۹-۱۸۵۷ء کی تحریک سے ہے بہت مختصر اور سرسری نگاہ ڈال لی ہے مگر ان کے اسلوبِ نگارش میں ایک اہم اور نمایاں نقص یہ ہے کہ بیان اصلی سباق و سیاق سے جدا ہوتا ہے۔ مثلاً وہابیوں کی بنا اور احوال ماضی، ان کی تحریک کے اغراض و مقاصد، ان کی تنظیم، ان کے پیشوا و قائدین اور ازیں قبیل دوسرے نکات بالکل نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف وہابیوں کی لامتناہی کارروائیوں کے معنی و مقصد کی توضیح صحیح طور پر نہیں کی گئی۔ جب ۱۸۵۷ء کی عظیم آویزش شروع ہوئی تو اُس سے تیس سال پہلے سے ہی وہابی اپنی تحریک چلا رہے تھے۔ مگر اس حقیقت پر کسی نے صحیح طور پر زور نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۵۹-۱۸۵۷ء کی تحریک کی عام تاریخوں میں وہابی ناقابل فہم اور بے جوڑ

سے عنصر دکھائی دیتے ہیں وہ کس جماعت کی نمائندگی کرتے تھے ؟ وہ اس زور شور سے انگریزوں کے خلاف سرحد کے علاقے میں کیوں لڑتے رہے ؟ پھر اس کے برخلاف بہار میں جو بہت پہلے سے تحریک کا اصل مرکز رہا وہ دوسری طرح کی کارروائیوں میں کیوں مصروف رہے ؟ بے رحمانہ اور کامل سرکوبی کے بعد بھی اتنے عرصے تک ایک اہم سیاسی عنصر کی حیثیت سے کس طرح باقی رہ گئے ؟ یہ اور ایسے ہی متعلقہ سوالات بغیر جواب چھوڑ دیے گئے۔ شاید بعض مورخ اس فروگزاشت کو محسوس کرتے تھے۔ مثلاً مالیسن نے وہابی کے موضوع پر ایک مختصر تتمہ کا اضافہ کر کے اس کی جزوی تحلیل کی کوشش کی ہے مگر ظاہر ہے کہ وہابی تحریک جیسے موضوع پر بحث کرنے کے لیے محض تتمہ کوئی صحیح مقام نہیں۔[1]

اگرچہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کی کیفیت وکمیت کا مفصل تجزیہ تالیف ہذا کے احاطہ تحریر سے باہر ہے دونوں تحریکوں کے درمیان مناسبت و تقابل کے کچھ نکات ذیل میں دیے جاتے ہیں تاکہ جو سوالات اوپر اٹھائے گئے ہیں ان کا حل اور اُس تحریک کے ساتھ وہابی تحریک کے تعلق کا ادراک کیا جا سکے۔

تحریک ۱۸۵۷ء اور وہابی تحریک کا موازنہ

ایک متفقہ فوج چیلنج کی حیثیت سے ۱۸۵۷ء کی تحریک ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے لیے ایک نہایت زبردست چیلنج تھی۔ اگرچہ یہ ایک زمانہ دراز کی مختلف النوع بے چینیوں کا نتیجہ تھی مگر بظاہر اس کا ظہور ناگہانی شعلہ فشانی کی طرح ہوا، تند و تیز، ایسا بپا اور آگ اور خون کی ایک لکیر پر ختم ہو جانے والا۔ یہ تاریخ ہند کے افق پر شہاب ثاقب کی چمک اور رفتار سے چمکی اور اڑ گئی۔ دوسری طرف وہابی تحریک ایک دیرپا آویزش تھی جو آدھی صدی سے زیادہ قائم رہی اور اپنی مدتِ حیات میں شدت اور حرکت کے متنوع و مختلف مدارج سے گزرتی رہی۔ اس کا بھی انگریزوں کے خلاف روبرو جنگوں سے سامنا ہوا مگر وہ ۱۸۵۷ء کی ناگہانی شورش کے برخلاف سیاسی جدوجہد کے ایک نہایت منظم، وسیع و طویل الذیل جال پر مبنی تھی۔

تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے اسباب

ایک بہت بڑی فروگزاشت جس سے ۱۸۵۷ء کی تحریک نے نقصان اٹھایا اور جو فی الحقیقت اس کے ناکام انجام کا ایک سبب ہوئی وہ ایک متحدہ مقصد اور متفقہ دستور العمل کا فقدان تھا۔

---

[1] مالیسن جلد ۵ صفحہ ۴۶۵-۴۶۶

سارا شمالی ہند جدا جدا اکھاڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر ایک اپنے اپنے سردار کے تحت تھا۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ان تمام حالات میں برطانویوں کے خلاف ایک مشترک مقصد کام کر رہا تھا اور ان سرداروں کے درمیان کسی نہ کسی قسم کا باہمی رابطہ ضرور تھا لیکن من حیث المجموع یہ بھی حقیقت ہے کہ آویزشیں اکثر چھوٹے چھوٹے اور جدا جدا محاذوں پر بٹی ہوئی تھیں۔ مختلف جدوجہد کو ملانے والی کوئی مرکزی تنظیم نہ تھی۔ اس کے برخلاف وہابی تحریک کی ایک نہایت باقاعدہ اور موثر یا اندرونی تنظیم تھی۔ سماجی یا دینی اور فوجی دونوں امور کے دونوں فرائض دو علیحدہ علیحدہ بازو سمجھے جاتے تھے۔ گو خلیفہ صدر اور مرکزی فرمانروا ہوتا تھا۔ جماعت کا ایک بازو تحریک کے ملکی مذہبی پہلو کی نگرانی کرتا۔ تمام ملک میں عبادات، چلسے، نئے رنگروٹ بھرتی کرنا اور ان کی تربیت، خیراتی اور تعلیمی کام اور جماعت کے آشیانوں کی نگرانی کا نظم تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ دوسرا بازو سیاسی فوجی معاملات سرانجام دیتا۔ جیسے سرحد کو بھیجنے کے لیے آدمی اور سازو سامان مہیا کرنا، انگریزوں کے خلاف تبلیغی لٹریچر کی اشاعت اور انگریزی فوج میں اپنے آدمیوں کو گھسانا۔

وہابی تحریک کا عقیدۂ ہجرت

وہابی تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے آغاز ہی سے شدت سے عقیدۂ ہجرت کے زیر اثر رہی جس کا تقاضا یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف محاربہ ملک کے باہر سے ایک قسم کی عارضی حکومت کے ذریعے سے ہو جو برطانوی ہند سے باہر کے علاقے میں قائم ہو۔ اس لیے اس تحریک نے برطانوی ہند کے علاقے سے ہجرت کرنے اور ایک علیحدہ آزاد ریاست قائم کرنے پر بہت زور دیا۔ تاکہ جنگ یوں لڑی جائے جیسے دو جدا جدا آزاد حکومتوں میں لڑی جاتی ہے۔ چنانچہ وہابی انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کے دوران ایک مخصوص قطعہ زمین کے مالک تھے اور ایک فوج رکھتے تھے جو اس کی مدافعت کرے اور اپنے نظریات پر مبنی ایک دستور اساسی کا خاکہ بھی رکھتے تھے[1]

دوسری طرف ۱۸۵۷ء کی تحریک انگریزوں کو بزور اسلحہ ملک بدر کرنے کی کوشش ملک کے اندر سے تھی۔ بے شبہ اس شورش کو عام ملکی (غیر فوجی) سہارا حاصل تھا جس کی پشت

---

[1] وہابیوں کے قریب قریب تمام رسالے اور منشور ہجرت کی ضرورت اور فضیلت پر زور دیتے ہیں

پردیسی فوجیں بھی تھیں، خصوصاً اودھ اور بہار کے علاقہ شاہ آباد میں تحریک نے ایک قومی بغاوت کی ضخامت وجسامت تو اختیار کر لی مگر اصلاً یہ ملک کے اندر سے ایک بغاوت تھی۔ اس شورش کے دوران میں ملک کے بہت سے حصوں میں برطانوی حکومت کا وجود ختم ہوگیا تھا مگر اس کی جگہ پر کوئی علیحدہ نظام حکومت رونما نہ ہوا اور اس کے لیے وقت بھی نہ تھا کیونکہ انگریزوں نے اس کے فوراً بعد ہی ان علاقوں پر دوبارہ تسلط قائم کر لیا۔ بہار میں بعض مقامات پر کسی نہ کسی قسم کا عارضی نظام حکومت قائم بھی کیا گیا تو وہ موجودہ برطانوی نظام کا محض چربہ تھا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک پر وہابی تحریک کا اثر

۵۹-۱۸۵۷ء کی تحریک کے بعض پہلوؤں پر وہابی تحریک کا بالواسطہ اثر بھی معنی خیز ہے۔ وہابیوں کی پختہ و مستقل تنظیم نے جو تمام شمالی ہند پر حاوی تھی، ہندوستانی فوجوں میں اُن کے خفیہ گوشوں نے اور مختلف دیسی ریاستوں جیسے ٹونک، حیدرآباد وغیرہ سے ان کے ساز باز ان کو ایک پختہ تنظیمی مرکز مہیا کر دیا تھا جس کی ۵۹-۵۷ء کے قائدین نے براہ راست تقلید کی اور کام میں لائے۔

پٹنہ کی مرکزی حیثیت

۵۹-۱۸۵۷ء کی تحریک میں وہابیوں کی روش کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے دونوں تحریکوں کے ان فرقوں کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے بہار میں ہم دیکھتے ہیں کہ سید احمد کے زمانہ سے ہی پٹنہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے فعال مرکز کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہابی شورش انگریزوں کی ایک جماعت کے باوجود اور اس کی کارروائیوں کی رپورٹیں حکومت کو بھیجی جاتی رہی ہیں۔ بعد کے دس بیس سال کے دوران میں یہ مختلف جتھوں کا مرکز اجتماع رہا۔ جو ایک دوسرے کے علم کے ساتھ مگر زیادہ تر اپنی مرضی سے حکومت کے خلاف کارروائیوں میں معروف رہا۔ درحقیقت پٹنہ میں ۱۸۳۱ء سے وسط ۱۸۵۷ء کی شورش تک ان جتھوں کے قائدین کی کارگزاریوں کا مطالعہ ایک بڑا دلچسپ و دلکشا میدان ہے جس کی طرف اب تک کافی توجہ نہیں دی گئی۔

ولیم ٹیلر جو ۱۸۵۵ء میں پٹنہ کا ڈویژنل کمشنر بہار کے معدودے چند دور اندیش افسروں میں سے تھا۔ وہ صوبائی حکومت کو بار بار شہر میں حکومت کے خلاف جدوجہد کے بڑھتے ہوئے زور سے متنبہ کرتا رہا۔ اس بات کی اسے داد دینا پڑتی ہے کہ وہ بہار میں کام کرنے والے مختلف جتھوں کی علیحدہ علیحدہ شخصیتوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ اُسے اس حقیقت کا خاص طور پر احساس تھا کہ وہابی ایک

منفرد جماعت ہے۔ وسط جون ۱۸۵۷ء میں اس ڈویژن کی صورت حال، جن اطراف سے اُسے شورش کا احتمال تھا اور ان میں سے ہر ایک کے سدِ باب کے لیے اقدامات کے لیے سب کچھ لکھ کر وہ تبصرہ کرتا ہے۔[1]

"اگرچہ میرا خیال ہے کہ مخالف مسیحی بیگ کے چلاتے ہیں تمام فرقے اس وقت اپنے فرقہ وارانہ تفرقوں کو محو کر دیں گے اور نصاریٰ کے مقابلے میں متحد ہو جائیں گے اگر دو خاص حلقے ایسے ہیں جن سے پٹنہ میں خطرے کا اندیشہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو اودھ کے الحاق کے بعد سے لکھنو کی پارٹی کے طرف داروں کی طرف سے دوسرے وہابیوں کے متشدد اور کثیر التعداد فرقے کی طرف سے ان کے علاوہ ایک بڑا خطرہ شورش پھوٹ پڑنے پر عوام الناس کی برافروختگی سے بھی متوقع ہے۔"

پیر علی کی خدمات

ٹیلر کے اس موازنہ کی تائید ۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو پٹنہ کی اُس مختصر اور شان دار شورش کی بنا سے بھی ہوتی ہے، اس اہم واقعہ کی تفصیلات سے ابھی ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں، صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ حکومت کی بعض پالیسیوں کے سبب سے تمام بہار اور بالخصوص پٹنہ میں عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی، جسے ٹیلر "غداری کا گندہ حوض" کہتا ہے۔ کئی جتھے حکومت کے خلاف کام کر رہے تھے۔ لکھنؤ کے جتھے کا بڑا کارگزار پیر علی تھا۔ جو ۳ جولائی کی شورش کا ہیرو تھا اور پٹنہ کے تھانہ کوٹ گشت کے داروغہ مہدی علی کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ ڈمری ضلع پٹنہ کا ایک دولت مند زمیندار علی کریم[2] تھانہ بند راج ربردراج / مبلغ مظفر پور کے جمعدار وارث علی کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا۔ یہ دہلی کے جتھے کے نمایندے تھے۔ پھر مقامی وہابی تھے جو زیادہ عرصہ سے حکومت کے خلاف کام کر رہے تھے مگر ان کی کارروائیاں زیادہ تر ان کی اصل جد و جہد کے مرکز یعنی سرحد پر آزاد ریاست کے استحکام و ترقی کے لیے مخصوص تھیں۔ پیر علی کا بڑا مقصد اپنے ساتھی مسیح الزماں لکھنوی

---

[1] کمشنر پٹنہ کا خط سکریٹری حکومت بنگال کے نام مورخہ ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء

[2] علی کریم کی زندگی اور کارروائیوں کے مفصل بیان کے لیے دیکھیے مؤلف کا انڈین سٹوریکل ریکارڈس کمیشن کے جلد ۳۳ صفحہ ۹-۱۵ ۱۹۵۸ء

کی ہدایت کے مطابق ان علیحدہ علیحدہ جتھوں کی کارروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور بے چینی کے نسبتاً منتشر احساسات کو ملا جلا کر حکومت کے خلاف ایک زبردست اور متجانس طاقت میں منتقل کر دینا تھا۔ پیر علی کے نام مسیح الزماں کے بہت سے خطوط جو شورش دبنے کے بعد پکڑے گئے وہ اس کے اس مقصد کے حصول کی جدوجہد کی بین دلیل ہیں۔ پیر علی کے نام ایک خط میں وہ اسے ہدایت کرتا ہے کہ علی کریم سے رابطہ قائم کرے جس کا تعاون بہت قیمتی اور ضروری ہے اس نے مزید لکھا کہ "وہابیوں کے سرداروں ولایت علی یا مقصود علی کے خاندان میں سے کسی ایسے فرد سے تمہارے دوستانہ تعلقات ہوں جسے تم ہمارے کام کے لائق سمجھتے ہو تو مجھے مطلع کرو۔ میرا خیال ہے ہمیں کسی ذات یا نسل سے اختلاف نہ کرنا چاہیے۔ ہندو سے بھی نہیں۔ کیونکہ ہمیں محنت سے اپنا کام انجام دینا ہے اور اختلاف میں بے شمار جھگڑے ہوتے ہیں میں اپنی نسبت کہتا ہوں کہ میرے تعلقات وہابیوں سے ان لوگوں سے جو کمزور اور متزلزل ہیں اور بہتوں سے شیعہ اور رافضی سے بھی اچھے ہیں۔" اس معاصر خط سے ظاہر ہے کہ وہابی ایک علیحدہ جماعت تھی۔

پیر علی پٹنہ کے وہابیوں کے سردار فرحت حسین سے مجوزہ شورش میں شرکت کے متعلق گفتگو کا ذکر جو صاحب "تذکرہ صادقہ" نے کیا ہے ایک قیمتی شہادت ہے۔ فرحت حسین نے اس تجویز سے جن اسباب سے اختلاف کیا ان سے ابھی بحث کی جائے گی۔

ٹیلر کا منصوبہ

ٹیلر نے اپنے مخصوص مکمل گو خلاف دیانت انداز میں سازش کے تینوں جتھوں سے بحث کی ہے۔ ہمیں یہاں دراصل وہابیوں کے ساتھ اس کے سلوک سے بحث ہے۔ چونکہ یہ ان اہم وقائع میں سے ہے جن میں مقامی وہابی قائدین نمایاں حصہ رکھتے تھے اس کا ذکر خود ٹیلر[1] کی روایت کی بنا پر کیا جاتا ہے جو اس حزینہ ڈرامہ کا سب سے نمایاں کردار ہے۔

وہابیوں کی غیر معمولی تنظیم و اطاعت

ٹیلر کے مطابق وہابیوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اپنے سردار یا پیر کی کامل اطاعت ہے۔ ایک وہابی سردار ایک سطر لکھے بغیر ایک خفیہ پیغام ناقابل یقین قلیل مدت میں پٹنہ سے لاہو

---

[1] ٹیلر کی "اور کے السس" کلکتہ ۱۸۵۸ء صفحہ ۲۶-۳۶

پہنچا سکتا تھا۔ اور سردار کے حکم کی تعمیل بے چون وچرا ہوتی تھی۔ اس لیے ٹیلر نے فیصلہ کر لیا کہ ان کے سرداروں کو گرفتار کر لیا جائے، نہ صرف اس امید پر کہ ان کو سزا دینے کے لیے کافی ثبوت حاصل کیے جائیں بلکہ زیادہ تر ان کی پوری برادری کی نیک چلنی کے لیے یرغمال کے طور پر۔ مگر وہ ان کو کھلم کھلا گرفتار کرنے سے خائف تھا کہ کہیں گرفتاری سے مدافعت کی نوبت نہ آجائے اس لیے اس نے ایک انوکھا اور غیر معمولی منصوبہ گانٹھا۔ اس نے شہر کے معزز باشندوں کے نام ایک گشتی چٹھی جاری کر کے اُن کو کسی شورش یا فساد کے برپا ہونے کی صورت میں کچھ امتناعی اقدامات پر بحث کرنے کے لیے اپنی کوٹھی پر بلایا۔

قائدینِ وہابی تحریک کی گرفتاری

دوسرے دن ۱۹ر جون کو یہ معززین حاضر ہوئے جن میں احمد اللہ، محمد حسین اور واعظ الحق بھی شامل تھے۔ ان کے لیے کھانے کی میز کے گرد نشستیں مرتب کر دی گئیں۔ جب سب جمع ہوئے تو ٹیلر خود کپتان روٹرے کلکٹر، صوبہ دار ہدایت علی اور کچھ اور لوگوں کے ساتھ داخل ہوا۔ مفروضہ مشورہ شروع ہوا اور ٹیلر اس دوران میں تین مقصود شکاروں کے طرز و انداز پر متحیر تھا جنہیں ہونے والی گرفتاری کا کچھ علم تھا۔ لیکن اس نے ان کے صبر و استقلال کی تعریف کی۔ جب جلسہ گاہ کی برخاستگی کا اعلان ہوا تو ان تینوں وہابی سرداروں سے شائستگی کے ساتھ درخواست کی گئی کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں جب اور سب لوگ جا چکے تو ٹیلر نے اعلان کیا کہ اگرچہ ہمارے پاس آپ کے جرم کا کوئی قطعی ثبوت تو نہیں مگر میں آپ کی گرفتاری کو ضروری احتیاطی اقدام سمجھتا ہوں۔ ان مولویوں نے اس ضرب کو ایسی حیرت ناک حاضر دماغی اور شائستگی کے انداز سے سہار لیا جو لائق تحسین ہے" جب وہ ایک سکھ رجمنٹ کی حفاظت میں اُس وقت کے سرکٹ ہاؤس کو لے جا کر نظر بند کر دیے گئے۔ ٹیلر پھر آکر ایک دھمکی دے گیا، اس نے احمد اللہ سے کہا کہ "میں نے تمہارے والد الٰہی بخش کو جو بوڑھے اور ضعیف ہیں گرفتار نہیں کیا" مگر یہ بھی جتا دیا کہ تمہارے ساتھ عارضی رعایت منحصر ہو گی تمہارے ساتھیوں کی نیک چلنی پر۔ یاد رکھو کہ اُن کی (الٰہی بخش کی) زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہاری ان کے ہاتھ میں۔"

ٹیلر کا غلط دعویٰ

ٹیلر اپنی ان شیطانی حرکات پر فخر سے اپنی پیٹھ یوں ٹھونکتا ہے "آج

تک میں ان لوگوں کی نظربندی کو سب سے کامیاب چال سمجھتا ہوں[1] جو میں چل سکتا تھا" مورخوں میں ٹیلر کا فعل گرما گرم بحث کا موضوع رہا ہے۔ کسی نے اسے جنگ افغان میں اکبر خاں کے ہاتھوں میکناٹن کے قتل سے تشبیہ دی ہے کسی نے اسے عاقلانہ اور دلیرانہ پالیسی کا فعل قرار دیا ہے ماضی کے پیش نظر یہ واضح ہے کہ محض حکومت کے مفاد کے لحاظ سے اس فعل نے وہ غرض پوری کر دی جس کے لیے اس کا ارتکاب کیا گیا۔ ان قائدین کی گرفتاری نے بے شک وہابیوں کے سرحد پر روپے کی ترسیل کا انتظام درہم برہم کر دیا جس سے وہاں سخت تنگ حالی اور مفلسی پھیل گئی۔ لیکن ٹیلر کا یہ دعوٰے غلط تھا کہ اس فعل نے وہابیوں کو ۱۸۵۷ء کی تحریک میں شرکت سے باز رکھا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلر اُن وسیع تر نظریاتی اثرات سے بے خبر تھا جن کے تحت یہ تحریک چل رہی تھی جس بات کو وہ سمجھ نہ سکا وہ یہ تھی کہ اگر احتیاطی نظربندی عمل میں نہ آتی جب بھی وہابیوں کا طرزِ عمل وہی رہتا۔ اس معاملے میں وہابیوں کا عمل سطحی و شخصی مصالح کی بجائے اصول کی عمیق تر نظر سے تھا۔

وہابیوں کی غیر آئینی نظربندی

معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلر اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ وہابیوں کے قائدین کی احتیاطی نظربندی اور ساتھ ہی الٰہی بخش کو صاف صاف دھمکی ہی نے اُس نازک وقت میں وہابیوں کو روکے رکھا۔ وہابیوں کے اس غیر آئینی نظربندی کو جائز قرار دینے کے لیے ٹیلر نے یہ دلیل پیش کی کہ اس عمل نے احمد اللہ کے والد الٰہی بخش کو پیر علی کی متوقع شورش کے متعلق مقامی مجسٹریٹ کو اطلاع دینے پر مجبور کیا مگر اس میں ٹیلر واقعات کے قصداً چھپانے اور غلط تعبیر کرنے کا مجرم تھا۔ ان تمام چٹھیوں میں جو اُس نے اس زمانہ میں لکھیں وہ یہی کہتا رہا ہے کہ اطلاع احمد اللہ کے والد الٰہی بخش نے دی تھی۔ اس کے بعد اس موضوع پر ایک حالیہ مصنف نے اس غلط الزام کا اعادہ کیا ہے۔

اصلی مخبر

مگر اس واقعہ کا اصلی اطلاع دینے والا ٹیلر کے پاس نہیں پٹنہ کے مجسٹریٹ پولیس کے پاس آیا تھا اور اُس کا بیان مجسٹریٹ نے لکھ لیا تھا جو یہ ہے: "الٰہی بخش ولد صفدر علی ساکن موضع دروہ تھا۔ تھانہ باڑھ، یکم جولائی ۱۸۵۷ء کا بیان: پیر علی خاں کتب فروش

---

[1] ایضاً صفحہ ۳۲

علاقہ تھانہ خواجہ کلاں کے گھر میں اسلحہ اور آدمی جمع کیے گئے ہیں۔ مجھے مولوی الٰہی بخش (والد احمد اللہ) نے یہ اطلاع دینے کو بھیجا ہے۔ انہوں نے یہ بعض لوگوں سے سنا ہے جن کے نام میں نہیں جانتا"[1] اس طرح ظاہر ہے کہ اصل مخبر ایک لڑکا[2] مسمیٰ الٰہی بخش ساکن باڑھ تھا جس نے کہا کہ میں الٰہی بخش کے پاس سے آیا ہوں جو احمد اللہ کے بوڑھے ضعیف باپ تھے۔ ہمارے پاس اس لڑکے کے اس بیان کی تصدیق کے لیے کوئی دلیل نہیں کہ وہ واقعی اپنے ہمنام کا بھیجا ہوا تھا لڑکا باڑھ کا باشندہ تھا اور صادق پور کے الٰہی بخش سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ بہت ممکن ہے کسی کے اپنے مخالف یا دشمن کے خلاف غلط الزامات عائد کر کے پھنسانے کا معاملہ ہو۔ ایسے طلسماتی اور جھوٹے الزامات کی اُس زمانہ میں پٹنہ کی فضا میں بہتات تھی۔

سرکاری گوئندوں کی حرکات کا نتیجہ

اس زمانے میں معزز باشندوں کے خلاف جن سے بے ایمان گوئندے روپے اینٹھنا چاہتے ا جھوٹے اور بے سروپا الزامات اور جوابی الزامات کے متعلق پٹنہ کے مجسٹریٹ کا کہنا ہے "میں نے تمام گوئندوں اور ان کی خفیہ اطلاعات کو صرف آپ کے گوئندے فریب کھا کر ناقابل اعتماد قرار نہیں دیا بلکہ مجھے بعد میں اس گوئندے کے جوڑ توڑ معلوم ہوئے ان سے بھی میری اس بے اعتمادی کی تائید ہوتی ہے۔ یہ گوئندہ آپ کا پروانہ لے کر شہر کے بہت سے معزز ہندوؤں اور دوسرے لوگوں سے رقمیں وصول کرتا پھرتا تھا۔ ایسے اختیارات عارضی طور پر سہی بے ایمان آدمیوں کے ہاتھ میں دے دینے سے بڑا فساد ہوتا رہا ہے۔" یہ مجسٹریٹ ٹیلر کے ایک اور گوئندے کا حوالہ دیتا ہے جس نے اُسے (مجسٹریٹ) کو دھوکا دے کر ۲۰ جون ۱۸۵۷ء کو ایک وہابی مولوی کے گھر کی تلاشی کرائی جہاں سے سخت تلاش کے بعد کچھ بھی نہ ملا۔ مجسٹریٹ کو بعد میں معلوم ہوا کہ گوئندہ مذکورہ ایک امین تھا جس نے وہابی مذکور سے پانچ روپے کا ناجائز مطالبہ کیا تھا[3] اور اس نے دینے سے انکار کیا تھا۔

---

[1] دفتر ڈویژنل کمشنر پٹنہ نے پلندہ کاغذات غدر میں جے لوئیس مجسٹریٹ پٹنہ کی چٹھی میں ٹیلر کمشنر پٹنہ کے نام مورخہ ۱۲ جولائی ۱۸۵۷ء

[2] ٹیلر نے اس موضوع پر اپنی ایک چٹھی میں الٰہی بخش گوئندہ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا۔ پس ظاہر ہے کہ الٰہی بخش احمد اللہ کا باپ نہیں ہو سکتا تھا جو بہت بوڑھے تھے۔

[3] لوئیس کی چٹھی محولا بالا۔

ایک اور معاصر افسر ٹیلر کا جانشین کمشنر بھی اس موضوع پر پرمعنی خیز تبصرہ کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "اس ملک میں گویندے بے گناہ آدمیوں کو ملزم ٹھہرا دینے کی دھمکی دے کر روپے اینٹھنے میں اُن مجرموں سے زیادہ دلیر ہیں جو اکثر رشوت یا تخویف سے ان کے منہ پر مہر سکوت لگا دیتے ہیں[1]۔ گویندہ زیر بحث الٰہی بخش بھی انہیں خود غرض گویندوں کے جتھے کا ایک فرد ہو سکتا ہے۔ ایک نامعلوم خاندان کے نوجوان چھوکرے کی حیثیت سے اس کا بیان حکام کے نزدیک قابل وقعت نہ ہوتا اس لیے اس نے صادقپور کے الٰہی بخش کا نام لے لیا ہوگا جو معززترین مقامی رؤسا میں سے تھے، یا ممکن ہے کہ صادق پور کے وہابیوں کے کسی دشمن نے اس چھوکرے کو اپنے مہرے کے طور پر استعمال کیا ہو اجوان کو کسی سرکاری تحقیقات میں الجھانا چاہتا ہو۔ ایسے دشمنوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔

خاندان صادق پور کا ایثار

یہ بحث زیادہ بہتر طور پر سمجھ میں آسکتی ہے اگر صادق پور کے سرداروں کے خاندان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے اپنے مقصد عظیم کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر کے اور قریب قریب تمام مادی املاک قربان کر کے ممکن نہ تھا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر ہوں بالخصوص الٰہی بخش جو احمد اللہ کے علاوہ یحییٰ علی، فیاض علی اور اکبر علی کے بھی باپ تھے۔ یہ تینوں ایک طویل عرصے تک سرحد پر حکومت کے خلاف لڑتے رہے تھے اور ان کی جدوجہد سب کو معلوم تھی ان کے بھتیجے برادران علی مانے ہوئے باغی تھے۔ اگر الٰہی بخش کی زندگی اور سلامتی حکومت کی نظر میں ان کے بیٹوں کی نیک چلنی پر منحصر ہوتی تو مذکورہ حساب سے وہ پہلے ہی اس سے محروم ہو چکے تھے اور یہ حق ضبط ہو چکا تھا۔ کسی صورت میں بھی ان کے ایک بیٹے کے افعال کی کوئی زیادہ اہمیت نہ ہو سکتی تھی۔

جس شخص نے اپنی مرضی سے اپنے تین بیٹوں اور کئی اور قریبی عزیزوں کو اپنی اور ان کی جانوں کے خطرات کو اچھی طرح سمجھ بوجھ کر حکومت کے خلاف لڑنے کو بھیج دیا ہو اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے ایک بیٹے کی جس کے خلاف کوئی الزام نہ تھا سلامتی کے مفروضہ خطرے سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ جائے یہ قطعی ناقابل فہم ہے کہ ایک شخص جس کے خاندان کے زیادہ افراد حکومت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے اور جس کی دولت کا زیادہ حصہ حکومت کے خلاف

---

[1] چٹھی کمشنر پٹنہ بنام سکریٹری بورڈ ریونیو مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء

جدوجہد کی داؤں پر لگا ہوا تھا۔ حکومت کو اُس شورش کی اطلاع دے جو اِس کے خلاف برپا ہونے والی تھی۔ یہ شبہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیلر نے جان بوجھ کر اس عجیب اتفاق سے کام لیا کہ اصل گوبندہ کا نام بھی الٰہی بخش تھا۔" مجسٹریٹ نے اپنی منقولا بالا چٹھی میں خاص طور پر ٹیلر کی توجہ (خلط ملط سے بچنے کے لیے) اس امر کی طرف معطوف کی ہے کہ اصلی گوبندہ کا اور اُس شخص کا جس کی طرف سے اطلاع منسوب کی جاتی ہے نام ایک ہی ہے۔ پھر بھی ٹیلر اس نام کو ہر موقع پر احمد اللہ کے والد کے نام سے ہی چلاتا رہا۔ بین طور پر وہ یہ حرکت احمد اللہ اور دوسرے لوگوں کو گرفتار کرنے کا جواز ثابت کرنے کی فضول کوشش میں کرتا رہا۔

وہابیوں کی سیاسی بصیرت

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا وہابی تحریک نہایت اجتماعی و مرکزی تھی جو خاص اصول کی بنا پر چلتی تھی۔ ایک طرف سرحد اور دوسری طرف بہار اور بنگال دو دُھرے تھے جن پر یہ گاڑی چلتی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے ذمہ الگ الگ کام تھے جن کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ ہندوستان کے اندر کے مرکزوں کا اصل کام آدمی اور روپے فراہم کرنا اور ان کو سرحد پر بھیجنا تھا۔ وہابی قائدین نے اپنی اصلی سیاسی دانائی سے یہ بات سمجھ رکھی تھی کہ اگر ہندوستانی مرکزوں کی جدوجہد زیادہ نمایاں طور پر انجام دی گئی تو قدرتاً حکومت ان کو کچلنے کے اقدامات کرے گی اور اس طرح ان کے آدمیوں اور ذخائر کی فراہمی کا دستہ ہی کٹ جائے گا۔ یہ ہے وہ اساسی منطق جو بظاہر اس متضاد منظر کی تشریح و تاویل کر دیتی ہے کہ جہاں وہابیوں کا ایک گروہ عنایت علی کے زیر کمان ۵۳-۱۸۵۲ء میں سرحد پر مصروف جنگ تھا وہاں ان کے ہم وطن ہندوستان اور بالخصوص بہار میں خاموش رہے۔ اُس زمانہ میں مرکز پٹنہ کے سردار عنایت علی کے چھوٹے بھائی فرحت حسین تھے اور انگریزوں کے ساتھ ان کا برتاؤ ان کے بڑے بھائی کے برتاؤ سے مختلف نہ تھا۔ انہوں نے بھائی سے مختلف کیوں عمل کیا اس کا سبب تنظیم کی آہنی تربیت و تادیب تھا جس نے ان کو مختلف فرض سونپ دیا تھا جس کے وہ سختی سے پابند تھے واقعات کے پیش نظر ماننا پڑتا ہے کہ وہابی قائدین نے سیاسی صورت حال کا جو اندازہ لگایا

تھا وہ صحیح تھا۔ اگر وہابی بہار میں علانیہ محاربہ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے تو وہ بھی کچل دیے جاتے اور تحریک اُس سے بہت پہلے ختم ہو چکی ہوتی جب کہ واقعی ختم ہوئی۔ دبے رہنے کے سبب وہابی ۵۹-۱۸۵۷ء کے شدید طوفان سے بچ رہے۔ پٹنہ کا مرکز پہلے کی طرح برقرار رہا اور کام کرتا رہا اور ۱۸۶۳ء کے غزوہ امبیلہ میں جب کہ وہابیوں نے سب سے شدید جنگ کی بیش بہا خدمات انجام دیں اگر وہابی بہار میں ۱۸۵۷ء میں وہ نہ کرتے جو کیا تو ۱۸۶۳ء کا معرکۂ امبیلہ وقوع پذیر نہ ہوتا۔ مگر اس طرح پٹنہ مرکز کو زندگی کا جو نیا پٹا ملا وہ بہت مختصر تھا۔ سچ یہ ہے کہ تمام مادی سہارے کے لیے وہابیوں کا ہندوستان کے مرکزوں پر کامل انحصار ہی تحریک کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

۱۸۵۷ء کی تحریک میں وہابیوں کی حکمت عملی

۱۸۵۷ء کی تحریک کے حالیہ مورخین میں صرف ڈاکٹر ڈی این سین اور ڈاکٹر آر سی مجومدار نے یہ معنی خیز نکتہ پیش کیا ہے کہ وہابیوں نے من حیث الجماعۃ اس "بغاوت" کا ساتھ نہیں دیا۔ اگرچہ وہابیوں کے مرکز بہار کے متعلق یہ صحیح ہے (جس نے اپنے بعض اساسی پالیسی کی بنا پر ایسا کیا جس پر اوپر بحث ہو چکی) مگر ان دونوں مورخین نے یہ عمومی اظہار رائے کیا ہے جو تمام وہابی مرکزوں پر منطبق ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر سرحد اور پنجاب میں بغاوت کے سرغنہ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر لینے کا فیصلہ کر لیتے تو لارنس کے لیے پنجاب کو یورپی سپاہ سے خالی کرنا مشکل ہو جاتا۔ ۵۸-۱۸۵۷ء میں عنایت علی کی متذکرہ بالا کارروائیوں سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ پچپنویں N.I.۰ (دیسی فوج) کے سپاہیوں سے مل گئے تھے جو بھاگ کر سرحد پار چلے گئے تھے۔ ان کو پناہ دی اور ان کے دوش بدوش سرحد میں کتنی لڑائیاں لڑے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ۵۹-۱۸۵۷ء کے نازک دور میں وہابی انگریزوں سے بالکل نہیں لڑے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اُس تحریک کے سرغنہ اور سرداروں سے نہیں ملے مگر عنایت علی کے زیر کمان ان کی سرحدی جماعت نے اس زمانے میں انگریزوں سے برابر لڑائی کی ہے مگر جہاں انگریزوں نے اپنے افضل اور بہتر منظم وسائل سے تمام شمالی ہند میں بغاوت کے منتشر مرکزوں کے چیلنج کا مقابلہ کیا وہاں ایک اور پریشانی کا بھی مقابلہ کر لیا۔ انگریزوں کو اپنے ہندوستانی غنیم

پر وہ مادی اور فنی برتری حاصل تھی کہ وہابیوں کی کارروائیوں سے اسے کوئی مادی ضرر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ڈاکٹر سین کا متذکرہ خیال اس معنی میں البتہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس نازک وقت میں اگر پورا پنجاب انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تو یہی نہیں کہ لارنس پنجاب کی فوجوں کو حکمہ نہ دے سکتا بلکہ تحریک کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ مگر سارا پنجاب وہابیوں کے زیر اثر خطہ تو نہ تھا اور وہابی عام اہل پنجاب کے طرز عمل کے ذمہ دار نہیں قرار پا سکتے۔ دوسری طرف یہ سکھوں کا طرز عمل تھا دگور کھا کو چھوڑ کر) جس نے اس کش مکش کو اس انجام پر پہنچایا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک میں اہل پنجاب کی عدم شمولیت

۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک سے اہل پنجاب کے عام احتراز کے اسباب متعدد اور مختلف تھے۔ طرح طرح کے اغراض[1] و مقاصد نے جو اکثر ایک دوسرے کے متضاد تھے آبادی کے سرکردہ طبقوں، سکھ، ہندو، مسلمان کو اس نازک وقت میں خاموش رکھا۔

سکھ سپاہ کو "پوربیہ سپاہیوں" کے خلاف جو صرف دس سال پیشتر انگریزوں کے ہاتھوں سکھ فوج کی تباہی میں آلہ کار رہ چکے تھے، لارنس کی شاطرانہ چال کا ذکر کیا جا چکا ہے اور سکھوں کے طرز عمل میں بھی اسی کا کچھ دخل تھا۔

ڈاکٹر سین لفٹنٹ گورنر بنگال کے نام اُس کی ایک روداد مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء میں اس کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ "کسی زمانہ میں وہابیوں کے خلاف نہ کچھ ثابت ہوا نہ کوئی الزام عائد کیا گیا" لفٹنٹ گورنر کا یہ قول صرف گمراہ کن ہی نہیں بلکہ اس کا پچھلا فقرہ قطعی غلط ہے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ۱۸۳۹ء سے اور زیادہ خصوصیت سے ۱۸۵۲ء سے ہزارہ، پٹنہ، راجشاہی جیسی جگہوں سے مقامی حکام صوبائی حکومتوں نیز حکومت ہند کی توجہ سرحد پر ہندوستان کے مہاجرین کے ایک بڑے آشیانے اور ملک کے اندر ان کی باغیانہ جدوجہد کی طرف منعطف کرتے رہے ہیں۔ مقامی حکام کے خدشات کی طرف اعلیٰ حکام نے زیادہ اعتنا نہ کی۔ بہرحال یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود لفٹنٹ گورنر بنگال نے ۲۶ اگست ۱۸۵۲ء کو ایک روداد میں لکھا تھا کہ "پٹنہ کے آدمیوں اور ستھانہ اور سوات کے مذہبی دیوانوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ موجود ہے"

---

[1] ان اغراض و مقاصد کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "بغاوت عظیم" مولفہ تلمیذ خلدون "ربیلین" ایک مجلس مذاکرہ ۱۹۵۷ء

اور یہ کہ "جو جماعتیں ان میں ملوث ہیں ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنا مناسب ہے۔" ان بیانات کے مقابلے میں یہ خیال کہ وہابیوں کے خلاف کوئی الزام عائد ہی نہیں کیا گیا عجیب بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شروع میں اعلیٰ حکام نے وہابیوں کی کارروائیوں کے متعلق اطمینان کا عجب اغماض کا رویہ رکھا۔ واقعات کی سنگینی اور اٹل منطق نیز غزوہ امبیلہ میں انگریزی فوج کی زبردست پٹائی نے بعد میں ان عالی مرتبت حکام کی آنکھیں خطرے کی واقعی حد و غایت اور شدت کی طرف سے کھول دیں۔

وہابی تحریک کے متعلق ایک غلط خیال

ایک غلط خیال عام طور پر پھیلا کہ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ وہابی برطانوی ہند اور خصوصًا بہار میں من حیث الجماعۃ ۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک سے الگ رہے تو یہ تحریک کے مخالف انگریز اصول کے خلاف ہوگا۔ یہ عجیب گمان دوہرے منطقی مغالطے پر مبنی ہے۔ اولاً یہ فرض کرلینا پڑتا ہے کہ بہار کے وہابی پوری جماعت سے مختلف لوگ تھے اور یہ کہ پوری تحریک کا طرزعمل صرف ۱۸۵۷-۵۹ء میں ان کے رویہ کی بنا پر کرنا چاہیے (مقدمۂ کبریٰ) ثانیًا یہ کہ انگریزوں کے خلاف کش مکش میں انہوں نے کوئی حصہ لیا ہی نہیں (مقدمۂ صغریٰ) دونوں قضیے صریحًا بالکل غلط ہیں۔ اور تمام صوبوں کی طرح بہار کے وہابی بھی ایک وسیع و ہمہ گیر کل کے جز و لازمی تھے۔ اور وہ سب کے سب ایک مرکزی نقشے کے مطابق کام کر رہے تھے۔ ایک ہی قسم کے لوگ اخوت کے سخت بندھن میں بندھے ہوئے بہار اور سرحد دونوں جگہوں میں کام کر رہے تھے، بلکہ ایک ہی اشخاص مثلاً برادران علی، یحییٰ علی، فیاض علی اور دوسرے باری باری دونوں جگہوں میں کام کرتے رہے، انگریزوں کے حق میں بہار کے وہابی سرحد کے وہابیوں سے زیادہ نرم نہ تھے۔ دونوں گروہوں نے اپنے مرکزوں میں حالات کے مطابق جنگ جاری رکھی۔ پالیسی کے بعض بنیادی اصول کی بنا پر بہار میں سرحد کی سی کھلم کھلا جنگ تو ممکن نہ تھی لیکن زیادہ زبردست مادی وسائل، شاندار نہ سہی مگر جانفزا اور قوت بخش کی فراہمی بے روک جاری رہی۔

ہم میں سے اکثر اشخاص کسی بم انداز کے طیارہ راں کے کارناموں کو تعجب کی نظر سے دیکھتے ہیں جو کسی بم اندازی کی ڈیوٹی پر دشمن کی سرزمین پر حیرت انگیز پرواز کرتا ہے اور اس کے فخر و

ناز و تحسین و آفریں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو زمینی فوج کے اُن افراد کی لگاتار محبت و مشقت کی طرف کوئی دھیان دیتے ہوں جن کی خاموش گو غیر دلچسپ کارگزاریوں کے بغیر ایسی پروازیں ممکن نہیں ؟ اگر زمینی سپاہی اپنے کاموں میں کسی ادنیٰ سے جزوی کام میں غفلت برتتے تو کام کا بالکل ٹھپ ہو جانا تو الگ رہا طیارہ داں اور اُس کا بلند پرواز طیارہ کہاں ہوتے ؟ پٹنہ کے مرکز کا کام بھی ایسا ہی تھا۔

قائدین پٹنہ کا ایثار و استقامت

ان دو مختلف قسم کے کاموں کی جدا جدا صفات بیان کرتے ہوئے ہنٹر لکھتے ہیں[1] "اس میدان عمل (تنظیم و ترسیل) کی مصیبتیں کسی طرح میدان جنگ کی آزمائشوں سے کم نہ تھیں۔ بلکہ اس کے برعکس میں تو کہوں گا کہ میدان جنگ کی دہکتی ہوئی آگ میں گر کر فوراً مر جانا دائمی پریشانیوں اور ہر وقت کے خطرات کے طویل اور غیر مختتم دنوں کے طویل و سست رفتار گھنٹوں میں بسر کرنے سے سہل تر ہے۔ ان جنگ آوروں (قائدین پٹنہ) نے گھر بار سے دور زندانوں کے تاریک تہہ خانوں اور جزائر انڈمان کے ہولناک ویرانوں میں ایک دوسرے سے دائمی مفارقت کے دن اس طرح گزارے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان بھائیوں (احمد اللہ و یحییٰ علی) کے ساتھ اتنی سی رعایت بھی روا نہ رکھی گئی کہ ان کی قبریں ایک جگہ پر ہوتیں۔ بااین ہمہ نہ ان کے عزم میں تزلزل ہوا نہ ان کے قدم لڑکھڑائے۔"

خاندان صادق پور کا کارنامہ

یہ قابل توجہ حقیقت ہے کہ نصف صدی سے زیادہ ایک زبردست غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک زوردار تحریک کی قیادت کا عملاً سارا بوجھ ایک واحد خاندان اہل صادق پور نے اٹھایا۔ انھوں نے مجاہدین و غیر مجاہدین دونوں کے کاموں کی نگرانی کی اور دونوں مرکزوں میں کام کیے۔ اور یہ سب کچھ انھوں نے اُس زمانے میں کیا جب کہ انہیں کے بہت سے ہموطنوں کی طرف سے، تعاون درکنار، قدردانی کی بھی کوئی اُمید نہ تھی۔ یہ ہے ملک کی آزادی کے لیے ان کے خود فراموشانہ جوش اور قربانیوں کے جانچنے کا حقیقی معیار۔

[1] ہنٹر جلد ۲ صفحہ ۳۷۲۔ عبارت منقولہ اصل متن کا انگریزی ترجمہ تھی (جس کا یہ دوبارہ اردو ترجمہ ہے) مترجم

باب ۸

سنہ ۱۸۶۳-۶۵ء میں کچھ وہابیوں پر سرکاری مقدمات

ایک گزشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ آدمی اور روپے کی تحصیل اور سرحد شمالی و مغربی میں ان کی ترسیل اندرون ملک میں وہابی مرکزوں کا اصل کام تھا۔ اس قیمتی امداد کی مسلسل و مستقل روانی ہی نے سرحد پر وہابیوں کی جدوجہد قائم رکھی۔ وقتاً فوقتاً متعدد مقامی افسران وہابی مرکزوں اور ان کے ناظموں کی خطرناک اور باغیانہ کارروائیوں کی طرف توجہ دلاتے رہے تھے۔ مگر حکومت نے ان بروقت تنبیہوں کی طرف کوئی اعتنا نہیں کی۔ وہابیوں یا ان کے قبائلی حلیفوں کے خلاف سرحدی مہموں نے بالخصوص معرکۂ امبیلہ میں انگریزی فوج کی ہزیمت نے اعلیٰ حکام کو جھنجھوڑ کر وہابیوں کی سازشوں کے گھونسلوں یعنی ملک کے اندر ان کے مرکزوں کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کے احساس کو زیادہ بیدار کر دیا۔ ہندوستان میں وہابی مرکزوں کی خطرناک طاقت اور ساتھ ہی کچھ اتفاقی واقعات کے بڑھتے ہوئے احساس ہی کا نتیجہ تھا ملک میں کچھ سربرآوردہ وہابی قائدین کے خلاف سرکاری مقدمات کا سلسلہ ان میں مقدمات انبالہ اور پٹنہ اولین اور اہم ترین تھے۔

(۱) سنہ ۱۸۶۴ء کا مقدمہ انبالہ

واقعات کا وہ سلسلہ جو مقدمہ انبالہ تک پہنچا ۱۱ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ء کو ضلع انبالہ کے شہر تھانیسر کے ایک نمبردار[1] محمد جعفر کی گرفتاری سے شروع ہوا۔ یہ گرفتاری ایک اتفاقی واقعہ کا نتیجہ تھی جو کئی ماہ قبل وقوع میں آیا

---

[1] نمبردار چھوٹے شہر کی مالیات کا نمائندہ ہوتا تھا جو اس شہر کی طرف سے حکومت کے اعلیٰ تر افسران مالیات سے تعلق رکھتا تھا۔

تھا۔ مئی ۱۸۶۳ء میں چوکی پانی پت ضلع کرنال میں ایک پٹھان پولیس سارجنٹ غزان خاں نے چند آدمی دیکھے تھے جن کے قیافوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ گرینڈ ٹرنک روڈ (شارع شیر شاہی) سے آنے والے مشرقی صوبوں کے لوگ ہیں۔ سارجنٹ کے جذبہ تجسس کو حرکت ہوئی اور ان سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس کو بتایا گیا کہ وہ بنگال سے آ رہے ہیں اور حکومت برطانیہ سے جنگ کرنے کو سرحد جا رہے ہیں۔ انہوں نے سارجنٹ کو دعوت دی کہ وہ بھی ان سے مل جائے مگر اس نے ان کو فوراً گرفتار کر کے مقامی حکام کے سامنے پیش کر دیا۔ مقدمہ کی سماعت اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر انبالہ کی عدالت میں ہوئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ گرفتار لوگ واقعی مسافر ہیں اور ان کی رہائی کا حکم دیا۔ غزان خاں نے اس رہائی کو اپنی خفت کا موجب سمجھا۔ اور اپنے الزام کی صحت ثابت کرنے پر تل گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو سرحد کے مرکز پر جانے، اس میں شریک ہونے اور وہاں وہابیوں کی کارروائیوں کے متعلق جو کچھ معلومات حاصل کر سکے فراہم کرنے پر متعین کیا۔ فرمانبردار لڑکے نے یہ کام بوجہ احسن انجام دیا۔ وہابی ریاست سے لوٹ کر اس نے رپورٹ کی کہ تمام ہندوستان سے سرحد کے لیے آدمی اور روپے کی فراہمی کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے تھانیسر بھی ایک اہم کوٹھی ہے اور جعفر اس کے منتظمینِ اعلیٰ میں سے ہے۔

مہر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ غزان خاں کی منتقمانہ کارروائیاں معرکۂ امبیلہ سے بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جعفر کے بیان کردہ واقعات سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ غزوۂ امبیلہ کے شروع ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ وہابی رضاکاروں کی گرفتاری بہت پہلے عمل میں آ چکی تھی مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ غزان خاں کا ذاتی فعل تھا اور حکومت سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ حکومت نے اس مقدمے کی باقاعدہ تحقیقات اکتوبر نومبر[1] کے لگ بھگ شروع کی تھی جب کہ سرکاری فوجیں درۂ چملا میں مبتلائے آفت تھیں البتہ فوجی صورت حال کی نزاکت نے ان تحقیقات کو اہمیت ضرور دے دی۔ ہنٹر بھی یہی رائے رکھتا ہے کہ ۱۸۶۴ء کا مقدمہ ۱۸۶۲ء کی مذہبی جنگ کا قدرتی نتیجہ تھا۔

---

[1] وہابی رضاکاروں کو غزان خاں نے مئی میں گرفتار کیا تھا۔ اسی کے بیٹے کی سرحد پہ (باقی ص ۲۶۶ پر)

جعفر تھانیسری

غزان خاں نے وہ ساری اطلاعات حکومت کو پہنچا دیں جو اس کا بیٹا لایا تھا۔ حکومت پنجاب نے تفتیش شروع کر دی۔ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس، پارسن ؔنے ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کی صبح کو تھانیسر میں جعفر کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے اسی وقت اور اسی جگہ گھر کی تلاشی پر اصرار کیا۔ جعفر کے گھر سے کچھ خطوط برآمد ہوئے جن میں انبالہ کے ایک ٹھیکیدار گوشت محمد شفیع اور انبالہ کے دوسرے ٹھیکیداروں اور پٹنہ کے کچھ آدمیوں کے نام برآمد ہو گئے۔ اگرچہ بہت سے مرموز خطوط کا پورا مطلب حکام کو بعد میں معلوم ہوا۔ ان تمام مقامات کے پولیس انسپکٹروں کو تار سے حکم دیا گیا کہ کل مشتبہین کے گھروں کی تلاشی لی جائے اور ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ ہزاری باغ کے ایک عبدالغفور اور ایک بنگالی لڑکا بھی جو جعفر کے گھر میں موجود تھے اسی رات گرفتار کر لیے گئے۔ تعجب ہے کہ خود جعفر اس رات گرفتار نہیں کیے گئے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے فرار کرنے کا دلیرانہ ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اسی رات وہ انبالہ سے نکل بھاگے اور پانی پت کے راستے سے دلّی چلے گئے۔ دلّی میں وہ اپنے ایک ہم پیشہ بشیرالدین کے ہاں ٹھہرے۔ وہاں ان کو پٹنہ کے دو شخص حسینی اور عبداللہ عرف معظم سردار ملے جو پٹنہ سے سرحد کو اشرفیاں لے جا رہے تھے۔ جعفر نے حسینی سے رقم لے لی اور اس نام کے ایک دوسرے شخص باشندہ تھانیسر کو دے دی اور اسے ہدایت کر دی کہ اُسے سرحد پہنچا دے جعفر خود پٹنہ کے حسینی اور عبداللہ کے ہمراہ مشرق کی طرف سفر پر چل پڑے۔ اس دوران میں شفیع اور اس کا بھتیجا عبدالکریم انبالہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ دوسری شام ۱۳ دسمبر کو جب پارسن جعفر کے گرفتار کرنے تھانیسر پہنچا تو اسے ان کے فرار کرنے کی خبر ملی اس نے فوراً جعفر کے خاندان اور رشتہ داران پر دہشت کا مینہ برسا دیا۔ ان کو خوب مارا پیٹا اور آبروریزی کی۔ جعفر کے چھوٹے بھائی سے یہ معلوم کر کے کہ وہ دہلی فرار ہو گئے پارسن فوراً ان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۵) تعیناتی، وہاں اس کے قیام و مراجعت میں کچھ وقت صرف ہوا ہوگا چنانچہ جعفر کی گرفتاری ۱۱ دسمبر کو وقوع میں آئی اور باقی تحقیقات شروع ہوئی۔

[1] آور انڈین مسلمان صفحہ ۶۴

چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دہلی روانہ ہو گیا۔ دہلی میں بھی چند گھنٹوں کے فرق سے اس نے جعفر کو ہاتھ سے کھو دیا وہ سڑک سے کویل (علی گڑھ) جا چکے تھے۔ جعفر کا کھوج لگانے کے لیے علی گڑھ برقی پیغام بھیجے گئے۔ وہ اور ان کے رفقا وہاں گرفتار کر لیے گئے اور انبالہ واپس لائے گئے۔ حسینی تھانیسری بھی جسے جعفر نے اشرفیاں سرحد لے جانے پر تعینات کیا تھا راستے میں تھانیسر کے تحصیلی صدر مقام پیپلی میں گرفتار کر لیا گیا حکام سازش میں ملوث پنجاب والوں کو گھیر کر پٹنہ والوں کو گھیرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

الٰہی بخش اور محی الدین

جعفر کے گھر سے جو کاغذات ضبط ہوئے تھے اُن میں پٹنہ کے دو آدمیوں الٰہی بخش اور محی الدین کے لکھے ہوئے دو خط بھی تھے۔ پٹنہ کا حسینی جب جعفر کے ساتھ گرفتار ہوا تھا تو اُس نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ الٰہی بخش مذکور نے اُسے ڈھائی ہزار کی ہنڈی ایک شخص علاء الدین دہلی کے کفش ساز کے پاس جمع کرنے کو بھیجا تھا۔ دوسرا حسینی تھانیسری جو پیپلی میں گرفتار ہوا تھا اُس کے جسم پر سے بھی کچھ اشرفیاں برآمد ہوئی تھیں۔ ان اشرفیوں کی تعداد ٹھیک وہی تھی جو تھانیسر میں گرفتار ہونے والے عبدالغفور کے نام محی الدین کے خط میں درج تھی۔[1] اس محی الدین کی شناخت بعد میں متعین ہو گئی۔

الٰہی بخش کی خانہ تلاشی

پنجاب پولیس نے الٰہی بخش کے گرفتار کرنے کے لیے پٹنہ کے حکام کو خفیہ اور ضروری خطوط کا ایک طومار بھیجا۔ شروع میں اس الٰہی بخش کی شناخت میں کچھ پیچیدگیاں تھیں۔ پنجاب پولیس نے جو تفصیلات دی تھیں وہ ان معلومات سے پوری مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ جو پٹنہ کے مجسٹریٹ کو مہیا کی گئی تھیں۔ مجسٹریٹ نے ۸ ار دسمبر کو احتیاطاً ایک سوداگر پاپوش مسمّی الٰہی بخش کے گھر کی تلاشی بھی لی جو شہر میں رہتا تھا اور جو کچھ کاغذات تھے ضبط کر لیے۔ تحقیقات سے مجسٹریٹ کو معلوم ہوا کہ الٰہی بخش کریم بخش کا بیٹا تھا اور وہ بھی زندہ تھا۔ وہ غدر کے وقت مفلوک الحال دہلی گیا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد دولت مند لوٹا اور پھر ہٹہ پٹنہ سٹی میں ایک جوتے کی دکان قائم کی۔ وہ مختلف مقامی مہاجنوں سے قرض لے کر دہلی سے

---

[1] خطوں کی رموز زبان میں اشرفیوں کو ۱۹۴ بڑے پتھروں اور ۹۶ چھوٹے پتھروں سے تعبیر کیا گیا تھا اور حسینی کے کوٹ میں جو اشرفیاں سلی ہوئی تھیں وہ انہیں تعدادوں میں پائی گئیں۔ یہ ایک کاغذ میں کس کر باندھی ہوئی تھیں تاکہ جھنکار نہ ہو۔

جوتے درآمد کرتا اور منافع میں وہ خود اور مہاجن برابر کے حصہ دار ہوتے۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ جیمز الیگزینڈر نے اسے گرفتار کر لیا اور پانچ پانچ ہزار کی دو ضمانتیں طلب کیں۔ اس کے فوراً بعد پنجاب کے حکام نے تار سے اطلاع دی کہ پارسن تحقیقات کے لیے پٹنہ جا رہا ہے چنانچہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۴ء کو وہ پٹنہ پہنچا۔

خاندان صادق پور کی خانہ تلاشی

الٰہی بخش کے گھر سے بہت سے خطوط برآمد ہوئے جن سے ظاہر ہوا کہ الٰہی بخش نے حسینی کی معرفت وقتاً فوقتاً جعفر اور دہلی میں مختلف اشخاص کو جوتے اور دوسرے سودے خریدنے کو متفرق رقوم بھیجی تھیں۔ ان کاغذات میں ایک خط یحییٰ علی صادق پوری کا فخر الدین ساکن آرہ کے نام ملا۔ جس سے سب سے اہم انکشاف ہوا۔ اس خط کا خط (طرز تحریر) بجنسہٖ وہی تھا جو مذکورہ بالا عبد الغفور کے نام محی الدین کا خط تھا۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ محی الدین کوئی اور شخص نہ تھا بلکہ خود یحییٰ علی تھے جو "پوری جماعت کے سردار اور بڑے صاحب اثر تھے" اس لیے اب تحقیقات صادق پور کی طرف مڑ گئی۔ ۲۱ جنوری کو الیگزینڈر اور پارسن نے ایک مسلح فوجی ٹولی کے ساتھ صادق پور کے مکانات پر دھاوا کیا اور احمد اللہ اور یحییٰ علی کے گھر کی تلاشی لی۔ احمد اللہ لفٹنٹ گورنر کے ایک جلسہ میں شرکت کے لیے کلکتہ چلے گئے تھے۔ تمام کاغذات، مسودات اور بہی کھاتے جو کچھ بھی گھر میں ملے سب ضبط کر لیے گئے۔ عبد الرحیم پر بھی صبح سے شام تک جرحی سوالات ہوتے رہے۔

عبد الرحیم اور عبد الغفار کی گرفتاریاں

ایک شخص عبد الغفار جو گھر میں موجود تھا اُس نے استفسار کے جواب میں بتایا کہ وہ عبد الرحیم کا ملازم ہے۔ اس سے بھی سوالات کیے گئے اُس نے بیان کیا کہ "میرے آقا عبد الرحیم میرے نام سے الٰہی بخش کے ساتھ لین دین کیا کرتے تھے۔" الٰہی بخش کا کھاتہ دیکھنے سے ظاہر ہوا کہ عبد الغفار نے الٰہی بخش کے پاس اپنی جمع کی مد سے بڑی بڑی رقمیں نکالی تھیں۔ یہ شبہ عائد کیا گیا کہ برآوردہ رقوم جن کے خرچ کا کوئی حساب نظر نہ آیا جعفر کی معرفت سرحد پر بھیجی گئیں۔ عبد الرحیم کے گھر سے ایک خط کا مسودہ برآمد ہوا۔ جس سے اور باتوں کے ساتھ بعض آدمیوں (یعقوب، نصیر الدین وغیرہ) کے نام ظاہر ہوئے جن کے بارے میں معلوم تھا کہ سرحد پر تھے۔ آخر عبد الرحیم اور عبد الغفار دونوں گرفتار کر لیے گئے۔ دونوں دو روز حوالات میں رکھے گئے پھر جیل بھیج دیے گئے۔ یحییٰ علی

سے بھی دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ ان کے بھتیجے عبدالحمید (احمد اللہ کے بڑے بیٹے) نے اس کا بندوبست کر دیا۔

یحییٰ علی کی گرفتاری

اس کے فوراً بعد ہی دو گواہ سلیم الدین اور امین الدین ڈھاکہ سے لائے گئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ "ہم اپنے سرحد کے راستے میں صادق پور کے مکان 'قافلہ' میں ٹھہرائے گئے۔ وہاں یحییٰ علی انگریزوں سے جہاد کرنے کی فضیلت پر وعظ کہا کرتے تھے۔ ہمارے علاوہ اور بہت سے اپنے راستہ میں 'قافلہ' میں ٹھہرے تھے۔" یہ اطلاع ملنے پر یحییٰ علی کی ضمانت منسوخ ہو گئی اور ۸ر فروری ۱۸۶۴ء کو گرفتار کر کے عبدالرحیم اور عبدالغفار کے ساتھ ان کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔

قیدیوں سے انسانیت سوز سلوک

اوائل مارچ ۱۸۶۴ء میں ان تینوں قیدیوں کو انبالہ چالان کر دیا گیا۔ مارچ سے سیشن کی سماعت کے اختتام تک یہ قیدی علیحدہ علیحدہ تنہا تہہ خانوں میں ڈال دیے گئے جن کا رقبہ ۴ x ۵ فٹ تھا، چھت بہت بلند تھی اور دیوار میں بہت بلندی پر ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ اس زندان کا دروازہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار کھلتا، جمعدار قیدیوں کو ایک کٹورہ پانی اور کچھ روٹی اور دال دے جایا کرتا اور مہتر گملا صاف کر جاتا۔ اس تمام مدت میں قیدیوں کے ساتھ نہایت خلاف انسانیت سلوک کیا جاتا۔

قیدیوں کے اسمائے گرامی

حکم سزا کی ابتدائی کارروائیاں ٹیگھے ڈپٹی کمشنر انبالہ کی عدالت میں ایک ہفتہ سے زیادہ جاری رہیں۔ اپریل ۱۸۶۴ء میں ہربرٹ سیشن جج انبالہ کی عدالت میں سیشن کی سماعت شروع ہوئی۔ جج کے معاون چار اسیسر مقرر کیے گئے تھے، دو ہندو اور دو مسلمان۔ ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ کرنے کے الزام میں کل گیارہ آدمیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ وہ یہ تھے :-

۱۔ یحییٰ علی صادق پوری۔ عمر ۴۲ سال (سوانح حیات کے لیے ملاحظہ ہو تتمہ)

۲۔ محمد جعفر ولد میاں جیون نمبردار تھانیسر۔ ایک خوشحال سوداگر، مرموز خطوط میں پیرو خاں کے نام سے موسوم۔ عمر ۲۸ سال۔

۳ - عبدالرحیم ساکن صادق پور پٹنہ - عمر ۲۸ سال (سوانح حیات۔ کے لیے ملاحظہ ہو تتمہ)

۴ - محمد شفیع ولد محمد تقی، فوجی چھاؤنی کا ٹھیکہ دار گوشت - خوشحال تاجر - سرکاری گواہ بن گیا)

۵ - مرتز خطوط میں شفاعت علی کے نام سے موسوم -

۶ - عبدالغفار - ملازم عبدالرحیم - حقیقتاً وہ تحریک کے ایک معتمد کارکن تھے اور فائدین صادقپور کے ایک شریک کار بھی -

۷ - قاضی میاں جان ساکن کو سرکولی ضلع پٹنہ، ان کے عرفی نام کئی تھے - گرفتاری کے وقت بہت بوڑھے تھے انبالہ کی نظربندی کے دوران جب کہ انڈمان میں حبس دوام کی تجویز زیر غور تھی انتقال کر گئے -

۸ - عبدالغفور پسر شاہ علی ساکن ہزاری باغ - عمر ۲۵ سال - جعفر کے گھر سے گرفتار کیے گئے -

۹ - حسینی ولد میگھو ساکن پٹنہ سٹی - عمر ۳۵ سال - ملازم الٰہی بخش -

۱۰ - حسینی ساکن تھانیسر ولد محمد بخش - عمر ۲۵ سال - عنایت علی کے زیر کمان سرحد پر جہاد کیا تھا -

۱۱ - الٰہی بخش ولد کریم بخش - تاجر پاپوش پٹنہ سٹی - احمد اللہ کے مختار کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا احمد اللہ کے خلاف مقدمہ میں سرکاری گواہ بن گیا - ۱۸۶۵ء میں رہا کیا گیا -

مقدمہ کا آغاز یہ قیدی تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ کرنے کے ملزم قرار دیے گئے تھے - اس مقدمے کے قانونی مباحثوں سے ہمیں یہاں بحث نہیں - مقدمہ کی سرکاری ضخیم رودادوں میں ان کی تلخیص موجود ہے - اور دو سزا یافتہ شخصوں کی تصانیف میں بھی شامل ہیں جو اپنی گرفتاری اور مقدمات کے بارے میں لکھنے کو زندہ بچ رہے تھے - استغاثہ کے موٹے موٹے واقعات بہت حد تک درست تھے مگر حکومت کے پاس ان تمام ملزموں کے واقعی جرم کے ثبوت میں کافی مواد اور گواہ نہ تھے جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے بحث کی جائے گی - جس طور سے گواہوں کو سکھایا پڑھایا جاتا سخت جسمانی ایذائیں اور پھانسی کی دھمکی بھی دی جاتی - اس نے ان کارروائیوں کی قانونی حیثیت اور وقار کی مٹی اور زیادہ پلید کی -

قیدیوں کے وکلاء جواب دعویٰ میں قیدیوں کی طرف سے زیادہ کچھ نہیں کہا گیا - صرف شفیع نے جو ایک دولت مند آدمی تھا شروع میں ایک وکیل مقرر کیا - جعفر نے اپنی طرف سے خود جرح کی اور اپنے مقدمے میں خود بحث کی، یحییٰ علی نے وکیل مقرر کرنے سے انکار کیا اور اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہا - تمام دوران سماعت مقدمہ میں قرآن کی آیتیں تلاوت کرتے یا عربی قطعہ پڑھتے

رہے جس کا مضمون یہ تھا کہ انسان کو اس کی پروا نہ کرنا چاہیے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوتی ہے کیونکہ بہرحال انسان کو خدا کے ہاں واپس جانا ہی ہے[1]

مگر بعد میں عبدالرحیم نے شفیع کے اصرار سے اپنے اور یحییٰ علی کے لیے کلکتہ کے ایک مشہور بیرسٹر مسمّی پلوڈن[2] کو وکیل مقرر کیا۔ وہ ناقابل قیاس فیس اکیس ہزار روپے پر کام کرنے کو راضی ہوا۔ ولایت علی کے چھوٹے بیٹے محمد حسن جو اس وقت اٹھارہ سال کے تھا اور حاجی مبارک علی نے مدافعت کے ضروری انتظامات میں غیر معمولی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔

عدالت کا فیصلہ ۲۰ مئی کو فیصلہ سنایا گیا۔ یحییٰ علی، محمد جعفر اور محمد شفیع کو سزائے موت اور باقی کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزائیں سنائی گیئں اور ملزمین کی تمام جائدادوں کی ضبطی کا حکم صادر ہوا۔ فیصلہ روداد کے ایک سو صفحوں سے زیادہ پر محیط۔ ایک طویل دستاویز ہے ہنٹر نے فیصلہ کے متن سے جو کچھ نقل کیا ہے اس میں ہر قیدی کے علیحدہ علیحدہ جرم کا بیان خلاصہ دینا کافی ہوگا۔

یحییٰ علی اس عظیم بغاوت کی بڑی کمانی تھے جسے اس مقدمہ کی سماعت نے کھول دیا ہے۔ اس نے اپنے سینکڑوں ہزاروں ہموطنوں کو بھکا کر غدر اور بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس نے اپنی سازشوں سے برطانوی حکومت ہند کو سرحد کی جنگ میں مبتلا کر دیا جس میں سینکڑوں جانیں ضائع ہو گیئں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہے اور ناواقفیت کا عذر پیش نہیں کر سکتا۔ جو کچھ اس نے کیا ہے پہلے سے سمجھ بوجھ کر، پختہ ارادے اور سخت غداری سے کیا ہے۔

جعفر۔ اس قیدی کی شدید عداوت اور باغیانہ، مفسدانہ قابلیت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ شخص ہے اور اپنے گاؤں کا مکھیا ہے۔ اس کے جرم میں کوئی شک وشبہ نہیں، نہ اس میں تخفیف کی کوئی وجہ ہے۔

---

[1] تاریخ احمدی صفحہ ۳۹۔ تذکرہ صادقہ ۶۹ و ۷۰ [2] اس زمانہ کے اثنا آنے پر جج نے اسے جیل میں اپنے موکلوں سے ملنے کی اجازت نہ دی۔ جوڈیشل کمشنر کے ہاں اپیل کی، اس نے بھی عذر سننے سے انکار کر دیا۔ آخر لفٹنٹ گورنر کے پاس اپیل کی تو اپنے موکلوں سے ملنے کی اجازت ملی۔ اس طرح ایک وکیل دفاع کو اتنے سے معمولی قانونی حق حاصل کرنے میں دو ہفتے ضائع ہو گئے (تذکرہ صادقہ صفحہ ۶۹)

عبدالغفار۔ یہ مہمان خانے کے تمام دنیاوی معاملات کا بندوبست کرتا اور روزانہ رنگروٹوں کو جہاد کے فرض عظیم پر لیکچر دیا کرتا۔ جو کچھ اس نے کیا کامل خلوص دل سے کیا اور آخر تک انبالہ میں گواہوں کے کٹہرے میں اپنے آقا کے پہلو میں بے باکانہ کھڑا رہا[1]

قیدی عبدالرحیم کے خلاف یہ ثابت ہے کہ یہ غدارانہ کارروائیاں اسی کے مکان میں ہوتی تھیں۔ اسی کا نوکر خزانچی بھی تھا، رنگروٹوں کو کھلاتا پلاتا اور مذہبی دیوانوں کو چندے کی رقمیں بھی بھیجتا۔ جو کچھ اس کے بس میں تھا اس نے حکومت کے خلاف کیا۔

حسینی ساکن پٹنہ (الٰہی بخش کے نوکر) کے خلاف ثابت ہے کہ مالک نے اُسے باغیانہ اغراض کے لیے ترسیل رقوم پر مامور کیا تھا۔ اور یہ کہ جس خدمت پر وہ مامور تھا اس کی باغیانہ نوعیت کو وہ خوب سمجھتا تھا۔

عبدالغفور کے خلاف یہ ثابت ہے کہ وہ پٹنہ کے یحییٰ علی کا مرید تھا، اور یحییٰ علی نے اس کو تھانیسر میں باغیوں کو بھرتی کرنے والے گودام میں قیدی جعفر کا مددگار متعین کیا تھا اور مدد کرتا رہا۔

قاضی میاں جان کے خلاف یہ ثابت ہے کہ وہ بنگال میں جہاد کی تبلیغ کرتا اور آدمی بھرتی کرتا۔ روپے تحصیل کرتا اور بھیجتا اور خطوط کو آگے بڑھاتا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے گھر سے نہایت باغیانہ قسم کی مراسلت پکڑی گئی ...... وہ چار عرفی نام استعمال کرتا تھا۔

الٰہی بخش کے خلاف یہ ثابت ہے کہ یہی واسطہ تھا جس سے پٹنہ کے مولوی اپنی تحصیل کردہ رقوم بالائی حصہ ملک میں جعفر تھانیسری کو ملکہ اور ستھانہ منتقل کر دینے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔

عبدالکریم کے خلاف ثابت ہے کہ باغیانہ کاموں کے لیے پٹنہ کے منی آرڈروں کو بھنانے کے لیے محمد شفیع ٹھیکیدار گوشت کا خفیہ کارپرداز تھا۔

حسینی تھانیسری محمد جعفر اور محمد شفیع قیدیوں کا ان کی غداریوں کا خفیہ کارپرداز اور دلال تھا۔ اور جعفر کی طرف سے محمد شفیع کے پاس ملکہ (وکٹوریہ) کے دشمنوں کو پہنچانے کے لیے

---

[1] یہ تبصرہ خود ہنٹر کا ہے صفحہ ۹۱

دو سو نوے اشرفیاں لے جاتے ہوئے پکڑا گیا۔

شفیع کو پہلے موت کی سزا کا حکم دیا گیا لیکن سرکاری گواہ ہو جانے کے بعد یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور دو برس جیل میں رہنے کے بعد بری ہو گیا۔ مگر اس کی جائداد جو پہلے ضبط کر لی گئی تھی واپس نہیں کی گئی۔

عدالتی فیصلے کی توثیق

یہ فیصلے توثیق کے لیے جوڈیشیل کمشنر رو برٹس کے پاس بھیجے گئے۔ داخلی حکومت سے مشورہ کرنے میں مسلسل التواؤں کے بعد فیصلہ ۲۴ اگست ۱۸۶۴ء کو صادر ہوا۔ سزاؤں میں خفیف سی ترمیم کر دی گئی۔ تین ملزموں کے لیے جو موت کی سزا مقرر کی گئی تھی اسے حبس دوام میں بدل دیا گیا۔ لفٹنٹ گورنر کا آخری حکم ستمبر میں صادر ہوا۔ قیدی مقدمہ کے آغاز سے فروری ۱۸۶۵ء تک انبالہ جیل میں رہے۔ چھاؤنی کے احاطے میں جو یورپی خاندان رہتے تھے وہ آ کر ان کو اعجوبہ منظر کی حیثیت سے دیکھا کرتے۔ اس زمانہ میں ایک بار جیل کے وارڈر (محافظ) نے یہ پیش کش کر دی کہ وہ ان کو نکل بھاگنے کا موقع دے گا اور فرض منصب میں غفلت کی جو سزا بھی ہو وہ بھگت لے گا۔ مگر قیدیوں نے اسے قبول نہ کیا۔

ہنٹر کا قیدیوں کو خراج تحسین

سرکردہ "سازشیوں" کے چال چلن اور "جرائم" پر تبصرہ کرتے ہوئے ہنٹر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ چار و ناچار، یحییٰ علی اور جعفر کے خلوص اور ایمان داری کی تحسین کرے "جنہوں نے نہ کبھی وفاداری کا اظہار کیا نہ ہم سے کوئی رعایت طلب کی۔ یہ مخلص اور ایمان دار لوگ تھے جنہوں نے اپنے تئیں زہر میں بجھے ہوئے ہتھیار سمجھ لیے تھے جو ایک باطل دین نے ان کے ہاتھ میں دے رکھے تھے اور اب جب کہ انہوں نے اپنی غداری کا خمیازہ بھگت لیا تو تاریخ ان کے حشر کو ایسے جذبے سے یاد رکھے گی جو نہ ترحّم و تاسّف سے ملتا جلتا ہوگا۔"

شفیع کے بارے میں جس نے اپنی جان بچانے کو اپنے رفقاء اور مقصد دونوں سے غداری کی، ہنٹر لکھتا ہے "مگر محمد شفیع کے لیے ایسا کوئی جذبہ ابھر نہیں سکتا۔ اس نے ہمارا ہاتھ چاٹا اور اسی کو کاٹا، اور وہ شروع سے آخر تک ذہین چالاک اور کمینہ منصوبہ ساز دکھائی دیتا ہے۔

قیدیوں پر ظلم و تعدّی

فروری ۱۸۶۵ء سے جب کہ قیدیوں کی پہلی کھیپ جزائر انڈمان کی عجیب نوآبادی کے سفر میں جہاں وہ تقریباً ایک سال میں پہنچی، راستے میں لاہور میں رکی تو قیدیوں کے لیے ہولناک بدخوابیوں اور خلاف انسانیت ایذارسانیوں کا دور شروع ہوا۔ ۲۲ فروری کو وہ انبالہ سے لاہور منتقل کیے گئے۔ ان دونوں مقامات کے درمیان پیدل سفر کیا گیا۔ عبدالرحیم کو کچھ دنوں کے لیے اس امید میں انبالہ میں روک لیا گیا کہ سرحد پر عبداللہ اور دوسرے رفقاء سے اطاعت قبول کرانے کی تجویز میں ان کو واسطہ بنایا جائے۔ مگر انہوں نے اپنے گرفتار کرنے والوں کی بات نہ مانی اور فوراً ہی انڈمان چالان کر دیے گئے۔ قیدی اسی سال اکتوبر کے آخر میں لاہور سے ملتان کے جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ سفر کے دوران سب قیدی اکٹھے زنجیر میں بندھے ایک مقفل ڈبے میں بند رہتے جو منزل پر پہنچ کر ہی کھولا جاتا۔ ملتان کے قریب ایک مقام سے اسٹیمر میں بٹھائے گئے اور دریائے سندھ سے کراچی لائے گئے۔ سفر کے دوران پورے ایک ہفتہ قیدی اکٹھے ایک تختوں کے فرش پر بٹھائے گئے اور ان کی زنجیروں سے ایک اور زنجیر ایک سرے سے دوسرے سرے تک یوں گزار دی گئی تھی کہ وہ اپنی جگہوں پر کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ اسی جکڑ بندیت میں حاجت ضروری سے بھی نمٹا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں ان کی آہنی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کا مجموعی وزن فی کس آدھ من سے کم نہ ہو گا۔ کراچی سے وہ بمبئی لائے گئے اور اس زمانہ کے ہولناک تھانہ جیل میں رکھے گئے جو ایک پرانے ویران مرہٹہ قلعہ میں واقع تھا۔ یہ قید خانہ قیدیوں پر نہایت سخت اور بے دردانہ ایذاؤں کے لیے مشہور تھا اور صرف بدترین قسم کے مجرم یہاں رکھے جاتے تھے[1]

اس مختصر بیان سے ہمیں ان جسمانی ایذاؤں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو وہابیوں کو انڈمان جاتے ہوئے راہ میں جھیلنا پڑیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی سیاسی قیدیں جن میں اخباروں وغیرہ تک کی فراہمی کا انتظام ہوتا ہے اُس زمانے میں قیدیوں پر شدائد کے مقابلہ میں کتنی آسان ہیں۔ انڈمان کا سفر ۸ دسمبر کو شروع ہوا اور ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو ختم ہوا۔ اس کے بعد جزیرہ انڈمان میں قیدیوں کی زندگیوں کو علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] تواریخ عجیب صفحہ ۵۶-۵۲

(ب) ۱۸۶۵ء کا مقدمہ پٹنہ

انبالہ کے مقدمہ کا لازمی نتیجہ تھا پٹنہ کا مقدمہ۔ اُس زمانہ میں پٹنہ میں تلاشیاں ہوئی تھیں تو احمد اللہ کے گھر کی بھی تلاشی لی گئی تھی۔ مگر پنجاب اور پٹنہ کے حکام کے درمیان ان کی گرفتاری کے مناسب ہونے پر اختلاف رائے کے سبب سے وہ اُس وقت گرفتار نہیں کیے گئے۔

احمد اللہ اوائل اکتوبر ۱۸۶۴ء میں حکومت پنجاب کے سکریٹری نے حکومت بنگال کے سکریٹری کے نام ایک چٹھی بھیجی جس میں ڈپٹی کمشنر انبالہ کے دو مراسلے مورخہ ۱۶ اور ۱۹ ستمبر ۱۸۶۴ء احمد اللہ کے حکومت کے خلاف سازش میں ملوث ہونے کے موضوع پر منسلک تھے۔ ان میں لکھا تھا کہ انبالہ کے مقدمہ میں استغاثہ کے بعض گواہوں کے بیانات سے ظاہر ہوا کہ احمد اللہ اکثر ان خفیہ جلسوں میں موجود ہوتا تھا جن میں یحییٰ علی تقریر کرتا تھا۔ مقدمہ انبالہ کے ایک ملزم الٰہی بخش کے بیان سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کچھ رقوم جو سرحد بھیجنے کے لیے اس کے پاس جمع کی جاتی تھیں۔ احمد اللہ ہی کی معرفت جمع ہوتی تھیں۔ اور یہ کہ اُسی کے حکم سے رقمیں برآمد کی جاتی اور بھیجی جاتی تھیں۔ اُسی کی ہدایت سے الٰہی بخش حسابات بجائے اس کے (احمد اللہ کے) نام کے عبدالغفار کے نام رکھتا تھا۔

وہابیوں کی کارروائیوں کے موضوع پر حکومت پنجاب کے محافظ خانوں میں پرانے کاغذات کی چھان بین کی گئی۔ ان میں سے ایک سے احمد اللہ کے متعلق یہ رپورٹ برآمد ہوئی۔

جس زمانے میں فیاض علی اور یحییٰ علی کا پڑاؤ ستھانہ میں تھا "عظیم آباد میں مولوی فرحت حسین برادر مولوی ولایت علی اور مولوی احمد اللہ اپنے گھروں میں اپنے گاؤں سے روپے تحصیل کرتے اور اسلحہ اور سامان جمع کرتے۔"

احمد اللہ پر الزامات ان حالات کے پیش نظر جب کہ مزید تفصیلات حاصل کرنے کے لیے (مزید تحقیقات کی امید کی جاتی تھی) ڈپٹی کمشنر انبالہ نے پٹنہ کے حکام کو مشورہ دیا کہ بالخصوص ان الزامات پر احمد اللہ کو گرفتار کر لیا جائے (۱) ان مکانات کو جن میں وہ خود خاندان کے اور ارکان کے ساتھ رہتے تھے ستھانہ کے مذہبی دیوالنوں کے لیے زنگروٹ

بھرتی کرنے دفتر کے طور پر استعمال کرنا (۲) غدر کے ایام میں پٹنہ میں سازش کرنا (۳) اس خاندان کا سردار ہونا جسے بہت بیشتر پنجاب کے بورڈ ایڈ منسٹریشن (مجلس منتظمہ) نے ۱۸۴۷ء میں متنبہ کر دیا تھا کہ سرحد پر گڑبڑ نہ پھیلائے (۴) ایسی کارروائیوں کو اپنے گھر میں موقوف کرنے میں قاصر رہنا ہی نہیں بلکہ برعکس ان کی حوصلہ افزائی اور اعانت کرنا۔

احمد اللہ کے خلاف شکایات

حکومت پنجاب کا یہ مراسلہ اپنے وقت پر یا کچھ قبل تو نہیں پہنچا۔ واقعہ یہ ہے کہ احمد اللہ پر یحییٰ علی کی گرفتاری کے وقت سے ہی ایک دھند چھائی ہوئی تھی۔ پٹنہ کے مقامی حکام ان حرکات میں جن کے لیے یحییٰ علی اور دوسرے ملزموں پر مقدمہ چل رہا تھا احمد اللہ کی شرکت کا شدید شبہ رکھتے تھے۔ ۱۸۶۴ء کے وسط میں ہی جب کہ ملزمین انبالہ کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر تھی پلوڈن وکیل صفائی نے قیدیوں کو احمد اللہ کی متوقعہ گرفتاری کی خبر دے دی تھی۔ عظیم آباد کے کچھ خود غرض آدمیوں نے جو احمد اللہ کے سماجی مرتبہ اور سرکاری اعزاز پر ان سے حسد رکھتے تھے ان کی شرکت سازش کے متعلق افسروں کے کان بھر دیے تھے ٹیلر پٹنہ کا برطرف کردہ ڈویژنل کمشنر اور وہابیوں کے خلاف زبردست پیروکار ابھی شہر ہی میں تھا۔ اس نے اور ایک جوان سارجنٹ پولیس الیشری پرشاد نے وہابیوں پر مقدمہ چلانے کی جدوجہد میں حکومت پر اپنے جوش و مستعدی کے اظہار کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ الیشری پرشاد نے اس نفع بخش تفویض کے لیے ایسی سرگرمی دکھائی کہ بعد میں حکومت نے اس کی خدمات دوبارہ طلب کر لیں۔

احمد اللہ کا وہابی تحریک میں حصہ

احمد اللہ کی ان باغیانہ سازشوں میں شرکت کے سوال پر کچھ تشریح کی ضرورت ہے کیونکہ بعض لوگوں نے اس تحریک میں ان کے حصہ کی مقدار پر شک کا اظہار کیا ہے۔ مہر کہتے ہیں کہ احمد اللہ نے اس

لہ اوائل جون ۱۸۶۵ء میں احمد اللہ کے گھر کی تلاشی لی گئی تھی اور اس کے چند دنوں بعد ٹیلر نے خود ان کو گرفتار کر لیا تھا سہ ان مقدمات میں الیشری پرشاد کو اس کی خدمت کے صلے میں ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ ملا اور ڈھائی ہزار روپے نقد انعام بھی (تاریخ عجیب صفحہ ۷۹) گورنمنٹ بنگال جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ نمبر ۱۲۶ مورخہ اکتوبر ۱۸۶۵ء)

تحریک کی تنظیم یا زیادہ عملی کاموں میں زیادہ عملی حصہ نہیں لیا۔ صرف یہی نہیں کہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے بلکہ اس مقدمہ میں جو بہت سارے دستاویزی ثبوت پیش کیے گئے ہیں اُن کے خلاف ہے۔ استغاثہ کا ایک جغادری گواہ الٰہی بخش کا بیان ہے کہ احمد اللہ کو سید احمد کے ایک خلیفہ نے ان تمام رقوم کا جو جمع ہوں ذمہ دار اور تمام متعلقہ امور کا نگران بنایا تھا۔ اور جعفر کی طرف سے احمد علی کے فرضی نام سے جو خطوط لاتے تھے اُن کو وہی وصول کرتے تھے۔ اوپر ہم دیکھ آئے ہیں کہ یحییٰ علی کی وفات[1] کے بعد احمد اللہ صادق پور کی مجلس عاملہ کے صرف سردار ہی نہ تھے بلکہ پہلے سے مشیر کی حیثیت سے کام بھی کرتے تھے۔ اسی حیثیت سے رقوم کو جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا کام بھی انہیں کے ذمہ تھے۔ اصلاً اسی بنا پر ۱۸۶۵ء میں ان کو سزا ہوئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سرحد نہیں گئے اور وہاں کے معرکوں میں حصہ نہیں لیا۔ مگر یحییٰ علی کی غیر حاضری کی پوری مدت میں پس منظر میں وہ خاموش اور غیر نمایاں روح تنظیم رہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ احمد اللہ صرف ایک تنخواہ دار سرکاری افسر ہی نہ تھے بلکہ کئی اور اعزازی عہدے بھی رکھتے تھے اور اس حیثیت سے خاندان کے اور ارکان کی طرح وہ کھلم کھلا حکومت کے خلاف کارروائیوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔

احمد اللہ کی گرفتاری

احمد اللہ کی بغاوت میں شرکت کے متعلق حکومت پنجاب کے خیال سے حکومت بنگال نے پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر اور مجسٹریٹ کو تحقیقات اور ان کی رائے کے لیے باقاعدہ لکھ بھیجا۔ لفٹنٹ گورنر نے بھی ہدایت جاری کر دی کہ احمد اللہ کو فوراً سرکاری عہدوں سے برطرف کر دیا جائے اور آئندہ کبھی کسی حیثیت سے حکومت کے تحت کسی ملازمت کے لائق نہ سمجھا جائے۔ مجسٹریٹ نے بنگالیوں کو جان بوجھ کر اُن مقاصد کے لیے

---

[1] یہاں مولانا یحییٰ علی کے لیے وفات (ڈیتھ) کا لفظ بظاہر مؤلف کی لغزش قلم معلوم ہوتا ہے۔ صحیح لفظ "سرحد کو رخصت" ہونا چاہیے دونوں بھائیوں کی رحلت جزیرہ انڈمان کے حبس دوام میں ہوئی۔ مولانا یحییٰ علی کی ۱۸۶۸ء میں اور مولانا احمد اللہ کی ۱۸۸۱ء میں۔ صحیح یہ ہے کہ جب مولانا یحییٰ علی پٹنہ سے "سرحد کو رخصت ہو گئے" تو پٹنہ میں مولانا احمد اللہ تحریک کے ذمہ دار سربراہوں میں سے تھے (مترجم)

[2] مہر خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کو احمد اللہ کے مقدمہ کی پوری روداد دستیاب نہیں ہوئی۔ یہ انتخاب دستاویزات حکومت بنگال جلد ۴۲ میں شائع ہو چکی ہے ان کے مطالعہ سے اُن کو اس تحریک میں ان کی قیمتی خدمات کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔

جن کو وہ باغیانہ جانتے تھے اپنے گھر میں جمع ہونے دینے کے الزام کو ایک قانونی عدالت میں ثابت کرنے کے لیے کافی قانونی دلائل حاصل کرنے میں سخت شکوک کا اظہار کیا تھا۔اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ احمد اللہ کے جرم کے سوال کو ناکامیابی سے اٹھانے سے بہتر ہوگا کہ اس قضیہ ہی سے ہاتھ اٹھالیا جائے۔مگر آخر میں بڑی موشگافی کے بعد اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس مقدمے میں اصل ثبوت پچھلے مقدمہ کے گواہان استغاثہ کے بیانات پر مبنی ہوں گے اور ان کا مزید اثبات وتوثیق اُن اطلاعات سے ہوگی جو مقامی تحقیقات سے حاصل ہوں۔اس لیے اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ملزم کے خلاف تفتیش شروع کر دی جائے۔

احمد اللہ نومبر میں گرفتار کیے گئے تھے۔اس سے ایک سال پیشتر ہی محکمہ انکم ٹیکس کی تخفیف کے ساتھ وہ اس کی ڈپٹی کلکٹری سے علیحدہ کیے جا چکے تھے۔مقدمہ انبالہ کے فیصلے کے اعلان اور اپنے بھائی یحییٰ علی کے جرم "غداری" میں سزایابی کے بعد وہ پٹنہ کی کمیٹی پبلک انسٹرکشن سے برطرف کر دیے گئے۔

احمد اللہ کے خلاف جرائم کی فہرست

اس مقدمہ کے چلانے کا کام پٹنہ کے مجسٹریٹ راونشا کے ذمہ کیا گیا تھا جو رخصت پر شملہ چلا گیا تھا۔اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ انبالہ ہوتا ہوا پٹنہ آجائے اور یہاں کے حکام سے ضروری صلاح ومشورہ کرے۔تمام مقامی افسروں کو ہدایت کر دی گئی۔کہ راونشا کو اس کی تفتیش میں ہر طرح کی مدد بہم پہنچائیں۔

الزامات کے تعین کے متعلق تمام ابتدائی کارروائیاں قائم مقام مجسٹریٹ پٹنہ مونرو کی عدالت میں انجام پائیں۔۱۶ر جنوری ۱۸۶۵ء کو احمد اللہ پر یہ الزامات عائد کیے گئے:

۱۔کہ ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء کو یا ان کے قریب قریب انہوں نے ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ کا ارادہ کیا . . . . یہ جرم دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند کے تحت قابل سزا ہے۔

۲۔کہ اسی زمانے میں ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ میں اعانت کی . . . . یہ دفعہ ۱۰۹ اور ۱۲۱ کی رو سے جرم ہے۔

۳۔کہ اسی زمانے میں انہوں نے ملکہ کے خلاف جنگ کے ارادے میں اعانت کی (تعزیرات

ہند ۱۰۹ و ۱۲۱) یہ اقدام اسی اعانت کے نتیجے میں کیا گیا۔

۴۔ کہ اسی زمانہ میں انھوں نے ملکہ کے خلاف جنگ کرنے کے ارادے سے آدمیوں کو جمع کرنے میں اعانت کی۔

۵۔ کہ انھوں نے اپنے عمل اور ناجائز فرو گزاشتوں سے ملکہ کے خلاف جنگ آوری کے منصوبے کی موجودگی کا اخفا کیا۔

سشن کی سماعت اینلی ڈسٹرکٹ جج پٹنہ کی عدالت میں منعقد ہوئی۔ اسیسروں کا ایک بورڈ اس کا مددگار مقرر ہوا۔ انبالہ سے بہت سے گواہان استغاثہ بلائے گئے جن میں سب سے اہم آلہی بخش اور عبدالکریم تھے۔

احمد اللہ کے خلاف عدالت کا فیصلہ

وکیل صفائی نے بحث میں دکھایا کہ دفعہ ۱۲۱ ملک کے اندر سے جنگ کرنے کے ارادے سے تعلق رکھتی ہے اور یہ بھی دکھایا کہ کوئی شخص دو آدمیوں کی شہادت کے بغیر بغاوت کا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا (دفعہ ۲۸ ایکٹ ۲ ۱۸۵۵ء) اور یہ کہ اس مقدمہ میں احمد اللہ کو صرف ایک آلہی بخش کی شہادت پر ملزم قرار دیا گیا ہے۔ اس نے آلہی بخش کی شہادت کی قدر و قیمت پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس لائق بھی نہیں کہ ایک کتے کو بھی پھانسی دینے کے لیے کافی سمجھی جائے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے خلاف حبس دوام بہ عبور دریائے شور اور ضبطی جائیداد کی سزا کا حکم صادر ہوا تھا۔ جس کے پاس کچھ نہ رہا تھا جس کا اسے اندیشہ ہو نہ کوئی امید باقی رہی تھی۔ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ گواہان استغاثہ جنھوں نے احمد اللہ کی شناخت اب کی ہے اب سے پہلے انبالہ یا ہوڑا میں نہیں کی تھی۔ مگر جج نے یہ تمام دلائل رد کر دیے، اور اپنے فیصلے میں لکھا کہ "یہ امر بالکل صاف ہے کہ حکومت برطانیہ کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے لیے آدمی اور روپے سرحد پر بھیجنے کا ایک باقاعدہ منظم سلسلہ تھا۔ اور یہ کہ اس باغیانہ کام کے لیے جو اشخاص مقرر تھے ان میں قیدی (احمد اللہ) کے بعض بہت قریبی قرابت دار تھے، اور یہ کہ قیدی قافلہ کی املاک کا جنرل مینجر مقرر کیا گیا تھا، اور یہ کہ وہ روپے وصول کرنا اور ان جلسوں میں شریک ہوتا جہاں بغاوت کی تبلیغ کی جاتی، اور یہ کہ وہ اس کمیٹی کا ممبر تھا جس نے بغاوت

کی تنظیم کی تھی۔" [1]

جج نے قیدی کو دوسرے چوتھے اور پانچویں الزامات کا مجرم قرار دیا۔ اس نے پہلے الزام سے اُسے بری کر دیا اور دوسرے الزام کو تیسرے میں مدغم تصور کیا۔ اسیسروں نے بھی اس کو پانچویں الزام کا مجرم تسلیم کیا۔ ۲۷ر فروری ۱۸۶۵ء کو قیدی کو سزائے موت کا حکم سنایا اور اس کی املاک کو ضبط کرنے کی ہدایت کی۔

احمد اللہ کو حبسِ دوام کی سزا

فیصلہ توثیق کے لیے ہائی کورٹ کے سپرد کیا گیا۔ ہائی کورٹ نے سشن کورٹ کی تمام کارروائیوں کو پیش نظر رکھ کر ۱۳ر اپریل ۱۸۶۵ء کو طے کیا کہ ان کے سامنے جو شہادتیں ہیں وہ قیدی پر دوسرے الزام کے لیے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ کی رو سے سزا کی تائید میں کافی ہیں۔ لیکن شہادتوں سے ہم یہ نہیں پاتے کہ قیدی نے اس سازش میں دوسرے سزا یافتگان سے زیادہ عملی حصہ نہیں لیا۔ اس لیے ہم سشن جج کی دی ہوئی سزائے موت کی توثیق سے انکار کرتے ہیں بلکہ ہدایت کرتے ہیں کہ قیدی احمد اللہ کو حبس دوام بعبور دریائے شور دیا جائے اور اُس کی تمام املاک بحق سرکار ضبط کی جائے۔

احمد اللہ کی جزائر انڈمان روانگی

چنانچہ احمد اللہ جزائر انڈمان منتقل کر دیے گئے وہ کلکتہ کے راستے سے بھیجے گئے۔ اور جون ۱۸۶۵ء میں انبالہ کے پہلے مقدمہ کے اور سزا یافتہ ملزموں سے پہلے وہاں پہنچے۔

انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات ایک دوسرے سے بالکل وابستہ تھے۔ دونوں مقدموں میں گواہان استغاثہ کا ایک ہی گروہ اور بہت حد تک ایک ہی طرز کی شہادتیں کام میں لائی گئیں سزا یافتگان میں جعفر اور شفیع کے سوا دونوں مقدموں کے اہم ملزمین ایک ہی مخصوص جگہ کے باشندے اور قریبی قرابت دار تھے۔ درحقیقت اگر انبالہ اور پٹنہ کے افسروں میں کچھ بیشتر ہم آہنگی اور منصوبہ بندی ہوتی تو احمد اللہ پہلے گرفتار کر لیے جاتے۔ پٹنہ کا مجسٹریٹ اس عدم

---

[1] انتخابات دستاویزات حکومت بنگال جلد ۲ ہم صفحہ ۷۹ تا ۸۳

ہم آہنگی پر اپنے افسوس کے اظہار سے باز نہ رہا۔

مقدمہ انبالہ کے نمایاں پہلو

مقدمہ انبالہ کے تین نمایاں ترین پہلوؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے، ہنٹر کہتا ہے کہ قابل تعریف ہے وہ دانش مندی جس سے ایسی وسیع الذیل بغاوت کی تنظیم کی گئی، وہ اخفا جس سے اس کی پیچیدہ کارروائیاں چلائی گئیں اور وہ کامل وفاداری جو اس کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ قائم رکھی ہے بے شبہ منصوبہ پر عمل درآمد بڑی ذہانت سے منظم کیا گیا تھا۔ قانوناً درست اور جائز مشاغل خلاف حکومت کارروائیوں سے اس عیاری سے خلط ملط کر دیے گئے تھے کہ حکام کے لیے ان دونوں میں تمیز کرنا سخت دشوار تھا۔ مثلاً الٰہی بخش ان رقوم کے علاوہ جو وہ سرحد بھیجتا تھا وہ واقعی جوتوں اور دوسری چیزوں کی جائز خریداری کے لیے بھی روپے بھیجا کرتا تھا۔ تحریک کے جمہور کارکنوں کی ایمان داری بھی بہت نمایاں تھی۔

ان دونوں مقدموں میں استغاثہ نے جو طریقے اختیار کیے وہ بھی غور طلب ہیں یہ سچ ہے کہ

.... دونوں مقدموں میں قیدیوں پر جو الزامات عاید کیے وہ نفس الامر میں درست تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ صفائی کی تمام بحثوں میں بھی آدمی اور روپے کی فراہمی کے ایک وسیع و عریض جال کے وجود سے انکار نہیں کیا گیا۔ ملزمین میں سے یحیٰی علی نے کوئی بھی صفائی دینے سے قطعاً انکار کیا۔

بہرحال ان تمام واقعات کو یکجا کرکے یہ معنی نہیں نکلتے کہ ان کے جرائم دستاویزی اور زبانی شہادتوں کی بنیاد پر ایک قانونی عدالت میں قانوناً ثابت ہو سکے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا حکام استغاثہ خود مشتبہ تھے آیا احمد اللہ کا باغیانہ منشا تشفی بخش طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ احمد اللہ کے مقدمہ کی سماعت کے موقعہ پر پٹنہ کے مجسٹریٹ نے کہا تھا کہ اس مقدمہ میں انبالہ کے گواہوں کے بیانات بنیادی ثبوت ہوں گے، باقی دوسرے ثبوت جو مقامی طور پر مہیا ہوں گے وہ انہیں کا تکملہ ہوں گے اور ہم یہ بھی دیکھ آئے ہیں کہ انبالہ کے گواہوں کے بیانات یکجا کر ایک ہی شخص الٰہی بخش کی شہادت کی شکل میں بنیاد ہوئے ہیں جیسا کہ راوَنشا نے خود اقرار کیا یہ وہی شخص ہے جو خود اس قسم کا سزایافتہ[1] تھا اور جسے مجسٹریٹ نے سماعت مقدمہ کے دوران عملاً

---

[1] سلکشنز (انتخابات) مصرحہ بالا صفحہ ۱۶۵

حراست میں رکھا اور کسی سے ملنے کی کبھی اجازت نہ دی۔

قیدیوں کے خاندانوں کو دھمکیاں

جعفر اور عبد الرحیم نے دوران تفتیش اور بعد میں جیل کے اندر پولیس نے جو بہیمانہ سلوک کیے ان میں سے بعض کا تفصیلی تذکرہ اپنی تصنیفوں میں کیا ہے۔ ملزموں کے خلاف بہت سے لوگوں کو خوف زدہ کر کے شہادت دلوانے کے لیے بے تحاشا اور بلا امتیاز گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ انبالہ میں جعفر اور شفیع کے خاندان کے بعض افراد کو جعفر کے انبالہ سے فرار ہو جانے کے بعد ان کا پتا بتانے کے لیے بہت مارا پیٹا گیا۔ پارسنز نے جعفر کی تلاش میں دہلی پہنچ کر شہر میں دہشت و ہراس کا عالم برپا کر دیا۔ شہر کے سب دروازے اور سرائیں بند کر دی گئیں، ہزاروں آدمیوں کو تخویف اگرفتاری اور پھانسی تک دھمکیوں اور مالی ترغیب و تحریص سے بھی ملزموں کے خلاف شہادت دینے کے لیے پھانس لیا گیا۔

سرکاری گواہوں پر نوازشات

خود سرکاری کاغذات بھی گواہوں کو روپے دینے کی تصدیق کرتے ہیں۔ مقدمہ کے اختتام کے بعد آلہی بخش کو نہ صرف معاف اور بری کر دیا گیا بلکہ پٹنہ سٹی محلہ نگلا میں اس کا مکان جو پہلے ضبط کر لیا گیا تھا اُسے واپس کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کے اور ضبط شدہ مال کی فروخت سے جو زرثمن حاصل ہوا تھا اس میں سے پانسو روپے کوئی کاروبار کرنے کے لیے اسے دیے گئے۔ اور گواہوں کو جو پنجاب سے لائے گئے تھے اور جن کی تعداد دس تھی، ۴۷۰ روپے دیے گئے۔ (نو کو پچاس پچاس روپے فی کس اور ایک کو بیس روپے) یہ بظاہر ان کے وقت کی بربادی اور اپنے مختلف کاموں سے غیر حاضری کی تلافی کے طور پر دیے گئے تھے۔ مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں ان عطیات کی سفارش کرتے ہوئے اس امر پر بہت زور دیا کہ یہ گواہ اپنی مرضی سے رُکے ہوئے تھے۔ لیکن ہمیں اسی مجسٹریٹ کی ایک دوسری چِٹھی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گواہ پٹنہ کے قیام کے دوران میں مجسٹریٹ کے احاطے میں رکھے گئے تھے اور ان کو باہر جانے یا کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے قرین قیاس ہے کہ ان کو کھانا بھی مجسٹریٹ کے ہاں سے ہی ملتا ہو گا۔ پھر تلافی کی رقم کا جواز کہاں رہا؟ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ انبالہ کے مقدمہ میں بھی ایسے ہی عطیات دئے گئے تھے۔

ایک گواہ سے بہیمانہ سلوک

جیل میں قیدیوں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے بہیمانہ سلوک کیے گئے۔ جعفر اس وحشیانہ خوشی کا ذکر کرتے ہیں جو جیل کے افسروں نے سزا یافتہ قیدیوں کے پھانسی دینے کے سامان (نئی ریشمی ڈوری اور چوبی تختے خرید کر) فراہم کرنے میں دکھائی[1] ساتھ ہی ساتھ قیدیوں سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کی رہائی یا جیل میں بہتر سلوک کی پیش کش کر کے ان کو ورغلایا جاتا تھا۔ شفیع کو جو سرکاری گواہ بن گیا تھا دوسرے قیدیوں کے سامنے جو مرض یا مشقت کے سخت حملے کے بعد فاقہ زدہ ہوتے تھے ابہترین غذا ملتی تھی۔ جعفر ایک چودہ سالہ لڑکے کا واقعہ بھی بیان کرتے ہیں جسے استغاثہ ایک خاص طرز پر شہادت دینے کی تعلیم کرتا تھا۔ کٹہرے میں پہنچ کر اپنا پڑھایا ہوا سبق بھول گیا۔ اس پر پولیس نے اسے مارتے مارتے مار ڈالا۔ بعد میں ظاہر کیا گیا کہ وہ قدرتی موت سے مر گیا۔

جج کا انتقامی رویّہ

جعفر کے خیال کے مطابق سزائے موت کی تنسیخ میں جوڈیشنل کمشنر کے ترحم کا انداز بھی خواہش انتقام کے تحت تھا۔ اس نے لکھا کہ جب حکام کو معلوم ہوا کہ قیدی نے سزائے موت کا خیر مقدم کیا کہ اب وہ اپنے مقصد عظیم کے لیے مرکر شہادت کا درجہ پائیں گے انہوں نے ان کو اس خوشی سے محروم کرنے کے لیے ان کی سزائیں بدل دیں۔ ہنٹر بھی "ان میں سے بدترین غدار باغیوں (ملزمین انبالہ) کو شہادت کی سعادت سے محروم کر کے حکام نے جو دانشمندانہ انتقام لیا اس کی تحسین" کر کے جعفر کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ پٹنہ کے مقدمہ کے متعلق عبدالرحیم، پٹنہ کے سشن جج احمد اللہ کی سماعت کے آغاز میں پٹنہ کے سیشن جج کے تبادلے کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ جج اپنے جذبۂ عدالت اور آزادی رائے کے لیے معروف تھا۔

اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی کہ یہ بیانات ان لوگوں کے ہیں جو خود سزا رسیدہ تھے کم سے کم یہ حقیقت صاف عیاں ہے کہ استغاثہ نے غیر معمولی طریقے استعمال کیے۔

---

[1] یہ عجیب اتفاق تھا کہ جعفر اور دوسرے قیدیوں کی سزائے موت میں تخفیف ہوگئی اور وہ ڈوری اور چوبی تختہ اس جیل میں ایک یورپی کو پھانسی دینے کے لیے استعمال ہوئے۔

جعفر تھانیسری کی صاف گوئی

اس باب میں یہ ذکر بے جا نہ ہو گا کہ جعفر گرفتاری مقدمہ کی سماعت اور فیصلے سے متعلق واقعات بیان کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وارداتیں بھی آزادانہ بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب شفیع کو عمدہ عمدہ غذا مل رہی تھی اور دوسرے فاقہ کھینچ رہے تھے ایک بار انہوں نے شفیع کے کھانے میں سے کچھ پلاؤ چرا لیا تھا۔ اسی طرح شفیع کو جو روپے بھیجے گئے تھے ان سے انہوں نے دس روپے رکھ لیے تھے (انہوں نے انڈمان میں کچھ روپے کما لیے تو وہ رقم اس کو واپس کر دی) یہ واقعات انسانی کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں جو قیاس کیے جا سکتے ہیں۔ ان سے جعفر کے بیانات کی صداقت و وقعت بھی ثابت ہوتی ہے۔

الٰہی بخش پر غیر معمولی نگرانی

سرکاری رودادوں سے بھی استغاثہ کے اطوار اور نیت کا پتا چلتا ہے۔ خود پٹنہ کے مجسٹریٹ نے کمشنر کو رپورٹ دی کہ الٰہی بخش چھپا کر انبالہ سے لایا گیا اور کھگول اسٹیشن پر اتار لیا گیا، وہاں سے عورت کے بھیس میں یکہ پر لایا گیا اور مجسٹریٹ کے احاطے میں ایک بنگلے میں سخت پہرے میں رکھا گیا پٹنہ میں اس کی موجودگی کی خبر کسی کو نہ تھی جب تک کہ وہ گواہ کے کٹہرے میں کھڑا نہ کر دیا گیا۔ اور قیدی بھی جو پنجاب سے لائے گئے اسی طرح مجسٹریٹ کے احاطے میں بند رکھے گئے۔ الٰہی بخش کو اس کی نظر بندی کے دوران پنجاب پولیس فورس کے تین آدمیوں کی نگرانی میں رکھا گیا۔ وہ بھی خاص طور پر پنجاب سے ہی بلائے گئے تھے۔ بعد میں احمد اللہ کے متعلق فیصلے کے بعد پولیس کے ان تین افسروں کو ان کے پٹنہ میں اقامت کے صلے میں جملہ چار سو روپے انعام میں عطا کیے گئے[۱] جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ الٰہی بخش ہی کی شہادت پر احمد اللہ سزایاب ہوئے اور اس بات پر نظر کرتے ہیں کہ تمام دوران سماعت مقدمہ میں حکام نے کس طرح اس کو بند رکھا اور پھر اس کو کثیر رقم انعام میں دی تو معاملہ سخت مشتبہ ہو جاتا ہے۔ ایک مقامی معمولی افسر البشری پرشاد کے متعلق جس نے مقدمہ کی تفتیش میں اتنی سرگرمی دکھائی مجسٹریٹ لکھتا ہے

---

[۱] سلیکشنز (منتخبات) متذکرہ بالا صفحات ۳-۴-۱۱۰-۱۱۱

کہ "میں اس کی کماحقہ تعریف نہیں کر سکتا۔" اُس کو بھی ملازمت میں ترقی کے علاوہ نقد انعام دیا گیا۔

(ج) سزا رسیدگان کی زندگی جزائر انڈمان میں

جزائر انڈمان جسے عام طور پر "کالا پانی" کہتے ہیں سزا یافتہ قیدیوں کی نوآبادی ہے۔ یہ مختلف رقبوں کے کئی جزیروں کا مجموعہ ہے جن کو اُتھلا سمندر اور چوڑی ندیاں ایک دوسرے سے جُدا کرتی ہیں۔ زیادہ تر جزائر جنگلات سے ڈھکے اور پہاڑوں کے سلسلے سے بھرے ہیں۔ کوہ ہیریٹ کی بلند ترین چوٹی گیارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ ان اسباب سے مزروعہ زمین کا رقبہ کچھ زیادہ نہیں۔ جزائر کے قدیم باشندے جنگلوں میں رہتے ہیں۔ جہاں انہوں نے مزروعہ اراضی کے چھوٹے چھوٹے قطعے تیار کر لیے ہیں۔ قیدیوں اور ان کی نوآبادی کے افسروں کے لیے غلے کلکتہ سے آتے تھے جو اسٹیمر سے پانچ دن کا راستہ ہے اغلے یکساں شرح سے تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ ذرائع آمد و رفت قریب قریب نابود ہیں اور ضروری اشیاکی فراہمی شاذ و نادر۔ آب و ہوا ایسی مسموم ہے کہ کسی کو کوئی زخم یا خراش لگ جائے تو ناسور ہو جاتا ہے اور عموماً زخمی جلد ہی مر جاتا ہے۔

قیدیوں کے لیے قواعد وضوابط

ایک اعتبار سے قیدیوں کو اس نوآبادی میں منتقل کر دینا دوسرے قید خانوں میں بند کرنے سے بہتر تھا۔ خاص طور پر خطرناک قیدیوں کے گروہ کے سوا باقی تہہ خانوں یا کوٹھڑیوں میں بند نہیں کیے جاتے تھے۔ جزیروں میں پہنچ کر قیدیوں کی زنجیریں کاٹ دی جاتیں اور بعض جسمانی مشقتیں جو نوآبادی کے مجریہ قواعد وضوابط کے مطابق عائد کی جاتی تھیں ان کو ختم کرنے کے بعد اُن کو معمولی طور پر زندگی بسر کرنے کی اجازت ہوتی۔ پڑھے لکھے لوگ کسی محرری یا فنی شغل میں لگا دیے جاتے جس کے لیے ان کو معاوضے دیے جاتے۔ اگر ان کو مقدرت ہوتی تو نوکر رکھنے کی اجازت بھی ہوتی۔ بارہ برس قید بھگتنے کے بعد قیدی اپنے پس اندوختہ سرمایہ سے کوئی کاروبار بھی چلا سکتا تھا۔ وہ اپنا گھر رکھ سکتا اور کسی مقامی یا قیدی عورت سے

شادی بھی کر سکتا اور بچوں کی پرورش بھی کر سکتا تھا۔

غیر انسانی رواج کا خاتمہ ایک غیر انسانی حرکت جو جزیروں میں پہلے رائج تھی یہ تھی کہ قیدی کے ماتھے پر "دائم الحبس" کے لفظ داغ دیے جاتے تھے۔ وہابی قیدیوں کے وہاں پہنچنے سے کچھ پہلے یہ رواج ترک ہو چکا تھا اور وہ اس اذیت سے محفوظ رہے۔ پھر بھی ہر قیدی کو ایک نمبر دے دیا جاتا اور نام کی جگہ وہی استعمال کیا جاتا ۱۸۸۲ء میں جب وہابی قیدیوں کی رہائی کا سوال اٹھا تو جزیرے کے سپرنٹنڈنٹ نے قیدیوں کے چال چلن پر ایک مفصل رپورٹ دی۔ اس میں ان قیدیوں کا ان کے نمبروں کے ساتھ ذکر کیا[1] عبدالرحیم کا نمبر ۱۱۵۶۱، محمد جعفر کا نمبر ۱۱۴۵۰، عبدالغفار کا نمبر ۱۱۴۵۱ تھا۔

یورپی قیدیوں کے ساتھ ترجیحی سلوک جزیروں کی زندگی کا ایک نفرت انگیز پہلو جو حکام نے پیدا کر دیا تھا وہ سماجی مذہبی امتیاز تھا جو جدید تفرقہ اندازی کی پالیسی کی ابتدائی شکل تھا۔ یورپی قیدیوں بلکہ ہندوستانی عیسائیوں کے ساتھ ترجیحی برتاؤ کیا جاتا۔ ان کو نہ صرف اوّل درجے کے بنگلے ملتے بلکہ مفت نوکر بھی دیے جاتے۔ جعفر راجہ جگر ناتھ پوری کا ایک افسوسناک قصہ بیان کرتے ہیں جو ۱۸۶۹ء میں اس جزیرے میں بھیجے گئے تھے۔ وہ کالے تھے اس لیے ان کو موچیوں کے ساتھ کام پر لگایا گیا اور نہایت گھٹیا کھانا ملتا، مگر ایک نیچی قوم کے دوغلے عیسائی (اینگلو انڈین) کے ساتھ جو ان کے ساتھ ہی آیا تھا نہایت ترجیحی سلوک کیا جاتا۔ بدنصیب راجہ ان ذلتوں اور جسمانی سزاؤں کی تاب نہ لا سکا اور جلد ہی مر گیا۔

احمد اللہ کی پورٹ بلیر میں آمد جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا وہابی قیدیوں میں احمد اللہ سب سے پہلے پورٹ بلیر پہنچے۔ اور سب سے پہلے جزیرہ کے چیف کمشنر کے رحمدل منشی اکبر زماں ان سے ملے۔ وہ خود ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں بیس سال کی قید کے سزا یافتہ تھے[2] بعد میں ان کا منشی کی حیثیت سے

---

[1] یحییٰ علی اور احمد اللہ اس وقت تک وفات پا چکے تھے اس لیے ان کے نام نہیں لیے گئے۔

[2] اپنی مدت قید تمام کر کے وہ اپنے وطن آگرہ واپس آئے اور ۱۹۰۴ء میں وفات پائی۔

تقرر ہو گیا۔ انھوں نے احمد اللہ کو اپنے ساتھ ٹھہرانے اور اپنے نائب کے طور پر کام لینے کی اجازت حاصل کر لی۔ احمد اللہ پانچ سال ان کے ساتھ رہے یہ ان کے لیے نسبتاً عافیت کی مدت تھی۔
جنوری ۱۸۶۶ء میں جب یحییٰ علی اور عبدالغفار آئے تو احمد اللہ غالباً اکبر زماں ہیڈ منشی سے ان کے آنے کی خبر سن کر ان کے خیر مقدم کے لیے تیار ہو گئے۔ ان دونوں کو بھی اکبر زماں نے اپنی اسسٹنٹی (نیابت) دلوا دی۔ اس طرح ایک مدت کے بعد یعنی ۸ر فروری ۱۸۶۴ء کی منحوس تاریخ کے بعد جب کہ یحییٰ علی کو یک بیک گرفتار کر کے انبالہ بھیج دیا گیا تھا دونوں بھائی ملے اور کچھ دن ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔ عبدالرحیم جو دسمبر ۱۸۶۷ء کو پہنچے گھاٹ منشی بنا دیے گئے۔ اس وقت تک وہابی قیدی جزیرہ راس میں رہتے تھے جہاں زیادہ تر حکام بھی مقیم تھے۔

یحییٰ علی کی وفات

یحییٰ علی پر رفتہ رفتہ پیری اور کمزوری غالب آ رہی تھی، اور طویل شدائد جھیلتے جھیلتے آخر فروری ۱۸۶۸ء میں بیمار پڑ گئے اور جزیرہ کے ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ عبدالرحیم اس وقت محکمہ بحریہ میں محرر تھے اور دور کے جزیرے میں رہتے تھے۔ روزانہ ان کو دیکھنے آیا کرتے۔ یہ ضروری تھا۔ اس لیے ان کے بڑے بھائی احمد اللہ خود ایسے بوڑھے اور کمزور تھے کہ روزانہ ہسپتال جا نہ سکتے تھے۔ جو اونچی سطح پر واقع تھا۔ آخر یحییٰ علی دو ہفتے بیمار رہ کر ۲۰ر فروری ۱۸۶۸ء کو قضا کر گئے اور جزیرہ راس کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔ مختلف جزیروں سے کوئی ڈھائی ہزار مسلمان اور بہت سے ہندو بھی شریک جنازہ ہوئے۔

لارڈ میو کے قتل کا وہابیوں پر الزام

فروری ۱۸۷۲ء میں انڈمان کے دور افتادہ جزیرے میں ایک ایسا زلزلہ خیز واقعہ رونما ہوا جس کا جھٹکا سارے ملک میں محسوس کیا گیا۔ یہ ایک سرحدی پٹھان مسمّی شیر علی کے ہاتھوں لارڈ میو کا قتل تھا۔ اگرچہ اس فعل سے وہابیوں کا کسی طرح کا تعلق نہ تھا ان کو اس میں ملوث کرنے اور حکام جزائر کے انتقام اور غیظ و غضب کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی۔

۶

ایشری پرشاد کی روانگی انڈمان

بنگال صوبائی سروس کے افسر وہابی تحریک کی پوری تاریخ اور حکومت کے لیے تحریک کے خطرات کی کیفیت و کمیت سے خوب واقف تھے اس لیے وہابی قیدی ان کے انتقام اور بہیمیت کا خاص نشانہ بنے۔ لارڈ میو کے قتل کی خبر جیسے ہی کلکتہ پہنچی مخالف وہابی افسروں کے پرانے طبقے نے اس حادثہ میں وہابیوں کو ملوث کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایشری پرشاد جس نے اب تک سرکاری حلقوں میں مسئلہ وہابیات کا ماہر ہونے کی شہرت حاصل کر لی تھی پولیس کمشنر پٹنہ کے ساتھ وہابیوں کی مفروضہ شرکت کا سراغ لگانے کے لیے فوراً جزائر انڈمان روانہ کیا گیا۔ مگر ایک مدراسی صوبائی افسر جنرل اسٹوارٹ نے جو جزیرے کا ذمہ دار حاکم اور وہابیوں کے پس منظر سے ناآشنا اور قیدیوں سے کوئی تعصب نہ رکھتا تھا اس فضول جستجو کی حوصلہ افزائی کو نامنظور کر دیا۔

جنرل اسٹیوارٹ کا غیر جانبدارانہ رویہ

لیکن جنرل اسٹیوارٹ کی غیر جانبدارانہ روش کے باوجود وہابیوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اب تک ان میں سے اکثر بڑے جزیرے میں جہاں زیادہ تر افسر رہتے تھے مختلف ملازمتوں پر مقرر کیے جاتے تھے۔ مگر اب وہ جنگلوں سے بھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے دُور افتادہ جزیروں میں منتقل کر دیے گئے۔ احمد اللہ جزیرہ واپیر میں بھیج دیے گئے جہاں بدترین قسم کے عادی مجرم رکھے جاتے تھے۔ وہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں دس روپے ماہانہ تنخواہ پر محرر مقرر کیے گئے، اور رہنے کو بغیر کرائے کا مکان دیا گیا۔ عبد الرحیم ایک دوسرے دُور افتادہ جزیرے میں منتقل کر دیے گئے جہاں وہ ایک ہسپتال میں محرر مقرر ہوئے۔

احمد اللہ کی حالت زار

احمد اللہ اب زیادہ بوڑھے اور کمزور ہوتے جاتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ یحییٰ علی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے عبد الرحیم روزانہ ان کی خدمت کو آیا کرتے۔ مدتِ قید کے بارہ برس پورے کرنے کے بعد اس قیدیوں کی نوآبادی کے ضابطے کے مطابق ان کو اپنے پس انداختہ سے کوئی کاروبار کرنے کی اجازت مل گئی اور انھوں نے بڑے جزیرے کے قریب ابرڈین میں ایک دوکان کھول لی۔ ان کے بیٹے عبد الفتاح کو جزیرے میں ان سے آملنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ

ایک سال سے کچھ زیادہ باپ کے پاس ٹھہرے رہے، مگر اس جگہ کی آب و ہوا کی ناسازگاری کے سبب سے اُن کو واپس چلے جانا پڑا۔ اسی قسم کی ایک درخواست احمد اللہ نے بھی دی تھی کہ ان کے بیٹے محمد یقین کو جو اُن دنوں کلکتہ میں رہتے تھے ان سے ملنے دیا جائے مگر منظور نہ کی گئی۔

احمد اللہ کی حسرت ناک موت

کاروبار سے عبد الرحیم کی مالی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ احمد اللہ کی صحت تیزی سے گرتی جاتی تھی۔ اس لیے عبد الرحیم نے حکام سے درخواست کی کہ ان کو اپنے چچا کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے مگر یہ منظور نہ ہوئی۔ اس کے بعد بھی بار بار اس سلسلہ میں کوششیں ہوتی رہیں اور سب ناکام ہوئیں۔ عبد الرحیم ان کی خدمت کے لیے بار بار جاتے رہے۔ مگر ان کے پاس ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ دو ہفتے تک وہ روزانہ ان کو دیکھنے جاتے۔ اس ضرورت سے صبح سویرے ان کو گھر سے نکلنا پڑتا، دو میل پیدل گھاٹ پر پہنچتے۔ دو میل سے زیادہ چوڑی اتھلی ندی پار کر کے جزیرہ وائپر کے گھاٹ اور پھر احمد اللہ کے گھر پیدل جاتے۔ ان کی غیر حاضری میں ان کے بیٹے عبد الفتاح دوکان پر بیٹھتے۔ ایک روز ۲۲ نومبر ۱۸۸۱ء کو جب عبد الرحیم حسب معمول جزیرہ وائپر کو چلے جا رہے تھے انہوں نے سنا کہ پچھلی رات احمد اللہ تنہائی اور بے کسی میں انتقال کر گئے۔ عبد الرحیم اس ناگہانی صدمہ سے بدحواس ہو گئے، اُن کی تدفین کے ضروری انتظامات کے لیے گھر لوٹ گئے۔ مرحوم کی طرف سے ایک آخری درخواست ان کے چھوٹے بھائی یحیٰی علی کے پہلو میں دفن کرنے کی اجازت کے لیے دی گئی۔ مگر مقامی حاکموں کو ان کے مرنے پر بھی اتنا رحم نہ آیا کہ ان کے لیے اتنی سی رعایت روا رکھتے۔ جزائر انڈمان کے ویرانوں میں بھی دونوں بھائیوں کو ایک جگہ مدفون ہونا نصیب نہ ہوا۔ احمد اللہ جزیرہ وائپر میں ڈونڈا از پوائنٹ میں سپردِ خاک کیے گئے[1]

---

[1] "مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم" غالب

(مترجم)

(د) وہابیوں کی جائیدادوں کی ضبطی

اگرچہ پٹنہ کے وہابیوں کی جسمانی سزاؤں کا، کچھ بیان کتنا ہی مختصر سہی موجود ہے مگر ان کی گرفتاریوں اور سزاؤں کے بعد ان کے مادی نقصانات کی کوئی اطلاع دستیاب نہیں۔ اس خصوص میں وہابی ذرائع بھی خاموش ہیں۔

وہابیوں کا سماجی رتبہ

وہابی خاندان جو سید احمد کی وفات کے بعد اس تحریک کا مشعل بردار تھا۔ صرف علمی سربلندی کے سبب سے نمایاں نہ تھا بلکہ اعلیٰ سماجی رتبے کے لیے بھی جو اس کے ارکان کو حاصل تھے ممتاز تھا۔ خاندان تین بڑی شاخوں میں منقسم تھا جس کے ارکان ایک دوسرے سے مضبوطی سے وابستہ اور منسلک تھے۔ ان تین شاخوں کی اصل یہ تھے (۱) محمد حسین (۲) الٰہی بخش (۳) فتح علی۔ محمد حسین کے چھ بیٹیاں تھیں جن میں سے چار الٰہی بخش کے بیٹوں سے بیاہی گئیں اس طرح دو شاخیں مل کر ایک ہو گئیں فتح علی، اور الٰہی بخش بھی شادیوں کے بندھن سے باہم وابستہ تھے۔

الٰہی بخش نوابان مرشد آباد کی ریاست میں بہت اعلیٰ خدمات پر مامور تھے اور ان خدمات کے صلے میں ان کو موضع بھوئی (جس کا رقبہ ۴۰۰ بیگھہ اور آمدنی ڈیڑھ ہزار روپے تھی۔ اور بجیئے گوپال پور (جس کا رقبہ ۷۰۰ بیگھہ اور آمدنی چار ہزار روپے تھی) ضلع پٹنہ میں عطا ہوئے۔ یہ احمد اللہ، یحییٰ علی اور دوسرے ورثہ کو پہنچے اور حکومت کی ضبط کردہ جائیدادوں کے حصے تھے۔ احمد اللہ خود بھی اپنے زمانے میں پٹنہ کی نہایت اہم سماجی شخصیتوں میں سے تھے اور متعدد اعزازی اور باتنخواہ عہدوں پر بھی مامور رہے۔

فتح علی، رفیع الدین حسین ولد روح الدین حسین خاں کے داماد تھے۔ آخر الذکر کو شاہ عالم ثانی نے نائب ناظم بہار مقرر کیا تھا۔ عہد دیوانی میں بھی وہ اسی عہدے پر برقرار رہے۔ ۱۷۶۳ء کی شورش کے زمانے میں پٹنہ کے ایک انگریز حاکم ایلس کی جان بچانے کے صلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کو معین الملک امین الدولہ ناصر جنگ کا خطاب بخشا تھا۔ ان کے بیٹے رفیع الدین حسین اپنے باپ کے عہدے اور جاگیروں کے وارث ہوئے۔ اس کا ایک

حصہ ان کے داماد کو بھی کے میں ملا۔ اتنا حصہ بھی یقیناً بیش قیمت ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح علی کے ایک بیٹے عنایت علی نے ۱۸۵۸ء میں ہندوستان سے آخری ہجرت کے وقت اپنا جو حصہ بیچا اس کا زرِ ثمن بیس ہزار روپے سے زائد تھا۔[1]

خاندان صادق پور کی املاک کی ضبطی

ہم ان حقائق سے خاندان صادق پور کی جائداد غیر منقولہ کی کمیت اور قیمت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مقدمہ انبالہ کے فیصلے کے اعلان کے بعد ملزمین پٹنہ کی ایک فہرست حکومت بنگال کو اس ہدایت کے ساتھ روانہ کی گئی کہ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں۔ چنانچہ ایک گوشوارہ تیار کیا گیا۔

لفٹنٹ گورنر نے بھی کمشنر کو از روئے دفعہ ۷ ضابطہ ۱۹ ۱۸۱۰ء رپورٹ کرنے کی ہدایت کی کہ جائیداد غیر منقولہ کا کیا کیا جائے اور کس طرح نمٹا جائے۔ ساتھ ہی اُس نے حکومت ہند کو مشورہ دیا کہ شہر کے اندر اراضی اور مکانات شہر کے مصرف کے لیے میونسپل کمشنر کے سپرد کر دیے جائیں۔" اس مشورے کے جواب میں حکومت ہند نے ہدایت کی کہ صادق پور کی عمارت جہاں سازش چل رہی تھی میونسپلٹی کو دی جائے کہ منہدم کر دی جائیں اور اس جگہ ایک کھلا بازار بسایا جائے اور باغیوں کی ضبط کردہ جائیداد کے زرِ ثمن کا ایک حصہ میونسپلٹی کے لیے وقف کر دیا جائے۔

حکومت ہند کے اس حکم کی تعمیل میں بعد میں ایک قانونی روڑا پڑ گیا۔ دیکھا گیا کہ صادق پور کی عمارات مشترکہ طور پر خاندان کی ملکیت تھیں۔ سب سے زیادہ حصہ تینوں بھائیوں، احمد اللہ یحییٰ علی اور فیاض علی کی ملک تھا۔ چھوٹا حصہ ولایت علی اور ان کے بھائیوں عنایت علی و فرحت حسین کی ملک تھا۔ ولایت علی کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے دو عبداللہ اور عبدالقادر

---

[1] تذکرہ صادقہ ص۱۳۷ (مولوی عبدالرحیم کی اصل تذکرہ صادقہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں، یہ دوسرے ایڈیشن کا الحاق ہے اور اس افسانہ کی حقیقت چوتھے باب میں مترجم نے اپنے نوٹوں میں واضح کر دی ہے اس ذکر و جحت سے ناشر کا صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مولانا عنایت علی نے ہجرت کے وقت اپنا حصہ فروخت کر دیا تھا اور اپنے ورثا کے لیے کوئی جائیداد غیر منقولہ باقی نہ چھوڑی تھی۔ اور یہ معاملہ فروخت صرف انہیں کے متعلق مخصوصاً کیوں لکھا گیا۔ مولانا ولایت علی کے متعلق کیوں نہیں؟ (مترجم)

جو سرحد پر تھے ان کے باغی ہو جانے کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ دوسرے دو بیٹے محمد حسن پٹنہ میں اور ہدایت اللہ باڑھ میں رہتے تھے۔ ان کے حصے ضبط نہیں کیے جا سکے۔ عنایت علی کے صرف ایک بیٹے عبد المجید[1] تھے۔ وہ بھی باغی اعلان کیے جا چکے تھے، اس لیے ان کا حصہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ فرحت حسین کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے عبد الرحیم نے انبالہ میں سزا پائی، دوسرے عبد الرؤف پٹنہ میں رہتے تھے اور ان کا حصہ ضبط نہ کیا جا سکا۔

اس پیچیدگی کے پیش نظر لفٹننٹ گورنر نے سفارش کی کہ بقیہ حصے جو ضبط نہ ہوئے ضابطہ ۱۸۵۸ء کے تحت رفاہ عام کے لیے رکھ لیے جائیں اور ان حصوں کا معاوضہ ضبط شدہ جائداد کے زر ثمن سے ادا کر دیا جائے۔ اور پورا حصہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے۔

خاندان پٹنہ کی املاک کا حشر

آبائی مکانات کے علاوہ خاندان پٹنہ کی جائداد غیر منقولہ پٹنہ اور دوسرے ضلعوں میں بھی تھی۔ یحییٰ علی اور احمد اللہ کی غیر منقولہ جائیداد کی مجموعی سالانہ آمدنی ۱۷۹۷ روپے سات آنے۔ ایا ئی تھی عبد الرحیم کی جائیداد کی کل سالانہ آمدنی ۱۳۹۵ روپے ۷ آنے ایک پائی تھی۔ یہ ساری قیمتی جائیداد یں ایک جنبش قلم سے ضبط کر لی گئیں اور گاجر مولی کی طرح بیچ دی گئیں (گھروں کی ضبطی کے نتیجے میں) عورتیں بچے لغوی معنی میں گلیوں کوچوں میں ڈال دیے گئے۔ اور کوڑی کوڑی کے محتاج بنا دیے گئے۔

مکینوں کو صرف اپنے تنوں پر کپڑے پہنے ہوئے خانہ بدر ہونا پڑا۔ ان کو اپنے ساتھ ایک سوئی بھی لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ایک ایک چیز جو گھروں میں تھی اور پہلے سے تیار کیے

---

[1] حافظ عبد المجید کی صحیح تاریخ وفات کہیں نہیں ملتی۔ مولانا عبد الرحیم نے اصلی تذکرہ صادقہ طبع اول ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰۹ میں لکھا ہے کہ جب منجھلے حضرت مولانا عنایت علی کا انتقال سوات میں ۱۸۵۸ء میں ہوا تو آپ کی زوجۂ ثانیہ و حافظ عبد المجید کا بھی انتقال تھوڑے ہی عرصہ میں وہیں ہوا؛ بقول غلام رسول مہر وہ مولانا عنایت علی کے مرض موت کے زمانے میں ہی سخت علیل تھے۔ بہر حال ان کا انتقال بھی ۱۸۵۸ء کے لگ بھگ یعنی ۱۸۶۰ء کے قریب ہو چکا تھا۔ اور مقدمات ۱۸۶۳ء سے شروع ہوئے۔ اس نے حافظ عبد المجید کے باغی اعلان کیے جانے اور ان کی جائیداد کی ضبطی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے مولف کا یہ قول محل نظر ہی نہیں بلکہ غرض مندپارٹی سے مسموع وغیر مستند ہے مقصد ظاہر کیا جا چکا ہے! مترجم

ہوئے گوشوارے میں درج کر لی گئی تھی حوالہ کر دینا پڑی ان میں سے اگر کوئی چیز غائب پائی گئی تو اس کی قیمت تخمینی قیمت سے دس گنا زیادہ ادا کرنا پڑتی"[1]

احمد اللہ کے خاندان کی تباہی

احمد اللہ کے بڑے بیٹے عبدالحمید جن کو خاندان کے سب سے معمر رکن کی حیثیت سے حکم اخراج کا بارِ گراں اٹھانا پڑا ان معصوم عورتوں اور بچوں کی خاموش فریاد کا اپنی فارسی مثنوی میں جامع و مانع طرز میں نقشہ کھینچتے" اور خاندان کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"احمد اللہ بود مجرم شاہ　　　طفلکِ بے گناہ را چہ گناہ"

گردش تقدیر سے خاندان کے ان بدنصیب مکینوں کے سروں پر یہ آفت ٹھیک عید کے خوشی کے تہوار کے دن پڑی۔ احمد اللہ نے بجا طور پر یوں فریاد کی ہے۔

"چوں شبِ عید را سحر کردند　　　ہمہ را از مکاں بدر کردند

مایۂ عیش ساز ماتم شد　　　عیدِ ما غُرّۂ محرم شد"

(جب عید کی صبح ہوئی، سب گھر سے نکال دیے گئے عید کا نغمہ عیش ساز ماتم بن گیا۔ ہماری عید محرم کی پہلی تاریخ ہو گئی)

لفٹنٹ گورنر نے مشورہ دیا کہ مناسب ہے کہ جائیدادوں کا زرِ ثمن عام مالگزاریوں میں جذب کر لیا جائے۔ اور زیادہ موزوں یہ ہو گا کہ یہ روپے مقامی مزدوروں پر صرف کیے جائیں

---

[1] قائدین صادق پور ہجرت کے وقت یا پہلے ہی اپنی غیر منقولہ جائیدادیں عورتوں کے نام منتقل کر گئے تھے۔ وہ سب بچ گئیں۔ حکومت نے ان پر قبضہ نہیں کیا۔ اور آخر تک جو ارکان مقدمات میں ملوث نہ تھے وہ اور ان کے ورثہ ان جائیدادوں پر قابض و مستفید رہے۔ جہاں کتابوں اور سرکاری کاغذات میں جائیداد غیر منقولہ کی فروخت کا کثرت سے ذکر ہے وہاں املاک منقولہ کی فروخت کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مستورات بے خانماں ہو کر گلیوں میں تو ماری ماری نہ پھریں۔ بلکہ چند دن ان قرابت مندوں کے گھروں میں پناہ گزیں ہو گئیں جو الزام بغاوت سے بری تھے مگر وہ کبھی ایسی قلاش و بے مایہ نہ ہوئیں کہ مالی امداد کی محتاج ہوتیں۔ سر چھپانے کے لیے مکان پا جائے امن حاصل ہوتے ہی مطمئن ہو گئیں اور کئی پشت تک مرد بھی تنگ دست نہ ہوئے۔ وہ عورتوں کے نام غیر منقولہ جائیدادوں سے عزت آبرو سے بسر کرتے رہے۔ ان کی مالیت لاکھوں روپے تھی۔ (مترجم)

نقل از نقشہ مندرجہ پبلیکیشنز
نقشہ سطحی مکان مملوکہ مولوی احمد اللہ و قافلہ ملحقہ آں در محلہ صادق پور، پٹنہ سٹی
جنوب
پھاٹک
کشادہ صحن
برآمدہ
کمرہ
عبادت خانہ
کتابیں
صحن
کمرہ عبدالرحمٰن
کمرہ
صحن
مغرب
ف حسین
قبر
صحن
قبر
قبر
دروازہ
کشادہ صحن
دروازہ
زنانہ
زنانہ م حسین
دوکان
دوکان
دوکان
سڑک
دروازہ
کمرہ
کمرہ
صدر دروازہ
شمال
سکری گلی
صدر پھاٹک
مشرق
مکان رحمت اللہ
کشادہ صحن
مردانہ وغیرہ
کشادہ صحن
زنانہ احمد اللہ
زنانہ یار علی
زنانہ عبدالاحد
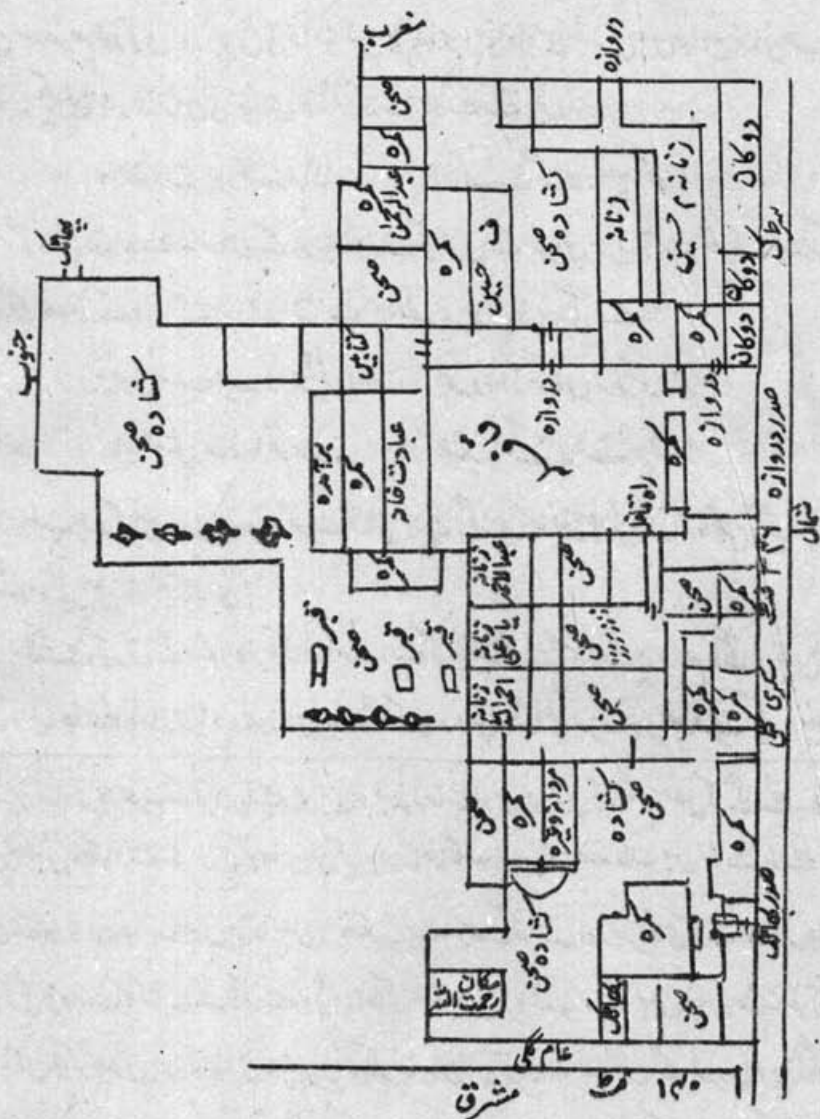
حکومت ہند نے لفٹننٹ گورنر کے تمام مشورے قبول کر لیے۔ غیر منقولہ جائدادوں کے زرِ ثمن کے
مصرف کے بارے میں کہا گیا کہ جب حکومت ہند اس رائے سے متفق نہیں کہ یہ سارا زرِ ثمن عام
عام مالگزاریوں میں مخلوط کر دیا جائے اس خاص صورت میں اسے لفٹننٹ گورنر کی تجویز میں کوئی
عذر نہیں۔ چنانچہ یہ حکم نافذ کر دیا گیا۔

وہابی فنڈ کا مصرف

وہابیوں کی جائیداد غیر منقولہ کی فروخت سے حکومت نے جو خطیر رقمیں فراہم کیں اور جسے وہابی فنڈ کہا گیا اس کی بعد کی تاریخ بھی
بہت دلچسپ ہے [1]

فروخت سے جو مجموعی رقم حاصل ہوئی اس کی تعداد ۱۲۱۹۴۸ روپے ۴ آنے ایک پائی تھی۔
اس میں سے احمد اللہ کے حصے کی رقم ۴۲۱۱۹ روپے ۱۰ آنے ۳ پائی تھی۔ یہ رقم حکومت نے اپنے
خزانے میں جمع کر لی کیونکہ ان کی بیوی نے ایک مقدمہ دائر کر کے دعوے کیا تھا کہ یہ جائیدادیں
ان کو حق مہر میں ملی تھیں۔ باقی ۷۹۸۲۸ روپے ۹ آنے دس پائی میں سے ۳۳۴۰۷ روپے ۷ آنے
۶ پائی ۱۸۶۹ء کو پٹنہ میونسپلٹی کو اس جگہ پر جہاں وہابیوں کے آبائی مکانات بنے ہوئے تھے۔
ایک میونسپل مارکیٹ (بازار) کی تعمیر کے لیے بطور عطیہ امداد دے گئے۔ یہ فعل میونسپل کمشنری کی
اس تجویز کے جواب میں عمل میں لایا گیا کہ ایک مربع رقبہ کے تین طرف یک منزلہ پختہ دوکانیں تعمیر
کی جائیں اور چوتھی طرف شمال کی جانب کا حصہ سڑک کے مقابل راستے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے
تخمینہ کیا گیا کہ ان دوکانوں سے تین ہزار روپیہ سالانہ کرایہ وصول ہوگا۔ مزید تین ہزار کی رقم
پٹنہ سٹی ریلوے اسٹیشن سے پٹنہ گھاٹ اسٹیشن تک ایک سڑک کی تعمیر پر صرف کی گئی۔
مزید تیس ہزار روپے پٹنہ کالج کی عمارتوں کی توسیع و تجدید کے کچھ کاموں پہ صرف ہوئے۔
ان میں پرانے قطعہ کے مشرقی بازو پہ ایک لیکچر روم، ایک دار التجربہ، بڑا زینہ، میوزیم (عجائب خانہ)
کی تعمیر اور سڑک پہ ڈامر بچھانا شامل تھا۔ ان کاموں پہ مجموعی خرچ کا تخمینہ ۱۲۷۰۱۷ تھا جس پر

[1] یہ تفصیلات خفیہ کاغذات کے ایک پلندے سے لی گئی ہیں جو پٹنہ کمشنری کے دفتر میں علیحدہ محفوظ ہیں۔
یہ رسمی سرکاری چٹھیاں نہیں بلکہ دفتر کے نوٹ اور مسودات ہیں جن پر پنسل کے مختصر دستخط ہیں۔
بہرحال ان کاغذات کے غائر مطالعے اور جائزے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ کون سا مسودہ
کس کی طرف سے اور کس کے نام ہے۔

سے متذکرہ بالا رقم وہابی فنڈ سے اور باقی اخراجات کالج فنڈ اور دوسرے ذرائع سے پورے کیے گئے۔

مقامی افسروں نے صادق پور میں وہابی تعمیرات کو منہدم کرنے کے لیے حکومت کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے خاندان کے مقبرے کو بھی نہیں بخشا، قبروں کو توڑ کر زمین کے برابر کر دیا اور ان کو کھود ڈالا۔ عبدالرحیم بھی جنھوں نے اپنی تالیف (تذکرہ صادقہ) میں نہایت احتیاط سے وہابیوں کے ساتھ حکومت کی معاندانہ حرکات پر متشددانہ تبصرے سے بہت احتراز کیا ہے۔ اس غنڈے پن کی حرکت کے خلاف اپنے دلی رنج اور فریاد پر قابو نہ رکھ سکے۔ اپنے آباؤ اجداد کی اکھاڑی ہوئی اور بے نشان قبروں کو دیکھ کر اپنے تاثر کا یوں اظہار کرتے ہیں...............

...............” اپنے مردوں کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر اُس صدمے کے احساس کو الفاظ میں ظاہر کرنا دشوار ہے۔ آج تک اُسے یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہمارے اسلاف کی قبریں کیوں کھود ڈالی گئیں؟ عـــہ وہ مقبرہ کیوں ضبط کر لیا گیا؟ اور ہماری عادل حکومت نے اس طرح کی حرکت کیوں کی؟“

خاندانِ صادق پور کی نشاۃ ثانیہ

خاندان کے سرمایہ کے شکستہ اور منتشر اجزا پھر آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ اکٹھے کیے گئے۔ خاندان کے کچھ ارکان بالخصوص عبداللہ ایک چھوٹا سا ہیولیٰ کھڑا کرنے کے لیے جو اب بھی وہاں موجود ہے سرحد پر ہی اقامت پذیر رہے۔ باقی دوسرے ارکان نے دوبارہ گھٹنوں پر اُٹھ کھڑے ہو جانے کی صلاحیت اور قوت ارادی کا ثبوت دے کر اپنی ایک نئی راہ نکال لی اور ایک جدا معاشرت اختیار کی۔ وہ سرحد سے لوٹ آئے، اپنے نام بدل لیے، انگریزی تعلیم حاصل کی اور اس نے میدان عمل میں بھی نمایاں تفضیلت حاصل کی۔ احمد اللہ کے بیٹے اشرف علی علی گڈھ کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہوئے اور مختلف ریاستوں (بہاولپور، جوناگڈھ وغیرہ) میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ یحییٰ علی کے بیٹے امجد علی نے بھی اعلیٰ تعلیمی امتیاز حاصل کیا اور شمس العلماء کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے[1] ایم اے کیا اور علی گڈھ کالج میں

---

[1] اس وقت بنارس میں نہ ہندو یونیورسٹی تھی نہ ایم اے کا امتحان جو صرف کلکتہ یونیورسٹی میں ہوتا تھا۔ مولانا اشرف علی و مولانا امجد علی نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا (مترجم)

عـــہ مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیرؔ باقی — انھیں میرے مرنے ہی کا نہیں اعتبار ہوتا (مترجم)

فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ احمد اللہ کے بڑے بیٹے عبدالحمید نے علم کے دوسرے میدان (طب) میں بے نظیر عزت و شہرت حاصل کی۔ وہ اپنے زمانہ کے ایک مشہور ترین طبیب تھے اور کثیر دولت کمائی۔ ولایت علی کے چھوٹے بیٹے محمد حسن پٹنہ کے قدیم ترین اردو[1] اخباروں میں سے ایک اخبار پٹنہ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور مقامی ایم اے او اسکول (محمڈن اینگلو عربک اسکول) کے بانی تھے، اور کلکتہ میں ایک کامیاب کاروبار قائم کیا۔ ان سربرآوردہ ارکان کی مشترکہ جدوجہد سے خاندان کی قسمت نے پھر پلٹا کھایا۔ خاندان کے سب سے کبیر السن رکن جو ابھی بقید حیات ہیں، حکیم عبدالخبیر کا خاندانی مکان میونسپل عمارت کے (جو قدیم عمارت کے مقام پر بنی ہے) عین مقابل واقع ہے اس کے پہلو میں ولایت علی کے پرپوتے سکونت پذیر ہیں۔ عبدالحمید اپنے مکان کی ضبطی کے بعد ایک میل مشرق محلہ خواجہ کلاں میں جا بسے، وہاں مطب قائم کیا اور ایک مکان بھی خریدا جس کی ان کے نواسے ڈاکٹر عظیم الدین احمد[2] نے تجدید و توسیع کی۔ ان کے بیٹے اب بھی وہیں سکونت پذیر ہیں۔

(۸) وہابی قیدیوں کی رہائی

وہابی قیدیوں کی رہائی اگرچہ ترتیب زمانی میں بہت بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے اسے ۶۵-۱۸۶۳ء کے سرکاری مقدمات کے بیان کی تکمیل کے لیے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ رہائی ۱۸۸۳ء میں عمل میں آئی۔ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۸۰ء کی درمیانی مدت میں، حکومت وہابی تحریک کو کچلنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی اس سے بھی اس فیصلے کو تقویت پہنچی اور ان کی رہائی کے مسئلے پر زیادہ نرم اور اعتدال کی نظر ڈال سکی۔

۱۸۸۳ء تک وہابی تحریک بالکل کچلی جا چکی تھی۔ اب حکومت ہند کے لیے یہ سیاسی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

---

[1] صرف اردو نہیں انگریزی بھی۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نمونے پر اردو اور اس کے انگریزی ترجمے کے دو کالم پہلو بہ پہلو ہوتے تھے (مترجم)

[2] وہ پٹنہ کالج میں عربی کے پروفیسر اور صدر شعبہ عربی تھے ۱۹۴۹ء میں وفات پائی۔

اس صورتِ حال میں ۱۸۸۲ء میں عبدالرحیم کی بیوی نے گورنر جنرل کو ایک عرضداشت روانہ کی جس میں انھوں نے گزارش کی کہ انبالہ کے سیشن جج نے عبدالرحیم کے متعلق کہا تھا کہ ۱۵ برس کے بعد ان کی میعاد سزا پر نظرثانی کی جا سکتی ہے بشرطیکہ قید میں ان کا چال چلن تشفی بخش رہا ہو۔ انھوں نے استدعا کی کہ اب پندرہ کے عوض اٹھارہ سال گزر گئے۔ حکومت ہند نے یہ معاملہ حکومت پنجاب کو اس کی رائے کے لیے بھیج دیا۔ اس نے سفارش کی کہ ان کی سزا پر مدت دراز گزر چکی اور بدلے ہوئے حالات کی بنا پر صرف عبدالرحیم ہی نہیں بلکہ دوسرے سزا یافتگان بھی جن کو بعد میں سزائیں دی گئی تھیں رہا کیے جائیں۔ تب حکومت ہند نے حکومت بنگال کو اس سفارش سے مطلع کر کے اس کی رائے طلب کی۔ مگر اس نے رہائی کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اس نے ہیلیڈے کمشنر پٹنہ کی رائے کا حوالہ دیا جس سے مشورہ کیا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ احمد اللہ کے تین بیٹے شہر میں موجود ہیں۔ اور اگر عبدالرحیم اور عبدالغفار واپس لائے گئے تو موقع ملنے پر فساد کھڑا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

تب نوآبادی سزا یافتگان انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ سے قیدیوں کے چال چلن پر رپورٹ دینے کو کہا گیا۔ اس میں بھی حکومت کو قیدیوں کے خلاف کوئی اطلاع نہ ملی۔ جزیرے میں تمام وہابی قیدیوں کا چال چلن نہایت محتاط، متدین اور بے داغ رہا تھا۔ احمد اللہ، یحییٰ علی[1] اور دیگر اسیر اپنے معمولی دفتری فرائض ختم کر کے اپنا وقت عبادت اور وعظ پر صرف کرتے تھے۔

نوآبادی انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ کی مرسلہ رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ اٹھارہ سال کی مدت میں قیدیوں کا چال چلن غیر معمولی طور پر عمدہ رہا۔ اس تمام مدت میں عبدالرحیم سے کوئی مقامی تقصیر بھی سرزد نہ ہوئی۔ عبدالغفار پر صرف ایک بار یکم فروری ۱۸۸۱ء کو غیر حاضری کے لیے جرمانہ ہوا۔ جعفر کو کسی ضمنی ضابطہ کی خلاف ورزی کے لیے ایک بار اسم نویسی اور تنبیہ کی گئی تھی۔ پھر بھی جعفر کا چال چلن مجموعی طور پر اچھا تھا اور وہ نمایاں طور پر لائق اور ذہین آدمی ہے۔

---

[1] مگر اس تحقیقات کے وقت نہ مولانا احمد اللہ زندہ تھے نہ مولانا یحییٰ علی۔

وہابیوں کی رہائی اور پابندیاں

ان تمام تحقیقات کے ختم ہونے کے بعد حکومت ہند نے دسمبر ۱۸۸۲ء میں فیصلہ کیا کہ تمام وہابی قیدی جو اب تک سزائے قید بھگت رہے ہیں رہا کر دیے جائیں انہیں اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے اس شرط کے ساتھ کہ پولیس کے زیر نگرانی رہیں اور رہنے سہنے میں مقامی حکومت کے عائد کردہ احکام کے پابند رہیں۔

۵ر فروری ۱۸۸۳ء کو چھیوں قیدی رہا کر دیے گئے۔ ان میں سے عبدالرحیم، عبدالغفار پٹنہ کے تھے اور یہیں رہنے کی اجازت چاہی۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ان کو اس شہر میں واپس آنے دینے کی درخواست کی مخالفت کی۔ اُس نے یہ عذر پیش کیا کہ "اگرچہ وہابی قضیہ دب گیا ہے۔ اس فرقے کا مذہبی جوش اب بھی موجود ہے اس لیے بے شبہ رہا کردہ وہابی باعث ہمدردیت عام بن جائیں گے۔ اور ان کے فرضی جرائم کا چرچا اور ان کی سزایابی اور حبس دوام جذبات کو ابھار دیں گے۔ لیکن اس نے مزید لکھا کہ اگر حکومت ان کی رہائی کے ہی حق میں ہے تو بہتر یہ ہو گا کہ ان سے پٹنہ کے عوض بھاگل پور میں سکونت اختیار کرنے کو کہا جائے۔ پٹنہ جیسے کثیر آبادی کے شہر میں پولیس کی نگرانی مشکل سے قابل عمل ہو گی۔ داناپور اور پھلواری کے متصل شہر بھی وہابیوں سے بھرے پڑے ہیں اور وہاں کی آمد و رفت کے روابط کا روکنا بھی مشکل ہو گا۔"

مگر حکومت نے اس خیال سے اتفاق نہ کیا اور پٹنہ کے وہابیوں کو اس شرط کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹنے کی اجازت دے دی گئی کہ اپنے نقل و حرکت کی باقاعدہ رپورٹ پولیس کو دیتے رہیں۔

عبدالرحیم کی مراجعت پٹنہ

چھ رہا شدہ وہابیوں میں سے عبدالرحیم اور چار اور قیدی[1] اوائل مارچ ۱۸۸۳ء میں پورٹ بلیر سے روانہ ہوئے اور دوسرے مہینے میں پٹنہ پہنچے۔ اُن سے کہا گیا کہ اقرار ناموں پر دستخط کر کے اقرار کریں کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ذاتی طور پر مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہاں حاضری دیں اور پہلے سے اجازت لیے

---

[1] یہ عبدالرحیم، تبارک علی، جعفر اور عبدالغفار تھے۔

بغیر کہیں باہر نہ جائیں۔ سات سال تک یہ حکم سختی سے نافذ رہا۔ اس کے بعد جزوًا ڈھیلا کر دیا گیا۔

باقی دو قیدیوں میں سے مسعود نے پہلے اپنے معاملات کے ختم کرنے کے لیے چھ ماہ اور ٹھہرنے کی اجازت چاہی اور دے دی گئی۔ بعد میں اس نے اس حکم میں ترمیم کرا لی اور ۸ر اپریل ۱۸۸۳ء کو ایس ایس مہارانی جہاز سے رخصت ہو گیا۔

جعفر تھانیسری کی رہائی

جعفر کی رہائی کچھ دنوں کے لیے ملتوی رہی اس لیے کہ ان کی دوام حبس کی سزا یافتہ بیوی نہ رہا ہوئی تھی۔ آخر مئی ۱۸۸۳ء میں جعفر کی عرضداشت کے جواب میں وہ بھی رہا کر دی گئی اور وہ گھر جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ جعفر نے اپنی رخصت کے وقت چاہا کہ اپنے گھر کو مسجد میں تبدیل کر دیں اور مقامی مسلمانوں کے لیے وقف کر دیں۔ مگر ڈپٹی کمشنر بریچ نے اس کی اجازت نہ دی تاکہ کہیں مزید وہابی سازشوں کا مرکز نہ بن جائے۔ آخر جعفر نومبر میں روانہ ہوئے اور سال کے آخر میں اپنے وطن پہنچ گئے۔

باب ۹

تحریک کا آخری منظر

وہابی جدوجہد ہندوستان میں ۱۸۶۸-۸۲ء

احمد اللہ کا مقدمہ وہابی تحریک کی تاریخ میں ایک ستون منزل تھا۔ ان کی گرفتاری اور سزا نے ہندوستان میں وہابی تنظیم کو کمزور ضرور کر دیا مگر جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے یہ اس کے خاتمے کی نشان دہی نہیں کرتی بلکہ انجام کا آغاز تھی۔ وہابیوں کے کام کے جاری رہنے کا ثبوت ۱۸۶۵ء کے مقدمات کے بعد کئی اور مقدمات کے چلانے سے ملتا ہے۔ جو تفتیش ان مقدمات پر منتج ہوئیں وہ بہت ہمہ گیر تھیں اور عملاً قریب قریب سارے ملک پر چھا گئیں۔ پولیس کے حکام کے علاوہ بالخصوص ریلی ڈی آئی جی پولیس محکمہ خاص اعلیٰ افسر تحقیقات تھا۔ انہوں نے پیچیدہ تحقیقات میں اور پشاور، ڈھاکہ، اور راولپنڈی، پونا جیسی بعید المسافت جگہوں میں اُلجھے ہوئے سلسلوں کا کھوج لگانے اور مربوط کرنے میں نمایاں مستعدی اور قابلیت دکھائی۔ اس وقت کے ریلی اور اُس کے نائبین نوبوکسٹو گھوش اور الشری پرشاد کے روزنامچے اور ان کی تحقیقات کی رپورٹیں جو اس زمانے میں معلومات کے اصل ذرائع ہیں سرسری نظر میں بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایک دن یہ مورخہ ایبٹ آباد ہے، دوسرے ہفتے میں مورخہ مالدہ یا راج محل ہے۔ ذیل کے بیان میں مختلف وہابی مرکزوں کی تحقیقات کا ذکر ان کے سیاق و سباق اور ترتیب زمانی کے لحاظ سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس موضوع کا مطالعہ دو نمایاں عنوانات کے تحت کیا گیا ہے۔

(۱) برطانوی ہند کے اندر تحریک کی کارکردگی اور مقدمات (۲) وہابیوں کی سرحدی ریاست میں اس کا آخری منظر۔

احمد اللہ کی گرفتاری پر وہابیوں میں بے چینی

احمد اللہ کی یک بیک گرفتاری اور پھر جزیرہ انڈمان میں قید عمر نے وہابیوں کو حواس باختہ اور کچھ مدت کے لیے تنظیم کو مفلوج ضرور کر دیا۔ تاہم حاجی پور ضلع مظفر پور کے حاجی مبارک علی نے کام پھر شروع کر دیا۔ وہ ولایت علی کے قدیم رفقا میں سے تھے۔ اُن سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے کے بعد مبارک علی پٹنہ سٹی چلے آئے اور ولایت علی کے مکان کے برابر ایک گھر میں رہ پڑے۔ احمد اللہ نے اپنی گرفتاری کے وقت تنظیم کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ کچھ عرصہ تک وہ احمد اللہ کی مدافعت اور مقدمہ سے متعلق دوسرے امور میں مصروف رہے۔ مقدمہ کے اختتام کے بعد تنظیم کی طرف توجہ کی۔

بہار اور بنگال میں بعض مرکز اب بھی کام کر رہے تھے۔ مرکز مالدہ اور اس کے قائد رفیق منڈل کا ذکر ہو چکا ہے۔ ۱۸۶۵ء میں ان کے بیٹے امیر الدین کی کارروائیوں کی کچھ اطلاع حکام کو مل چکی تھی لیکن اس وقت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی، غالباً اس لیے کہ حکام اس وقت احمد اللہ کے معاملہ میں زیادہ اُلجھے ہوئے تھے۔

۱۸۶۸ء کے اواخر میں حکومت کی توجہ اُن مراکز خصوصاً راج محل[1] اور مالدہ کی جاری کارروائیوں کی طرف مبذول کی گئی۔ ریلی ڈی آئی جی پولیس نے اپنی دو مسلسل چٹھیوں میں ان دونوں مقامات پر وہابی کارروائیوں کی بنا اور طریق کار پر ایک سیر حاصل رپورٹ دی۔

راج محل کے ابراہیم منڈل

اس علاقے میں وہابیوں کی کارروائیوں پر راج شاہی اور بھاگل پور کے کمشنروں نے پہلی رپورٹ دی۔ دلموٹ اسسٹنٹ کمشنر راج محل نے ریلی کو ہدایت کی کہ نو بو گھوش ٹو اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پولیس کو موضع مالدہ میں جو اصل مرکز معلوم ہوتا ہے تعینات کر دیا جائے۔ چنانچہ گھوش وہاں چلا گیا اور ایک

---

[1] راج محل پہلے ضلع مالدہ تھا، بعد میں وہ ضلع مرشد آباد میں داخل کر دیا گیا۔ فی الحال وہ بہار کے ضلع سنتھال پرگنہ کا ایک سب ڈویژن ہے ضلع مالدہ اگرچہ بنگال میں ہے مگر راج محل علاقہ کے مقابل گنگا کے پار واقع ہے۔ دونوں مرکز باہم مل جل کر کام کر رہے تھے۔

ہفتہ تک تاجر پارچہ جات ریشمی کے بھیس میں قیام کر کے بہت سی اطلاعات اور شہادتیں جمع کیں جن سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ کلیاچک سے متصل کئی گاؤں میں اسی مقصد سے کھلم کھلا چندے جمع کیے جاتے تھے تاکہ اسلامی حکومت قائم کی جائے اور انگریز کفار کو ملک سے نکال باہر کیا جائے اس نے یہ پتا بھی لگایا کہ ایک شخص نظیر سردار اس علاقے میں چندوں کی تحصیل کے خاص کارکنوں میں تھا۔ کچھ دنوں کے بعد گھوش نے دیکھا کہ اس کی شخصیت کا راز کھل گیا، اور اب اس کے ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو وہ مجسٹریٹ مالدہ کے پاس گیا اور آٹھ آدمیوں[1] کے خلاف جن پر وہابیوں کے لیے چندے کی تحصیل کے کام میں مصروفیت کا شبہ تھا گرفتاری کے وارنٹوں کی درخواست کی۔

شہادتوں سے ظاہر ہوا کہ نظیر سردار ساکن قاضی گرام مقامی سردار ہے اکئی سال سے تحریک میں) عملی اور نمایاں حصہ لیتا رہا ہے اور یہ کہ اس نے ضلع کے بہت سے آدمیوں کو سرحد جانے کی ترغیب دی ہے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے چندوں کی تحصیل مختلف شکلوں میں ہوتی تھی۔ جو چندہ نہ دیتے ان کا سماجی بائیکاٹ (مقاطعہ) کیا جاتا۔

ابراہیم منڈل کی گرفتاری

شہادتوں سے ایک شخص ابراہیم منڈل کو بھی مرکز کے سردار کی حیثیت سے جن کے پاس نظیر سردار ساری محصلہ رقوم بھیج دیا کرتا تھا۔ ابراہیم منڈل باکر میں ڈپٹی مجسٹریٹ کی عدالت کے قریب موضع اسلام پور میں رہتے تھے۔ جو ریلوے لائن سے کچھ دور نہ تھا۔ مجسٹریٹ مالدہ سے درخواست کی گئی ۔ کہ ابراہیم کے خلاف وارنٹ جاری کر دیے۔ ریلی احتیاطاً خود براہ راست راج محل نہیں گیا تاکہ کہیں اس کی آہٹ پا کر ابراہیم نکل نہ بھاگے۔ اس نے گھوش کو سڑک سے اسلام پور بھیج دیا۔ گھوش

---

[1] یہ تھے نظیر سردار ساکن موضع قاضی گرام، عبدالواحد ساکن موضع لکھی پور، گھورن خان ساکن موضع معظم پور، جمورن شیخ ساکن موضع لاکھو پور، بنو عارسی ساکن معظم پور، سورکن ملا ساکن موضع معظم پور اور دھوکا ملا ساکن موضع آغا ملکی۔

ایک مسلمان معلم کے بھیس میں ٹیوشن (معلمی) کی تلاش کے بہانے سے وہاں جا ٹھہرا۔ اتفاق سے اُس کی مڈبھیڑ ابراہیم کے ایک بھتیجے سے ہو گئی جو سیدھا اسے اپنے چچا کے گھر لے گیا جو مطلوبہ شکار تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ میرے چچا کسی معلم کی اعانت کے لیے گاؤں بھر میں سب سے موزوں آدمی ہیں۔ الغرض ابراہیم دو کانسٹیبلوں کی مدد سے جو گھوش کے پیچھے پیچھے آئے تھے گرفتار کر لیے گئے۔ اسسٹنٹ کمشنر والوٹ اور اس کا نائب بیمز بھی اُس جگہ پہنچ گئے۔ وہ ابراہیم کی گرفتاری میں گھوش کی مدد کے لیے راج محل سے ہاتھی پر آئے تھے۔

وہابی تحریک کے متعلق شہادتیں

جو شہادتیں لی گئی تھیں ان کی روشنی میں ریلی نے رپورٹ دی کہ دوسرے ضلعوں میں بھی مسلمانوں میں اسی طرح کی تحصیل و تبلیغ عام ہے اور جب تک اس مجنونانہ تحریک کو بند کرنے کے لیے عملی اقدام نہ کیے جائیں اس کے اور پھیلنے کا امکان ہے۔" اس نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ" اس تحریک میں کوئی با اثر زمیندار یا کاشتکار شامل نہیں۔" زمین نہ رکھنے والے کاشت کاروں کو زیادہ تر یہ امید دلا کر راغب کیا گیا کہ کامیابی کے بعد ان کی زمین پر سے لگان اُٹھا لیا جائے گا۔ اس لیے قدرتاً زمینداروں سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اس تحریک میں ساتھ دیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ بہار اور بنگال میں ہمیشہ اس تحریک پر سرگرمی سے لبیک کہنے والے زیادہ تر یہی بے زمین کاشت کار تھے۔ باراسیٹ کی شورش میں بھی یہی لوگ پیش پیش تھے۔ اگرچہ تحریک کی زیر سطح اعتقادی لہریں خصوصاً بنگال میں اس کے سیاسی دھارے میں دب کر رہ گئیں (اور اسی لیے ہنٹر او کینیلی جیسے مصنفین نے اس کی دم میں مذہبی لیبل (چٹ) باندھ دیا) بہر حال وہ معنی خیز اور لائق توجہ ہیں۔

گرے کی تحقیقات

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک نیل کا کاشت کار گرے ان تحقیقات میں نمایاں طور پر او کینیلی کا شریک اور اس کا بڑا مددگار تھا۔ باراسیٹ کے بلوے سے بھی نیل کے کاشت کاروں کی غرض بہت کچھ متعلق تھی اور پہلا جوابی حملہ انھیں نے کیا تھا۔ وہ وہابیوں کے اس علاقے کے کاشت کاروں میں کام کرنے اور اپنے مفاد پر اس کے ممکن ردعمل سے اب تک متشوش تھے۔

وہابی تحریک کے متعلق رسائل

روپیہ تحصیل کرنے کے متعلق شہادت کے علاوہ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ باغیانہ رسالے بھی تقسیم کیے جا رہے تھے۔ مالدہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ کی کہ پولیس نے جو رسائل پکڑے ہیں ان میں سے دو کا اس نے مطالعہ کیا۔ ایک تھا تفسیر مرادیہ جو ۱۲۸۰ھ میں مصری گنج میں طبع ہوا۔ یہ ایک بہت کثیر الاستعمال پارۂ عم کی تفسیر تھا۔ دوسرا رسالہ مشرقی بنگال میں پٹنہ کے سازشیوں کے ایک نہایت سرگرم حامی ڈھاکا کے حاجی بدرالدین کے مختلف مذہبی مسائل پر فتاویٰ کا مجموعہ تھا۔ یہ جاہل بنگالیوں کی ترغیب کے لیے "بڑی خوبی سے بنگلہ میں نظم کیا گیا تھا۔"

مقدمہ قائم کرنے میں حکومت کی بے بسی

آخر میں ریلی نے اپنی رپورٹ میں یہ ارادہ ظاہر کیا کہ گرفتار شدہ لوگوں کو تعزیرات ہند کی دفعات ۱۰۸ اور ۱۲۲ کے تحت ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ کرنے کی کوشش میں اعانت کا مجرم قرار دے۔ اس نے اقرار کیا کہ اگرچہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ فراہم کردہ روپے ابراہیم منڈل کی تحویل سے آگے گزرے لیکن اس مقصد کے لیے گرفتار شدہ آدمیوں کا طرزِ عمل قلم بند شہادتوں سے ثابت ہے۔

صوبائی حکومت نے اس معاملے کو گرفتار شدہ آدمیوں کے خلاف الزامات قائم کرنے کے لیے مشورے کے لیے قانونی مشیر کے حوالہ کر دیا۔ اس نے جواب دیا کہ اگرچہ یہ واضح ہے کہ کئی اضلاع میں باغیانہ نفرت پھیلانے کی تبلیغ برابر جاری رہی لیکن تحصیل کردہ رقم کی آخری حوالگی کے متعلق کسی ثبوت کی غیر موجودگی باعث دشواری ہے۔ احمد اللہ کے مقدمے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جو اسی نوعیت کا تھا، اس نے لکھا کہ اس مقدمے میں روپے کا کھوج پٹنہ سے سرحد تک لگا لیا گیا تھا۔ اس مقدمے میں یہ بات نہیں۔ اس نے شبہ ظاہر کیا آیا جب تک روپے کی حوالگی کے متعلق مزید ثبوت مہیا نہ ہو تعزیرات ہند کی دفعات ۱۲۰ اور ۱۲۲ کے تحت ان پر الزامات عائد نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ ان تمام افسروں میں جو اس مقدمے میں کام کر رہے ہیں احمد اللہ کے مقدمے کی مطبوعہ روداد کے نسخے تقسیم کر دیے جائیں کیونکہ وہابیوں، ان کی تنظیم اور ان کے بعض سربراہوں کی گرفتاری اور قانونی

چارہ جوئی کے موضوع پر یہ کارآمد رہنما ہے۔

حکومت ایک قانونی دشواری سے دوچار ہو گئی۔ متذکرہ بالا اشخاص گرفتار تو کیے گئے تھے بعض بدیہی شہادتوں پر، مگر ان کے جرم کے واقعی ثبوت جمع کرنے کے لیے کئی مقامات میں با تفصیل تفتیش چلانا ضروری تھا جب تک حکومت ہند سے ۱۸۱۸ء کے آئین ۳ کے لیے التجا نہ کی جائے یہ سب اشخاص غیر معینہ مدت تک بند نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ اس آئین نے جو قانون تحفظ ہند کا پیش خیمہ تھا مرکزی حکومت کو آدمیوں کی احتیاطی نظر بندی اور ان کو جس مدت تک ضروری سمجھے مقدمہ چلائے بغیر زندان میں محبوس رکھنے کے لیے کچھ غیر معمولی اختیارات سے مسلح کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر نے حکومت ہند سے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ تحریک کے صرف سرکردہ کو گرفتار رکھا جائے اور باقی کو رہا کر دیا جائے مگر رہا کردہ اشخاص کی حرکات پر نظر رکھی جائے۔ لفٹنٹ گورنر نے اس رائے کا اظہار بھی کیا کہ اگرچہ تحصیل کردہ رقوم کے سرحد پہنچنے کا کوئی ثبوت نہیں خود موضع اسلام پور میں ان لوگوں کے خاندان موجود ہیں جو سرحد پر ہیں یا وہیں مر گئے۔ ان کے خاندانوں کے ارکان کی پرداخت ابراہیم ہی تحصیل کردہ رقوم سے کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں مقصد حقیقتاً ایک ہی تھا۔ وہابیوں کی امداد۔ اس رائے کے مطابق لفٹنٹ گورنر نے حکم دیا کہ صرف ابراہیم منڈل اور نظیر سردار کو مقید رکھا جائے، باقی رہا کر دیے جائیں۔

ابراہیم منڈل سے ناروا سلوک

ابراہیم منڈل راج محل جیل میں قید کیے گئے۔ وہ کافی عمر رسیدہ تھے مگر وہ ایک بہت چھوٹی سی مرطوب کوٹھری میں رکھے گئے۔ جس کی تشریح خود جیل کے ڈاکٹر نے یوں کی ہے کہ "یہ مرطوب اور غیر ہوادار ہے۔ سونے کے لیے کوئی چارپائی نہیں۔ اس سے متصل کوئی بیت الخلا نہیں، کوٹھری ہی کا خواب گاہ کے طور پر استعمال کرنا بالکل ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔" ملحوظ رہے کہ یہ تھا وہ سلوک جو اس شخص کے ساتھ روا رکھا گیا جو ضابطہ ۳ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ اس قانون کی وجہ اجرا میں صاف صاف درج ہے کہ اس کے تحت قیدی کی صحت کی طرف "مناسب توجہ" رکھی جائے اور قیدی کے "سماجی رتبے" کے

مطابق "مناسب سامان" مہیا کیا جائے۔ علاوہ بریں حکومت بنگال نے ہر جیل کے جس میں ایسے قیدی رکھے جائیں، ذمہ دار افسر کو متنبہ کر دیا تھا کہ یہ ریاست کے قیدی ہیں اور ان کے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ نہ کیا جائے ابراہیم کو بعد میں راج محل سے مونگیر جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

مبارک علی عظیم آبادی

ان گواہوں میں جنھوں نے مالدہ میں بیان دیے تھے عنایت اللہ ولد فیض اللہ ساکن موضع شیخ پورہ ضلع مونگیر بھی تھا۔ اس کے تفصیلی بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پٹنہ کلیدی مرکز تھا اور بنگال اور سرحد کے درمیان رابطہ کی کڑی کا کام دیتا تھا۔

عنایت اللہ ولد فیض اللہ کی شہادت

عنایت اللہ نے بیان کیا کہ میرے سسر حاجی مبارک علی عظیم آبادی کے مرید ہیں جو احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد سردار ہو گئے۔ انھوں نے ذیقعد ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) کو مجھے بلا بھیجا اور روپے کی ترسیل کی خدمت کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی اور اس کام میں حصہ لینے کے فضائل بتائے۔ مزید استفسارات پر انھوں نے فرمایا کہ راج محل جا کر ابراہیم سے ملو۔ وہ تمہیں مفصل ہدایات دیں گے۔ انھوں نے مجھے ابراہیم کو دینے کے لیے کچھ کتابیں بھی دیں۔ میں جا کر دو ہفتے ابراہیم کے ہاں ٹھہرا اس مدت میں نظیر سردار اور بہت سے دوسرے لوگوں کو ابراہیم کے ہاں آتے اور مختلف رقوم جمع کرتے دیکھا۔ بالخصوص بقر عید کے موقع پر بڑی بڑی رقمیں جمع کی گئیں۔ کبھی کبھی پچاس ہزار اور ساٹھ ہزار تک جمع کی گئیں نقد روپے اکثر پٹنہ کے ایک مشہور سوداگر چرم امیر خاں کی مدد سے جس کی آڑھت کلکتہ میں تھی اشرفیوں میں تبدیل کرا لیے جاتے۔ تب یہ رقمیں مبارک علی کو بھیج دی جاتیں خفیہ کارپردازوں کی معرفت ان کو سرحد بھیج دیتے۔ ان میں ایک منیر ضلع پٹنہ کا باشندہ مولا بخش بھی تھا یہ ایک پست قد گندمی رنگ کا آدمی تھا، پشتو روانی سے بولتا اور بڑا ہوشیار اور معتبر شخص تھا۔ اور کارپرداز بھی کام کرتے تھے۔ سرحد کے راستے پر بنارس ایک اہم منزل تھی۔

الیشری پرشاد کی پٹنہ میں تقرری

عنایت اللہ کی شہادت نے پٹنہ کے کئی آدمیوں کو بھی پھنسا دیا۔ ریلی نے کوشش کی کہ الیشری پرشاد کو جو وہابیوں کے خلاف پچھلے مقدمات میں اتنا ہوشیار اور کارآمد ثابت ہوا تھا پٹنہ میں تعینات کرا دے۔ لیکن وہ مونگیر میں اپنے محکمہ جاتی امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے وہاں سے ہٹنا نہ چاہا۔ اس لیے گھوش کو پٹنہ میں تعینات کیا گیا۔ لیکن وہ ایسا ناپسندیدہ اور پٹنہ کے عوام الناس اس کی پہلے کی بعض حرکات سے اس کے اتنے خلاف تھے کہ کمشنر نے اسے فوراً پٹنہ چھوڑ دینے کا حکم دیا اور اس کے مشورے کے بغیر گھوش کو پٹنہ تعینات کرنے پر ریلی سے باز پرس کی۔ گھوش کی حمایت میں ریلی کا احتجاج مسموع نہ ہوا۔ اس کی بجائے الٰہی بخش، پورینہ سے تیسرے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کو پٹنہ بلایا گیا اور تفتیش کا کام اس کے سپرد کیا گیا۔ بعد میں الیشری پرشاد کو ریلی کی اعانت کے لیے پٹنہ میں تعینات کیا گیا۔

الیشری پرشاد کی تحقیقات

الیشری پرشاد کی آمد کے بعد تحقیقات پورے زور شور سے شروع ہو گئی۔ پتا چلا کہ سازشی تنظیم عملاً سارے شمالی ہند میں پھیلی ہوئی ہے۔ حکومت پنجاب و صوبہ شمالی مغربی (یوپی) کو مراسلے بھیج کر ان سے درخواست کی گئی کہ ریلی اور اس کے معاونوں کو ان کی تحقیقات میں تمام سہولتیں بہم پہنچائیں۔ مدراس اور بمبئی کی حکومتوں سے بھی کہا گیا کہ اپنے علاقوں میں وہابیوں کی کارروائیوں کی صورت حال کی رپورٹ دیں۔ بہرحال اصلی تحقیقات پٹنہ میں ہوتی رہی۔

وہابیوں کی کارروائیاں مدراس اور بمبئی کے صوبوں میں

جس زمانے میں ریلی بنگال میں وہابی کارروائیوں کی تفتیش میں مصروف تھا۔ اس کو معلوم ہوا کہ روپے اکثر ہندوستان سے مکہ کو بمبئی کے راستے بھیجے جاتے تھے جو حاجیوں کے بحری سفر کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے اس کے بعد روپے وہاں سے سرحد کو بھیج دیے جاتے۔ اس نے انسپکٹر جنرل پولیس سے کہا کہ حکومت بنگال سے تحریک کرے کہ وہ صوبہ مدراس و بمبئی کی حکومتوں سے رابطہ قائم کر کے ان علاقوں میں وہابیوں کی کارروائیوں کی تحقیقات کرائے، اور یہ بھی پتا چلائے آیا ان کے

اور بہار و بنگال کے وہابیوں کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے۔ جنوبی مغربی ہندوستان میں اس تحریک کا مندرجہ ذیل مختصر تذکرہ دونوں حکومتوں کی دو رپورٹوں پر مبنی ہے۔ اگرچہ یہ رپورٹیں ۷۰-۱۸۶۹ء میں وہابیوں کی عام تحقیقات کے متعلق روددادوں کا ایک حصہ ہیں تاہم ایک علیحدہ مجموعہ دستاویزات ہیں۔ دہلی کو خاص طور پر یہ معلوم کرنا مقصود تھا آیا سرحد اور جنوب مغرب کے وہابیوں کے درمیان کسی رابطے کا امکان موجود ہے۔ اس سوال کا جواب اکثر حالات میں یہ تھا کہ اس مسئلہ پر کوئی نمایاں اور کھلی شہادت موجود نہیں۔ اس لیے دہلی نے جس طرح شمالی اور مغربی علاقوں کا معائنہ کیا، ان علاقوں کا بذات خود نہیں کیا اور ان میں کوئی دلچسپی نہ لی اور معاملہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔

بہرحال وہابی جنوبی مغربی ہند کے خطوں میں کافی چاق و چوبند رہے۔ دو بڑے کام جو اندرون ہندوستان میں وہابیوں کو کرنا تھے یعنی چندے جمع کرنا اور انگریزوں کے خلاف لٹریچر کا پھیلانا، سرگرمی سے ہوتے رہے۔ فوج میں تداخل (اپنے آدمیوں کے گھسانے) کا کام جو ۱۸۳۹ء میں شروع ہوا تھا۔ اب بھی جاری تھا۔ اخبار اور رسائل بھی مشتہر کیے جاتے اور ان میں کثرت سے مضامین شائع کیے جاتے۔

وہابی تبلیغ، اسماعیل کی مدراس میں خدمات

انسپکٹر جنرل پولیس مدراس نے رپورٹ دی کہ کچھ عرصہ سے مدراس میں وہابی تحریک پر نگرانی رکھی جاتی رہی ہے۔ ۱۸۶۶ء میں ایک شخص مسمّی اسماعیل جو پہلے ۲۷ دیسی فوج میں سپاہی تھا اور ایک پرجوش وہابی مبلغ ہے ۱۸۱۹ء کے ضابطہ ۲ کے تحت (جو بنگال کے ۱۸۱۸ء کے ضابطہ ۳ کے مساوی ہے) مدراس میں مقید ہے۔ وہ پہلے ۱۸۵۲ء میں بغاوت پھیلانے کی علت میں فوجی لائنوں سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں گنتور میں اس پر اس قسم کی حرکات کا شبہ ہوا۔ اس کے بعد وہ برما چلا گیا جہاں وہ دیسی فوجوں میں وہابی تعلیمات کی تبلیغ کرتا رہا اس لیے وہ تھیٹمیو (برما) سے کلکتہ چالان کر دیا گیا۔ اور پھر ۱۸۶۳ء میں اس پر وزیا نگرام میں باغیانہ حرکات کا شبہ کیا گیا۔ آخر ۱۸۶۶ء میں شمالی سرکار میں ایسی ہی حرکات کے لیے قید کر دیا گیا۔

وہابی مبلّغ احمد اللہ کی بنگال میں کارروائیاں

ایک اور وہابی مبلغ جس نے مدراس اخاص کر کے مدراس میں مقیم دیسی پیدل فوج کی رجمنٹ میں، بہت کام کیا وہ بنگال کا ایک شخص مسمّی احمد اللہ تھا۔ اس کی کارروائیوں نے بالخصوص فوج میں کچھ اعلیٰ فوجی حکام کو چونکا دیا۔ چنانچہ مدراس کے ایڈجوٹنٹ جنرل نے کمانڈر انچیف مدراس کی ہدایت پر مدراس کے تمام کمانڈنگ افسروں کے نام حکم جاری کر دیا کہ "وہ ایک کٹر وہابی متوطنِ بنگال احمد اللہ سے ہوشیار رہیں جس کا اصل مقصد سپاہیوں کو بغاوت پر اکساتا ہے۔ وہ جگہ جگہ جہاں کہیں مدراس کی فوجیں ہیں گھومتا پھرتا اور باغیانہ پیغامات پہنچایا کرتا ہے۔"

احمد اللہ مبلغ کی رائے پور میں گرفتاری

احمد اللہ ۱۸۶۹ء میں رائے پور میں گرفتار کر لیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انسپکٹر جنرل پولیس صوبہ جات زیریں کے پاس اس کی گرفتاری کی رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص گزشتہ ستمبر میں رائے پور سے آیا تھا۔ بعض معروف وہابی اس سے ملے۔ پولیس افسر نے جن کے پاس ایڈجوٹنٹ جنرل مذکور کا گشتی حکمنامہ موجود تھا۔ احمد اللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اقرار کیا کہ ۱۸۶۰ء میں وہ ویزیانگرام گیا تھا اور وہاں ۱۱ دیسی فوج کے کچھ جوانوں سے ملا تھا۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے یہ بھی بتایا کہ اب وہ رجمنٹ رائے پور میں مقیم ہے۔ اس نے مزید لکھا کہ احمد اللہ اسماعیل خاں کا پیر ہے جو ایک معروف وہابی ہے اور چند سال ہوئے ۲۸ مدراس دیسی فوج کے سپاہیوں میں بغاوت کی تبلیغ کے لیے برہان پور میں گرفتار کیا گیا اور قید عمر کی سزا دے کر کوئمبٹور کے جیل میں مقید کیا گیا۔ احمد اللہ ۱۸۶۲ء میں ایلور (ضلع گوداوری) بھی گیا تھا اور اس وقت سے وہاں وہابیت روبہ ترقی ہے۔

احمد اللہ نے بیان دیا کہ وہ کپڑے، چرسہ اور ہڈی کی تجارت کرتا ہے۔ بمبئی سے کپڑے خریدتا اور مختلف جگہوں میں بیچتا ہے۔ اس بیان سے اس کی لگاتار سیر و سیاحت کی توجیہ تو ہو گئی۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ تبلیغی کاموں کو اصلی کاروباری کاموں کے ساتھ خلط ملط کر دینے کی وہابی چال بھی چلتا تھا۔ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی باقاعدہ سوداگری کو تشفی بخش طور پر ثابت کر سکے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس رائے پور نے احمد اللہ کے متعلق مزید تفصیلی معلومات طلب کیں جو اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری میں کام دے سکیں۔ ریلی نے جواب[1] دیا کہ مجھے پٹنہ کے علی کریم سے احمد اللہ کے متعلق کچھ اطلاعات ملی ہیں۔ ۱۸۵۷۔۵۹ء کی تحریک میں علی کریم بہار کے مشہور سربراہوں میں تھے۔ وہ جون ۱۸۵۷ء کو بہار سے نکل بھاگے تھے۔ گورکھ پور اور ٹانڈہ میں کئی لڑائیوں میں لڑے تھے۔ اس تحریک کے فرد ہونے کے بعد وہ بھوپال چلے گئے۔ ان کی گرفتاری کا وارنٹ جو بہار میں پڑا رہا بیگم بھوپال کی سفارش سے اُٹھا لیا گیا۔ وہ واپس آئے اور پٹنہ میں آباد ہو گئے۔ پٹنہ واپس آکر انھوں نے وہابیوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لیے ریلی کو اپنی خدمات پیش کیں۔ ریلی نے سفارش کی کہ حکومت ان کی پیش کش قبول کرلے لیکن نامنظور کر دی گئی۔ ریلی نے لکھا کہ اب علی کریم سے احمد اللہ کے متعلق کسی مزید اطلاع کی توقع نہیں لیکن احمد اللہ کو گرفتار کرنے کے لیے ضابطہ ۳ مجریہ ۱۸۱۸ء کے تحت کافی شہادت موجود ہے۔

انسپکٹر جنرل مدراس نے مدراس میں وہابیوں کی کارروائیوں پر اپنے عام تاثر کا اظہار کرتے ہوئے رپورٹ دی کہ یہ زیادہ تر ان کے مذہبی عقائد سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ کہ اگرچہ انھوں نے کسی فعل کا علانیہ ارتکاب تو نہیں کیا۔ لیکن ممکن ہے کہ جبری عیسائی قانون کے تحت کبھی کبھی ان کے طبعی جذبات اُبل پڑیں۔"

شہر مدراس میں وہابیوں نے ایک اخبار بیلچی (میٹوک) کے نام سے نکالا جس کے خریدار تمام صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ دوسری جگہوں میں بھی تحریک کی رفتار سے تعلق رکھتے تھے ورنہ ایک دور دراز کے شہر میں ایک گمنام اخبار کی خریداری نہ کرتے۔

---

[1] جے۔ ایچ ریلی ڈی آئی جی کی چٹھی بنام آئی جی پولیس ایل پی نمبر ۳۲۴ مورخہ کلکتہ یکم دسمبر ۱۸۶۹ء۔

صوبہ بمبئی کے پولیس کمشنروں کی رپورٹیں

حکومت بنگال کے ایک اسی قسم کے سوال کے جواب میں حکومت بمبئی نے رپورٹ دی کہ صوبہ (بمبئی) کے مختلف پولیس کمشنروں نے اپنے اپنے علاقوں کے متعلق مندرجہ ذیل رپورٹ دی ہے :-

شہر بمبئی کے پولیس کمشنر نے رپورٹ دی ہے کہ اس شہر میں ایک سو کے قریب وہابی ہیں کسی شہادت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بنگال میں ان کے ہموطنوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

کیرا کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رپورٹ دی ہے کہ چھ مہینے ہوئے کچھ وہابیوں نے نیر باد میں ایک مسجد قائم کر لی تھی، لیکن بوہروں نے ان کو نکال دیا۔ سورت اور بروچ میں بھی وہابی اثر کچھ زیادہ نہیں کیونکہ ان کے فرقے کے عقائد مقامی آبادی کے عقائد سے اتنے مختلف نہیں لیکن جب نربدا کے پاس ریل کا پل مرمت کیا جا رہا تھا۔ وہاں کے کچھ کاریگر (غیر بمبئی والے) جیسا کہ کہا جاتا ہے وہابی بھی تھے۔ کام ختم ہونے کے بعد چلے گئے۔

جنوبی علاقے کے کمشنر پولیس نے رپورٹ دی کہ ضلع کلاڈگی میں کچھ وہابی خاندان ٹالیکوٹ میں رہتے ہیں۔ وہ زیادہ تر جولاہے ہیں۔

"پنچ محل کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رپورٹ دی کہ کوئی سات سال ہوئے ۱۸۶۲ء میں وہابیوں کی ایک معتد بہ تعداد اپنے مشرب کی اشاعت کے لیے ٹونک سے گودھرا آئی تھی۔

پونا میں کچھ عرصہ ہوا ایک شخص برکت اللہ ساکن فراشخانہ دہلی آیا اور جہاد کی تبلیغ کی۔

"پونا میں کسی مولوی کو اس زور شور سے ایسی تیز زبان میں وعظ کہتے نہیں سُنا گیا جیسا اس شخص نے کیا۔ اسے ایک ایسی رجمنٹ کے احاطے سے نکل جانے کی تنبیہ بھی کی گئی۔ وہ مکہ جانے کے بہانے نکل تو گیا مگر بمبئی چلا گیا جہاں ایک

متمول وہابی عنایت اللہ کے پاس ٹھہر گیا چند وہابی جو شہر اور صدر بازار میں رہتے ہیں وہ اپنے مشغلہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔

بیجاپور سے بھی رپورٹ ملی ہے کہ مدراس کی طرف سے ایک وہابی مولوی وہاں آیا تھا۔ زیادہ تر مقامی وہابی جولاہوں سے لیے گئے ہیں مذکورہ بالا تحقیقات کے ساتھ صدر مقام پٹنہ میں بھی تفتیش جاری رہی۔

خورشید علی اور مبارک علی کی گرفتاری

ریلی کو ایک مخبر سے معلوم ہوا کہ احمد اللہ کے مقدمے کے سرکاری گواہ الٰہی بخش متوفی کا بھائی خورشید علی جو اب الٰہی بخش کے بچے کی طرف سے اس کی دوکان کی نگرانی کرتا ہے وہ شخص ہے جس کی معرفت مبارک علی دہلی اور سرحد کو روپے بھیجتا ہے۔ الٰہی بخش کی جوتوں کی دوکان متعلق بہ دہلی (جہاں سے جوتے خریدتا اور اس کام کے لیے روپے بھیجا کرتا) ایک بڑا سہل واسطہ تھی انسی دوکان کو جس کی پہلے پولیس تلاشی لے چکی تھی۔ یہ سمجھ کر کہ حکام اب اس پر شبہ نہ کریں گے منتخب کرنے کے لیے ریلی نے مبارک علی کی ڈھٹائی پر رائے زنی کی دوکان کی تلاشی لی گئی اور کاغذات پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان سے مختلف رقوم کے جمع کرنے اور سنہ ۱۲۸۴ء سنہ ۱۲۸۵ ہجری (سنہ ۱۸۶۶ء) میں دو رقوم ۹۷۲۸ روپیہ اور ۱۱۹۱۴ روپیہ کی ترسیل کا پتا چلا۔ نہ ان ترسیلات کی کوئی توجیہہ پیش کی گئی نہ کاروبار کے سرمایہ نے ایسے منافع کی تائید و توثیق کی۔ چنانچہ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء کو خورشید علی اور مبارک علی دونوں گرفتار کر لیے گئے۔

دہلی میں تحقیقات

پٹنہ میں تحقیقات کے دوران میں الیشری پرشاد کو معلوم ہوا کہ مبارک علی نے ایک شخص امید علی ساکن باقر گنج (بنگال) کو جو دہلی میں مقیم تھا چند خط لکھے تھے۔ الیشری پرشاد فوراً دہلی پہنچا امید علی کا پتا لگا کر اس کے گھر کی تلاشی کرائی اور کاغذات پر قبضہ کر لیا۔ اس تلاشی سے مفید مطلب نتائج حاصل ہوئے اور پنجاب، سرحد شمالی مغربی اور بہار میں مختلف مقامات میں وہابیوں کے متعلق اہم سراغ ملے۔

امید علی نے اقرار کیا کہ اس کو مبارک علی سے خطوط اور روپے وصول ہوئے تھے اور سرحد سے اس کے نام آئے ہوئے خطوط بھی اس کے پاس بھیجے تھے۔ اس نے چند وہابی کارپردازوں

کے نام بھی بتلائے جو سرحد کو روپے لے جاتے تھے۔ ان میں مبارک علی عظیم آبادی کا بیٹا تبارک علی (معروف بہ قادر بخش) بھی شامل تھا۔ چنانچہ تبارک علی پٹنہ میں گرفتار کر لیا گیا۔

شاہزادہ فیروز شاہ

امید علی نے ایک اور معنی خیز اطلاع دی اُس نے کہا کہ ایک روز جب میں اپنے رفیق کار محمد امین کی دوکان پر بیٹھا تھا میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا جو محمد امین سے ملنے آئے تھے۔ ان کے بارے میں دریافت کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ وہ شہزادہ فیروز شاہ[1] کے پاس سے آئے ہیں جو سرحد پر رہتے ہیں۔ وہ فیروز شاہ کی طرف سے دکن کے بعض راجاؤں کے نام خطوط لائے ہیں۔ شاہزادے نے ان کو مدد کے اُن وعدوں کی یاد دہانی کی ہے جو انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں ان سے (شہزادے سے) کیے تھے اور ان سے درخواست کی ہے کہ دریائے آکسس (جیحوں) پر اُن سے آملیں۔" ان خطوط پر فیروز شاہ کی مہریں بھی تھیں۔ مہر قُطر میں بالشت بھر تھی، ایک دائرے میں خانوادۂ تیموریہ کے کل بادشاہوں کے نام تھے اور خود فیروز شاہ کا نام مرکز میں تھا۔ یہ خط فیروز شاہ کے بھائی شہزادہ ایزاد (ایزد) بخش کو پہنچانے تھے جو اپنی ماں کے ساتھ دہلی میں ایک جھونپڑے میں رہتا تھا اور ایک کپڑے کی دکان[2] رکھتا تھا سوال کرنے پر ایزاد بخش نے کہا کہ میں بھائی کے قاصدوں کے ہاتھ سے خط لینا نہیں چاہتا۔ آخر نذیر حسین کے ہاں جاتے ہوئے جو دہلی میں پھاٹک حبش خاں کے قریب رہتے تھے راستے میں ان سے ملنے پر رضا مند ہو گیا۔

---

[1] فیروز شاہ اکبر ثانی کا بھتیجا اور بہادر شاہ ثانی کا چچیرا بھائی تھا۔ ۱۸۵۲ء میں سفر حج کو چلا گیا تھا، اور اس وقت لوٹا جب کہ شورش جاری تھی۔ اس میں اس نے نمایاں حصہ لیا تھا اور اس کے استیصال کے بعد ۱۸۶۸ء میں سرحد کے علاقے میں جا رہا اور کچھ عرصہ تک سید احمد کے پاس رہا۔

[2] دہلی نے شہزادہ ایزاد بخش کے بارے میں لکھا تھا۔ دہلی میں کوئی شخص بھی دہلی کے ایک شاہزادے سے گز بھر لٹھا خرید سکتا ہے۔ دنیا کا جاہ وجلال یوں ہی گزر جاتا ہے۔"

نذیر حسین محدث دہلوی

نذیر حسین تفسیر اور فقہ اسلامی کے مشہور استاد، شروع میں سورج گڑھ ضلع مونگیر کے متوطن تھے۔ بعد میں وہ دہلی میں جا بسے۔ شروع میں سید احمدؒ سے ان کی ملاقاتوں نے ان کو کچھ متاثر اور اس تحریک کا ہمدرد بنایا ہوگا گو اس کا کوئی یقینی ثبوت نظر نہیں آتا۔ مگر امید علی کے بیان نے نذیر حسین کو یہ کہہ کر صاف صاف ملوث کر لیا کہ فیروز شاہ کے قاصد آئے تھے تو وہ بھی موجود تھے۔ نذیر حسین کے گھر کی تلاشی سے بہت سے مشتبہ قسم کے خطوط نکلے۔ ان میں سے بعض معروف وہابیوں جیسے جعفر تھانیسری اور مبارک علی عظیم آبادی کے خطوط بھی نذیر حسین کے نام تھے۔ ایک خط نذیر حسین کا لکھا ہوا سرحد کے وہابی سردار عبداللہ کے نام بھی تھا۔ دہلی نے ضابطہ ۳ کے تحت ان کی گرفتاری کی سفارش کی لیکن وہ ایک مشہور و معروف عالم تھے۔ اور ان کے خلاف کسی اطمینان بخش شہادت کے بغیر حکومت اس انتہائی اقدام سے متامل تھی۔ حکومت نے اس معاملے کی رپورٹ حکومت پنجاب کو (جس کے ماتحت خطۂ دہلی تھا) بھیج دی اور درخواست کی کہ وہ جو اقدام مناسب سمجھے کرے۔ حکومت پنجاب نے ان کو احتیاطی طور پر چھ ماہ جیل میں قید رکھنے کا حکم نافذ کیا مگر اس کے فوراً بعد ہی ان کو رہا کر دیا۔

دسمبر ۱۸۶۵ء میں عبداللہ نے راولپنڈی میں جو بیان دیا تھا۔ اس کے مطابق نذیر حسین دہلی میں وہابی کارکنوں کے صدر تھے۔ راج محل کے ایک اور گواہ نے بھی شہادت دی کہ نذیر حسین نے اس کو سرحد جانے پر آمادہ کیا تھا۔ دہلی نے سفارش کی کہ نذیر حسین کے معاملے کی دوبارہ جانچ کی جائے اور گواہوں سے ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ کاغذات حکومت پنجاب کو پھر بھیجے گئے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مگر بعد کی تحقیقات میں وہ نمایاں طور پر نظر آئے۔

امید علی کی گرفتاری

امید علی کی بعض اور آدمیوں کے ساتھ احتیاطی نظر بندی کی گئی ایک اور ملزم محمد امین یا امین الدین بھی جو باقر گنج کا باشندہ تھا اور امید علی کی گرفتاری کے بعد بھاگ کر ڈھاکا چلا گیا تھا گرفتار کر لیا گیا۔

دہلی کے مجسٹریٹ کار اسٹیفن نے جس نے امید علی اور دوسروں کے بیان قلم بند کیے

تھے رپورٹ دی کہ امید علی نے دوسرے صوبوں میں وہابی کارپردازوں کے متعلق جو سراغ بہم پہنچائے ہیں ان پر کام کرنا چاہیے اور اس دوران میں امید علی کو قید رکھنا اور باقی کو رہا کر دینا چاہیے۔

امیرالدین ساکن مالدہ

ریلی جب ابراہیم منڈل کی گرفتاری کے سلسلے میں مالدہ میں تھا اس کو معلوم ہوا کہ مالدہ کے سب سے بااثر لوگوں میں ابراہیم منڈل کے بعد دوسرا نمبر ایک شخص امیرالدین ساکن موضع سندیپا نراین پور ہے۔ اس کی کارروائیاں بہت عرصے سے جاری ہیں اور حکام ان سے ناواقف نہیں۔ مارچ ۱۸۶۹ء میں گھوش کو ہدایت کی گئی کہ مالدہ جائے۔ وہاں جا کر اس نے ۳۰ مارچ ۱۸۶۹ء کو امیرالدین کو گرفتار کر لیا۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ اس موقعہ پر بھی یہ اطلاع کہ جس ضلع میں گرے (منذکرہ بالا) کے کارخانے واقع تھے وہاں نیل والوں کے جھگڑوں میں امیرالدین ایک نہایت مستعد کارکن پایا گیا تھا جو برسوں سے کام کر رہا تھا۔ اس پر مقدمہ چلانے کے لیے حکومت کی منظوری کے انتظار کے دوران میں ہی وہ گرفتار کر لیا گیا۔

مالدہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ دی کہ سردست اس پر الزام عائد نہیں کیا جا رہا ہے اور اس کے خلاف تحقیقات ابتدائی کارروائی سمجھی جائے گی تاکہ بعد میں اس پر باقاعدہ مقدمہ چلانے کے لیے حکومت حلفیہ شہادت مہیا کر لے۔

لفٹننٹ گورنر بنگال نے مختلف مقامات میں ان تمام تفتیشوں پر حکومت ہند کو رپورٹ دیتے ہوئے ایک چٹھی میں رائے ظاہر کی کہ "وہابی تحریک نہایت پیچیدہ شاخ در شاخ ہے۔ اس کے کارپرداز سہارن پور، جہلم، روڑکی، داناپور، اور متفرق جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔" لفٹننٹ گورنر کو شبہ تھا آیا ان مشتبہ لوگوں کے خلاف مقدمہ کی کارروائی فوجداری عدالتوں میں کامیابی سے چل سکے گی۔ اس کی رائے تھی کہ تعزیرات ہند میں بصورت موجودہ کوئی ایسی دفعہ نہیں جس کی رو سے اس قسم کے افعال کا جو وہابیوں سے سرزد ہوئے مقابلہ اور توڑ کیا جا سکے۔ ہنز حکام کی درگت کی ان لفظوں میں تشریح کرتا ہے "فساد اتنا وسیع وہمہ گیر ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کارروائی کہاں سے شروع کی جائے۔ ہر ضلعی مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے چینی پھیلا دیتا ہے۔ ملزم کے خلاف ممکن الحصول گواہ اسی کے وہ نئے عقیدت مند ہیں جو اپنے مالک کے ساتھ

دغا کرنے پر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔"

پٹنہ اور دانا پور میں تحقیقات

تحقیقات کے دوسرے منظر میں مشعل کی شعاع پٹنہ اور دانا پور کی طرف مڑ گئی۔ تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ دانا پور بھی ایک بڑا معروف کار مرکز ہے۔ زیادہ اہم انکشاف یہ تھا کہ بعض ملوث افراد ۱۸۵۷ء میں بھی سرگرم کارکن پائے گئے تھے۔ پتا چلا کہ اردلی بازار دانا پور کے ایک اور باشندے حاجی دین محمد کو اور کچھ اور آدمیوں کو وہابی قائد سرحد عبد اللہ نے راولپنڈی میں متعین کر رکھا تھا۔ راولپنڈی وہابی کارپردازوں کا ایک اہم مقام تھا اور دین محمد کے ذمہ یہ کام تھا کہ پٹنہ سے آنے والی رقوم وصول کر کے ان کو سرحد منتقل کر دے۔ دین محمد کے خط میں جو دھر لیا گیا مرموز زبان میں روپے کی خلاف قانون ترسیل کے متعلق اشارات تھے۔ ریلی نے حکومت کی توجہ اس بات کی طرف منعطف کی کہ "دانا پور جیسے اہم مقام میں جہاں دیسی رجمنٹوں کی چھاؤنی ہے مناسب ہے کہ وہابی سازشیوں کے پورے جتھے کو گرفت میں لے لیا جائے۔" اس نے پیر محمد کو ضابطہ ۳ کے تحت گرفتار کر لینے کی درخواست کی۔ صوبائی حکومت زیادہ محتاط تھی اور پیر محمد کے ماضی کے رویہ پر کمشنر سے رپورٹ مانگی۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ریلی کی درخواست کی تائید کرتے ہوئے رپورٹ دی کہ پیر محمد کی کوئی اپنی آزادانہ کمائی نہیں اور وہابیوں کا کام کرنے کے لیے جو رقمیں وصول ہوتی ہیں انھیں پر گزارا کرتا ہے۔ اس نے چھاؤنی کے مجسٹریٹ ایمرسن کا قول بھی نقل کر دیا کہ پیر محمد پر ۱۸۵۷ء میں شبہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس وقت ٹیلر نے اسے چھوٹی مچھلی (صید حقیر) سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس پر حکومت کے خلاف کسی سازش میں شریک ہو جانے کا احتمال ظاہر کیا تھا۔ وہ تبارک علی ولد مبارک علی کا خسر بھی تھا اور دونوں کے دونوں جانے بوجھے وہابی تھے اور گرفتاروں میں تھے۔ چنانچہ ضابطہ ۳ کے تحت اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا اور ۱۴ جون ۱۸۶۹ء کو اسے گرفتار کر کے دیگھا جیل میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں انسپکٹر جنرل پولیس کی درخواست پر وہ بھاگل پور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے کچھ ہی بعد حاجی دین محمد جب سرحد شمالی مغربی سے دانا پور آیا ہوا تھا تاکہ

وہاں کے مقامی آدمیوں کو تحصیل زر کے کام میں غفلت سے چونکائے اُسے گرفتار کر لیا گیا مگر جب وہ دو کانسٹبلوں کی حراست میں دھلی بھیجا جا رہا تھا، چلتی ریل سے کود کر نکل بھاگا۔

امیر خاں اور حشمت داد خاں

پیر محمد کے متعلق جو اطلاعات فراہم ہوئیں ان میں کئی آدمی ملوث ہو گئے۔ ان میں پٹنہ کے مشہور و معروف سوداگران چرم امیر خاں اور حشمت داد خاں بھی شامل تھے۔ حکام بہت پہلے سے ان کی طرف سے مشکوک تھے۔ ان کے بارے میں رپورٹ تھی کہ جب برادران علی کو نیک چلنی کے مچلکے دینے کو کہا گیا تھا تو یہی لوگ ضامن ہوئے تھے اب صاف صاف ثبوت بھی ہاتھ آ گئے جن میں امیر خاں کا ایک خط بھی تھا۔

ترسیل زر کے لیے وہابیوں کا طریق کار

پیر محمد کی گرفتاری کے موقع پر بہت لوگوں نے شہادت دی تھی۔ ان میں سے شیخ جھگڑو کا بیان خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے روپے کی ترسیل میں وہابیوں کے طریقِ کار اور بعض محصّلوں کو سونپے ہوئے علاقوں کے انکشافات ہوتے ہیں۔ گواہ نے اور باتوں کے ساتھ یہ اظہار بھی دیا کہ روپے عورت کارکنوں کی معرفت بھی بھیجے جاتے تھے۔ ان پر اشتباہ کا امکان کم تھا۔ آدمی اور روپے دستوں اور رجمنٹوں کے سپاہیوں کے ساتھ کوچ کے دوران بھیجنا بھی ایک عام ترکیب تھی۔ ایسے موقعوں پر وہابی کارکن لشکروں کے شاگرد پیشہ کی سی روش اور طور طریقے اختیار کر لیتے۔

۶

وہابی منصوبوں میں دیسی رجمنٹوں کا کردار

یہ بیان اس بات کا بھی مزید ثبوت مہیا کرتا ہے کہ عملی منصوبے میں دیسی رجمنٹیں اہم مقام رکھتی تھیں۔ سپاہیوں پر ہوشیاری سے اپنے اعتقاد تو تھوپتے ہی تھے رجمنٹوں کی نقل و حرکت سے بھی ایک نہایت دشوار اور خطرناک کام میں مدد لیتے تھے وہابی دلیرانہ چالوں کے قائل تھے، فوجی دستوں کے ساتھ کوچ کرتے ہوتے تو فوج کے ساتھ ساتھ دشمن کے کارکن (مخبروں) اور غداروں سے چوکنے رہتے۔

جھگڑو نے مزید بتایا کہ حاجی دین محمد اور کریم بخش حاجی پور اور علی گنج سیوان میں عبدالرحمن داناپوری مہنپورا، سلطان پور اور ٹسکا میں (جو سب پڑوسی گاؤں ہیں) اور خدا بخش پرانے داناپور اور لسلی گنج میں تحصیل کرتے۔ بھولے خاں اور عمدو خاں بھی آس پاس کے علاقوں میں چندہ جمع کرتے تھے۔

داناپور، مالدہ اور کلکتہ میں گرفتاریاں

ان تفتیشوں کے بعد داناپور کے تقریباً ایک درجن اشخاص اور سوداگران چرم امیر خاں اور حشمت داد خاں ضابطہ ۳ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ مالدہ کے امیرالدین پر بھی جو پہلے گرفتار کیے جا چکے تھے ضابطہ ۳ عائد کیا گیا۔ حشمت داد خاں اور ان کے مختار آلہی بخش اس وقت پٹنہ میں تھے لیکن فوراً گرفتار نہیں کیے گئے تاکہ کلکتہ میں پرانے شریک کاروبار امیر خاں چوکنے نہ ہو جائیں۔ ان کو ۹ جولائی ۱۸۶۹ء کو کلکتہ میں گرفتار کیا گیا۔ اور گیا جیل میں لایا گیا مگر جلد ہی ان کو علی پور کلکتہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ بعد میں حشمت داد خاں اور ان کے مختار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

کرامت علی کے نام خطوط کی جانچ پڑتال

تحقیقات کے دوران البشری پرشاد کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سرحد شمالی مغربی میں وہابیوں کے خفیہ خطوط کرامت علی داناپوری کے نام روانہ کیے گئے تھے۔ کرامت علی کو ان خطوط کی وصولی اور بہار میں متعلق اشخاص (مکتوب الیہم) تک پہنچانے کے لیے بارہ بنکی (اودھ) میں تعینات کیا گیا تھا۔ شبہ تھا کہ بھٹا، بہیا اور بجمر (واقع ضلع شاہ آباد)

کے ڈاک خانوں کے علاقوں میں کئی گاؤں میں ایسے لوگ ہیں جن کے نام ایسے خطوط آتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے ان خطوط کی جانچ پڑتال کے اختیار کی درخواست کی مگر صوبائی حکومت ہند سے رجوع کیا گیا تو اس نے پولیس کے افسر اعلیٰ کی درخواست منظور کر لی اور پوسٹ ماسٹر جنرل کو ہدایت کی کہ وہ متعلق پوسٹ ماسٹروں کو حکم دے کہ ان کے ڈاک خانوں سے گزرنے والے خطوط کا سنسر (جانچ پڑتال) ہونے دے۔ اسی طرح کمشنر اودھ کو اختیار دیا گیا۔ اس مدت میں بہت سے خطوط پر قبضہ کیا گیا اور ان کی جانچ پڑتال کی گئی۔

واعظ الحق کی گرفتاری

واعظ الحق جن کو ٹیلر نے ۱۸۵۷ء میں گرفتار کیا تھا اب پھر وہ شبہ میں پکڑ لیے گئے۔ اپنی پہلی رہائی کے بعد وہ مکہ چلے گئے اور گھر واپس آ گئے تھے۔ چونکہ روپے سرحد شمالی مغربی کو زیادہ تر مکہ ہی کے راستے سے بھیجے جاتے تھے۔ اس لیے واعظ الحق پر شبہ کیا گیا۔ واعظ الحق کے خلاف ان کے بھتیجے عزیز الحق نے اطلاع درج کرائی تھی۔ کمشنر نے ان الزامات کی پوری تحقیقات کی مگر ان کی شرکت کے متعلق وہ پوری طرح متیقن نہ ہوا۔

ریلی کی روانگی پنجاب

بہار اور بنگال میں تحقیقات کی اصل تصویر اب تک مکمل ہو چکی تھی اور تحریک کے اکثر سربرآوردہ سردار گرفتار کیے جا چکے تھے۔ مگر دوسرے مقامات خصوصاً پنجاب اور سرحد شمالی و مغربی میں تفتیش اب بھی جاری رکھنا تھیں۔ اس لیے ریلی پنجاب روانہ ہوا۔

بہار اور بنگال میں گرفتار شدہ اشخاص کے خلاف مقدمات دائر نہیں کیے گئے تھے کیونکہ اس سے پہلے شمال و مغرب میں تفتیشوں کی تکمیل ضروری سمجھی گئی۔ تمام تنظیمیں ایک ایک دوسرے میں گتھی ہوئی تھیں، اور حکومت چاہتی تھی کہ مقدمے چلانے سے پہلے جتنی اطلاعات مہیا ہو سکیں ان سے اپنے آپ کو مسلح کر لے۔ اس سے ان لوگوں کی دسمبر ۱۸۶۸ء سے جولائی ۱۸۶۹ء تک گرفتاری اور ان کے خلاف اکتوبر ۱۸۷۰ء سے مارچ ۱۸۷۱ء تک کے درمیان غیر معمولی تاخیر کا سبب واضح ہو جاتا ہے۔ اس مدت میں بہت سے قیدی اپنے بیانات دینے اور مختلف مقامات میں جہاں ایک ہی وقت میں تفتیش جاری تھیں مشتبہ

اشخاص سے مواجہہ و مقابلہ کرنے کے لیے ایک سے دوسرے جیل میں منتقل کر دیے گئے۔

مرتضیٰ کی نشان دہی

ریلی ستمبر ۱۸۶۹ء میں اپنے سفر پنجاب میں اپنے ساتھ ایک شخص مرتضیٰ نامی باشندہ مالدہ کو جو کبھی سرحد شمالی مغربی کے وہابی مرکز میں رہا تھا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ریلی اُس کو اس خاص مقصد سے لے گیا تھا کہ اُن لوگوں کی نشان دہی کرے جن کو اُس نے وہابیوں کے ساتھ ان کے مرکز میں دیکھا ہو یا جن کے بارے میں اُسے علم ہو کہ وہابیوں کے شریک کار ہوں۔ مرتضیٰ نے ریلی کی توقع سے زیادہ اس کا مقصد پورا کیا۔ اُس نے پشاور میں متعدد آدمیوں کو وہابیوں کا کارکن بتایا۔

پشاور میں وہابیوں کی گرفتاری

ان میں مفتی حسینی (معروف بہ محمد حسین و غلام حسین وغیرہ) احمد علی داناپوری، وہ معروف قاصد جو بار بار پٹنہ سے پشاور تک ہماری پولیس کے گھیرے سے کامیابی کے ساتھ نکل بھاگتا رہا ہے۔ غلام ربانی شہر پشاور میں عطر اور شربت کا بساطی، سید خان، مقامی کمان دار جنرل ہیلی کا خانساماں جس کی گرفتاری نے شہر میں سنسنی پھیلا دی، فیاض علی داناپور کا ایک نو مسلم (پہلے ہندو تھا) اور کئی اور آدمی تھے۔ مفتی حسینی کا مقدمہ بہت دلچسپ ہے۔ بہت دنوں تک وہ اپنے آپ کو حکومت کا جاسوس ظاہر کرتا رہا اور اس فریب کو اس کامیابی سے نبھاتا رہا کہ حکام کو اس پر کبھی شبہ نہ ہوا۔ اس کے برعکس جب وہ گرفتار کیا گیا اور جامہ تلاشی ہوئی تو اس کے قبضے سے بڑے بڑے اعلیٰ عہدہ داران فوجی و ملکی کی دی ہوئی نیک چلنی کی سرٹیفکٹس نکلیں۔ لیکن آخر یک بیک مرتضیٰ کے مواجہے نے اس کا راز فاش کر دیا۔ اس کے گھر سے جو کاغذات پکڑے گئے ان میں سے ایک شخص امداد علی کا خط تھا جو کبھی فرخ آباد یوپی کا ڈپٹی مجسٹریٹ تھا اور ۱۸۵۷ء میں باغیوں میں شریک تھا، بھاگ کر سرحد چلا گیا تھا اور اُس وقت شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ تھا۔

عبداللہ کی گواہی

اسی مہینے ریلی مرتضیٰ کو لے کر اور بالائی حصّے قبائلی علاقے میں چلا گیا جو وہابی مرکز سے بخط مستقیم (کوّے کی پرواز سے) تیس میل پر واقع تھا۔ وہاں سے اُس نے جو اطلاعات بھیجیں وہ اس ریاست کی تاریخ کی دوبارہ ترتیب میں بڑی گرانقدر ہیں جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔ اسی درمیان میں ریلی کو ایک اور اہم گواہ عبداللہ ساکن حاجی پور مل گیا جس نے

۱۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو راولپنڈی کے اسسٹنٹ کمشنر کے سامنے ایک بیان دیا جس کا پہلے ذکر ہو چکا اس بیان نے شمالی بہار خصوصاً ضلع ترہٹ میں جسے بقول ڈیلی اب تک پولیس افسروں نے ہاتھ نہیں لگایا اور جہاں سے معتد بہ رقوم ارسال کی گئیں، وہابی تنظیم کے متعلق قیمتی اطلاعات بہم پہنچائیں اور پنجاب وغیرہ میں بھی وہابی کارپردازوں کے بارے میں اطلاع مہیا کی۔

عبداللہ نے اور باتوں کے ساتھ یہ اظہار بھی دیا کہ احمد اللہ ساکن مظفر پور، ولایت علی کا ایک خلیفہ، ترہٹ کا ایک با اثر وہابی ہے۔ اور بارہ سو روپے سالانہ چندہ دیا کرتا ہے ضلع میں اس کے بہت سے مرید اور کارکن، مولا بخش اور حافظ جعفر علی ساکن محلہ بسود پور مظفر پور، مصطفیٰ علی ساکن دربھنگہ، عابد حسین ساکن موضع شیوہر (دربھنگہ) اور شیخ سبحان علی ساکن موضع تھنادر (دربھنگہ) وہ مقامی سردار ہیں جو باقاعدہ پابندی کے ساتھ مرکز پٹنہ کو روپے بھیجتے رہتے ہیں۔ مظفر پور اور شیر گھاٹی (گیا) کے روپے پیر محمد فراہم کرتا ہے۔ اُن کارپردازوں میں جو یہ رقوم سرحد کو پہنچاتے ہیں مولا بخش، احمد علی عظیم آبادی اور نظام الدین لکھنوی سب سے زیادہ معتبر اور تجربہ کار ہیں۔ عبدالحق ساکن سورج گڈھ (مونگیر) برادر عبدالغنی ایک اور معتمد کارپرداز ہیں۔

تحریک کے سرپرستوں میں امیر خاں اور زور آور خاں عظیم آبادی سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ اول الذکر کے چندے کی رقم بارہ سو روپے سالانہ ہے عبداللہ (میں) جب سرحد کو ہجرت کر رہا تھا تو امیر خاں نے اُسے (مجھے) سات ہزار روپے دیے تھے۔ تحریک کے زیادہ مہتم بالشان سرپرست نواب ٹونک ہیں سید احمد کے بھانجے محمد اسماعیل اور عبدالرحمٰن نواب ٹونک سے روپے لیتے اور سرحد کو چلا دیتے ہیں۔

اس سے پہلے مئی ۱۸۶۹ء میں حکومت پنجاب نے حکومت بنگال کو کمشنر راولپنڈی کی ایک چٹھی بھیجی تھی جس میں ایک شخص مسمّی فخر اللہ (فقیر اللہ ؟) کی گرفتاری کی خبر دی تھی جس پر وہابی کارکن ہونے کا شبہ تھا۔

پنجاب میں وہابی کارکنوں کی گرفتاری

عبداللہ کے بیان متذکرہ بالا میں پنجاب کے کارکنوں کا ذکر حسب ذیل ہے :-

فخر اللہ کی راولپنڈی میں گرفتاری کے بعد ایک اور کارکن عبدالعزیز کو ہدایت کی گئی کہ وہ روپوش ہو جائے، چنانچہ وہ دانا پور بھاگ گیا۔ مفتی حسین پشاوری اس کی جگہ لینے چلے گئے اور راولپنڈی میں لال کوٹھی میں رہنے لگے۔ وہاں ایک اور کارکن پکی مسجد کے امام علیم الدین تھے۔ ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ لال کوٹھی اور دوسرے مقامات سے تحصیل کردہ رقوم سرحد پار کے قاصدوں تک پہنچا دیں ان قاصدوں میں ایک مراد علی تھے جو ہزارہ کے ایک ویران قبرستان میں تارک الدنیا بن کر رہا کرتے۔ جہلم کا کارکن محمد نعمان تھا۔ وہ بھی روپے مراد علی ہی کی معرفت بھیجا کرتا۔ اس نے دین محمد عظیم آبادی سے دو کتابیں بھی صراط مستقیم و بلوغ المرام (مجموعۂ احادیث) طلب کی تھیں جس کی اس نے فوراً تعمیل کی۔

غلام شاہ حاجی کی گرفتاری

یہ ساری تفتیش جو ۱۸۶۹ء میں سارے ملک میں لگاتار چلتی رہیں، دوسرے سال بھی جاری رہیں۔ اوائل مارچ ۱۸۷۰ء میں سنتھال پرگنہ کے ڈپٹی کمشنر نے غلام شاہ حاجی کو آٹھ اور آدمیوں کے ساتھ جن پر وہابی ہونے کا شبہ تھا گرفتار کر لیا گیا۔ رپورٹ کی گئی تھی کہ غلام شاہ حاجی ساکی راج محل ابراہیم منڈل کی گرفتاری کے بعد سردار بننے میں کامیاب ہو گئے اور اپنا کام جاری کر لیا۔ کمشنر بھاگل پور نے حکومت کو یہ اطلاع دیتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس علاقے میں وہابیوں کی جدوجہد دوبارہ شروع ہو گئی ہے اور بہتر ہوگا کہ ریلی ایک بار پھر راج محل آئے۔ اس نے یہ اطلاع بھی دی کہ میں نے وڈ ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کر دی ہے کہ حکومت کی اس پالیسی کے مطابق کہ صرف سرداروں کو گرفتار کیا جائے اور چھوٹی چھوٹی گرفتاریوں اور تفتیشوں کے جال میں نہ الجھا جائے۔ صرف غلام شاہ کو گرفتار کرے اور باقی کو چھوڑ دے۔

ریلی کی راج محل کے وہابیوں کے متعلق رپورٹ

چنانچہ ریلی راج محل آیا اور رپورٹ دی "کہ اکتوبر ۱۸۶۸ء میں جب میں پچھلی بار اس حصہ ملک میں آیا تھا اس وقت سے اب میں ان مذہبی دیوانوں میں نمایاں تغیر پاتا ہوں۔ بے شبہ وہ اب بہت زیادہ دلیرانہ اقدامات کے لیے تیار ہیں۔" اس نے تشویش کے ساتھ دیکھا کہ جو لوگ فراہمی چندہ میں حصہ لیتے یا تحریک کے کام میں عام طور پر تعاون کرنے

میں شرکت نہ کریں اُن کے خلاف سماجی مقاطعہ کی دہشت ناک سزا موثر طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ سماجی مقاطعہ کی دھمکی جسے اُس نے حقہ پانی بند کی اصطلاح سے تعبیر کیا - جاہل دیہاتیوں میں تخویف کا ایک ہیبت ناک آلہ کار ہے۔ اور وہابی اس سے پورا کام لے رہے ہیں۔ بالخصوص غلام شاہ کے بارے میں ریلی نے لکھا کہ وہ پہلے کلکتہ کا باشندہ تھا۔ عبد الجبار کا مرید ہو گیا اور سترہ برس ہوئے کہ راج محل کے علاقے میں تعینات کیا گیا، جب سے وہ یہاں مقیم ہے، درزی کی دوکان کھول رکھی ہے۔ مگر در حقیقت وہ ابراہیم منڈل کے سب سے قابل نائبین میں سے ہے اور روپیہ تحصیل کرنے اور ہم عقیدہ بنانے میں اُس کی بڑی مدد کی ہے۔" ابراہیم منڈل کی گرفتاری کے بعد سے وہی مقامی سردار تھا۔ ابراہیم کا بھتیجا مولا بخش (جو غلام شاہ کے ساتھ گرفتار ہوا اور بعد میں کمشنر کے حکم سے رہا کر دیا گیا) ایک دوسرا اہم وہابی کار پرداز تھا۔ وہ صرف سنتھال پرگنہ میں سرگرم کارکن نہ تھا بلکہ ضلع مالدہ میں بغاوت کی تبلیغ کرتا تھا۔ ریلی نے نہ صرف غلام شاہ کے ضابطہ ۳ کے تحت گرفتار کرنے کی سفارش کی بلکہ مولا بخش کے دوبارہ گرفتار کر لینے پر بھی زور دیا۔

موضع ہنس پوکھر کے متعلق رپورٹ

ریلی مالدہ بھی گیا اور رپورٹ دی کہ اس ضلع کا موضع ہنس پوکھر بغاوت کا دوسرا سرگرم مرکز ہے۔ اُس نے یاد دلایا کہ ۱۸۶۵ء ہی میں اس گاؤں کے وہابیوں کی کارروائیوں کی طرف حکومت کی توجہ منعطف کی جا چکی ہے اب تک گاؤں کی مسجد میں جہاد کے لیے تحصیل جاری ہے۔ یہاں کے باشندے مرکز سرحد سے جہاں اس گاؤں سے رنگروٹوں کی بہت بڑی تعداد مقیم ہے کثرت سے مراسلت رکھتے ہیں۔ امانت منڈل مقامی سردار ہے۔ میرے خیال سے اس کی گرفتاری سے باغیانہ کارروائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔" اس نے ضابطہ ۳ کے تحت اس کی گرفتاری کی سفارش کی۔ اس نے لکھا میں چاہتا ہوں کہ عام باشندوں کی تنبیہ کے لیے اس گاؤں کو ایک نمونہ بنا دوں۔

مشتبہ وہابیوں کی نظر بندی

آیندہ چند مہینوں تک بہار اور بنگال میں اور بہت سے مشتبہ وہابیوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ مئی ۱۸۶۸ء میں لال محمد مقدمہ انبالہ کے ایک گواہ استغاثہ سے ایلی کو اطلاع ملی کہ تین آدمی شرف اللہ،

نظیر محمد ساکن موضع دھنارو ضلع رنگ پور اور نظیر محمد ساکن لوگرا جو سرحد پر وہابی رنگروٹوں کو فوجی تربیت دیتے تھے اور سرحد پر انگریزوں کے خلاف کئی معرکوں میں شریک رہے ہیں اب ہندوستان واپس آگئے ہیں اور اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ ریلی نے ان کے خلاف ضابطہ ۳ کے تحت گرفتاری کی درخواست کی، لیکن اس کو ہدایت کی گئی کہ ان لوگوں کے بیانات کسی مجسٹریٹ کے سامنے قلمبند کرائے اور اگر مجسٹریٹ سمجھے کہ ان کے خلاف بدیہی طور پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ جبھی اس کو ضروری کارروائی کرنا چاہیے۔

بکسر میں وہابیوں کے متعلق تحقیقات

ریلی کی توجہ بکسر اور اس کے مضافاتی علاقوں کی طرف بھی منعطف کی گئی۔ پہلے جب وہ مرتضیٰ کے ساتھ شمالی مغربی سرحد پر کام کر رہا تھا تو مرتضیٰ نے اسے خبر دی تھی کہ ضلع شاہ آباد وہابیوں کے بھرتی کے اہم ترین مرکزوں میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ اس علاقے کے رنگروٹ سرحد جایا کرتے اور وہاں وہابی سپاہ کی ناک (چیدہ جزو) بن جاتے۔ ریلی نے سوچا کہ تفتیش جو اب تک صرف پٹنہ اور دانا پور تک محدود رہی ہیں اُن کو صوبہ کے اور حصوں تک وسعت دی جائے اور جون ۱۸۶۸ء کو ایشری پرشاد کو بکسر جانے کی ہدایت کی۔

اب تحقیقات کا رُخ بکسر اور اس کے قریب بہت سے قریوں کی طرف ہوگیا جو ضلع غازی پور (یوپی) تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس گاؤں کا معائنہ کر کے ایشری پرشاد نے رپورٹ دی کہ سید احمدؒ اپنے سفر میں بہار سے گزرتے ہوئے اس علاقہ کے ایک گاؤں بڑا چوسا بھی پہنچے تھے، اس گاؤں میں پٹھانوں کے ۵۰۰ گھر ہیں اور مشرقی و مغربی دو نصف میں بٹا ہوا ہے ان میں سے ہر ایک چار چار بیٹوں میں منقسم ہے۔ مغربی پٹی کے باشندوں نے سید احمدؒ سے بیعت کی تھی۔ وہ صادق پور کے مولویوں کے پیرو ہیں اور اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں پابندی سے پٹنہ بھیجا کرتے ہیں۔ یہ اطلاع ایک لڑکے محمد علی خاں نے ایشری پرشاد کو پہنچائی۔ وہ مشرقی پٹی کا باشندہ ہے جہاں کے لوگ ایک دوسرے حریف حنفی مولوی احمد فصیح غازی پوری کے پیرو ہیں۔

محمد اسحاق کی مخبری

ایک اور نوجوان مخبر محمد اسحاق[1] ساکن موضع ڈہری تھانہ مسوڑھی ضلع
پٹنہ نے ایلشری پرشاد کو دو اور وہابی کارکنوں محمد عمر داناپوری و
مشرف علی داناپوری کے بارے میں خبر دی کہ یہ دونوں کارکن بہار کے مختلف حصوں سے چندے
کے روپے جمع کرتے ہیں۔ اس نے ایک کتاب بھی پیش کی جو اس کے قول کے مطابق محمد عمر کی
تھی اور جس میں پچھلے کئی سال سے تحصیل کردہ چندے کی تفصیلات درج تھیں۔ ابتدائی تحقیقا
سے ظاہر ہوا کہ مشرف علی کے خلاف کوئی زیادہ شہادت نہیں اور اس کے خلاف کوئی کاررو
نہ کی گئی۔ مگر محمد عمر کے گھر کی تلاشی لی گئی اور مختلف اشخاص نے اس کو جو خطوط لکھے تھے، اور
ان میں کچھ رجمنٹ ۴۳ کی پلٹنوں میں روڑکی اور نینی تال میں متعین سپاہی بھی شامل تھے۔
پکڑے گئے۔ ان کے کاتبوں نے عمر سے خواہش ظاہر کی تھی کہ ہمارے ان اعزا و متوسلین ک
جنہیں ہم ہندوستان میں چھوڑ جائیں امداد کی جائے یا ان کے سرحد جانے کے لیے مالی اع
کی جائے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو سرحد سے لوٹے تھے، راستے میں رُک جانا پڑا۔ اور مدد کے
طالب تھے۔ ان تمام خطوط نے اس اطلاع کو موثق کر دیا کہ پیر محمد کی گرفتاری کے بعد وہ
سردار تھا اور اسی لیے اُس سے مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ ۲۲ جولائی ۱۸۶۸ء کو محمد عمر
گرفتار کر لیا گیا حوالات میں ڈال دیا گیا اور حکومت ہند سے درخواست کی گئی کہ ضابطہ
۳ کے تحت اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا جائے۔ مگر حکومت بنگال نے ضا
۳ کے اجرا کے لیے وجوہ ناکافی سمجھیں اور حکومت ہند سے درخواست کرنے سے پہلے عم
کے متعلق مزید جزئیات طلب کیں۔

محمد عمر کی گرفتاری و رہائی

اس درمیان میں ریلی اور ایلشری پرشاد سے کہا گیا کہ مت
خطوط کے کاتبوں کا کھوج لگائیں۔ بعد میں حکام کو معلو
ہوا کہ محمد عمر، احمد علی کا بھانجا ہے جو ۱۸۶۵ء کی سازش پٹنہ کے سرکردہ منتظموں میں
سے تھا۔ اس تازہ اطلاع نے مزید سرکاری تحقیقات کی رفتار تیز کر دی۔ یہ پتا بھی چلا کہ عمر کی قرابت

---

[1] یہ مشرف علی کا بیٹا تھا جس کے خلاف اُس نے کسی سرکاری نوکری کی اُمید پر مخبری کی۔

اور بہت سے با اثر اشخاص سے تھی۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں عملی حصہ لیا تھا۔ مجسٹریٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چونکہ صوبہ کی قریب قریب تمام عدالتوں میں عمر کے قرابت مند موجود ہیں اس لیے اگر وہ مقید بھی کیا گیا تو اس کے خلاف شہادتوں کو تلف کرنے کے لیے زبر دست اثرات کام کرنے لگیں گے۔ وہ صرف ایک ہفتے کے لیے حوالات میں رکھا گیا تھا اور ایک عرصے سے یہ مدت تمام ہو چکی تھی۔ اب وہ ضابطہ ۳ کے اجراء کے بغیر مزید قید میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے مجسٹریٹ نے اُس کو ضمانت پر رہا کر دینا اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور اُس کے خلاف شہادتیں جمع کی جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ عمر کے کسی مزید ذکر کی غیر موجودگی سے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ضابطہ ۳ اس کے خلاف نافذ نہ ہوا۔

ہند میں وہابیوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاری

۱۸۷۰ء کے وسط تک سارے ہند میں اکثر ممتاز وہابی قائدین ڈھونڈ نکالے گئے اور گرفتار کر لیے گئے تھے۔ مگر باوجودیکہ ایک سال سے زیادہ عرصے تک زبردست تفتیشیں جاری رہیں، حکومت اب تک غیر متیقن تھی آیا اس کے قبضے میں جو شہادتیں ہیں وہ قانونی عدالت میں گرفتار شدہ قائدین کے خلاف چارہ جوئی کے لیے کافی ہیں اگرچہ زیادہ تر گرفتاریاں ۱۸۶۹ء میں عمل میں آئی تھیں اور اس وقت سے برابر اکثر قیدی قید رہے لیکن ۱۸۷۰ء کے وسط تک نہ اُن کو گرفتاری کی وجوہ کی اطلاع دی گئی نہ اُن پر کسی معین جرم کا الزام عائد کیا گیا۔ بیشتر قیدی "ادنیٰ" اوسط طبقے کے تھے جن کی معمولی مالی حالت نے اس غیر قانونی ایذا رسانی کو چیلنج کرنا ناممکن کر دیا تھا۔ مگر ان میں سے دو، امیر خاں اور حشمت داد خاں، اونچے سماجی رتبے اور مادی وسائل رکھتے تھے۔ انہوں نے اس جبر و ستم کو یونہی درگزر نہیں کر دیا۔ انہوں نے مسلسل و متواتر قانونی تنازعات میں حکومت کے کرتوت کو چیلنج کیا جس نے ان کے معاملے کو زمانہ کا "معرکۃ الآرا" مقدمہ بنا دیا۔

امیر خاں اور حشمت داد خاں کا حکومت سے مطالبہ

دونوں بھائی ایک میوات کے پٹھان خاندان کے ممتاز ارکان تھے جن کی جڑیں بابر کے عہد تک پہنچتی ہیں وہ عالم گنج پٹنہ سٹی کے[1]

---

[1] ان کے ہم جد اور اولاد و اخلاف ابھی تک محلہ پٹھان ٹولی عالم گنج پٹنہ سٹی میں موجود ہیں۔

باشندے تھے، کلکتہ میں چمڑے کی ایک چلتی ہوئی آڑھت کے مالک تھے اور جن کا سرمایہ دس لاکھ سے زائد کا ہوگا۔ دونوں پختہ عمر کے تھے۔ گرفتاری کے وقت امیر خاں پچپن سال کے اور حشمت داد خاں ۶۷ سال کے تھے اور دونوں امیرانہ معاشرت کے پروردہ اور خوگر دہ تھے۔ دونوں ایک سال سے زیادہ سخت ایذاؤں میں رکھے گئے۔ ان کی طویل مدت قید ان کی صحت کو متاثر کرنے کے علاوہ ان کے کاروبار کو بھی جس کا اب کوئی نگران نہ تھا غارت کر رہی تھی۔ اس زمانہ میں انہوں نے حکومت کو کئی عرضداشتیں بھیج کر گزارش کی کہ خواہ ان کو گرفتاری کی وجہ بتائی جائے یا جلد ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ مگر سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

امیر خاں اور حشمت داد خاں کے مقدمے کا آغاز

آخر اگست ۱۸۷۰ء میں قانون کی رو سے جو آخری علاج ان کے سامنے تھا اس کا سہارا لیا۔ انھوں نے کلکتہ ہائی کورٹ میں تحریک کی کہ عدالت اجرائے پروانہ کرے۔ اس وقت ہندوستان کے تین چوٹی کے بیرسٹر انیسٹی، انگرام اور ایوانس مستغیثوں کی طرف سے کھڑے ہوئے۔ حکومت کی نمائندگی ایڈوکیٹ جنرل گراہم اور مستقل مشیر حکومت پال نے کی۔ دعووں کی سماعت جسٹس نارمن کی عدالت میں ہوئی۔ پہلے امیر خاں کا دعوےٰ پیش ہوا لیکن چونکہ دونوں دعووں کے واقعات ایک سے تھے۔ ایک کے دعوے پر جو بحث کی گئی وہ دوسرے کے دعوے پر بھی صادق آتی تھی۔ بحثوں کی تفصیلات میں اور باتوں کے ساتھ اساسی سوال بھی اٹھایا کہ برطانوی رعایا مع ہندوستانی، کو بے قاعدہ گرفتاریوں سے آزادی کا وہی حق حاصل ہے جو انگلستان میں میگنا کارٹا، بل آف رائٹس اور پارلیمنٹ کے دوسرے پاس کردہ قوانین کے تحت انگلستان میں نافذ ہیں، اس سے ہم یہاں بحث نہیں کرتے۔ سائلوں کے بیرسٹروں کی بالخصوص انگرام کی بحثیں جو آج بھی کسی فرد کی مدافعت میں جذباتیت اور عصبیت سے پاک، فصاحت کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتی ہیں کچھ بھی کام نہ آئیں۔
۲۹ اگست کو فیصلہ ہوا اور اجرائے پروانہ نامنظور کر دیا گیا۔

جسٹس نارمن کے قتل کا واقعہ

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں جسٹس نارمن کے قتل کا ذکر کر دیا جائے جو لارڈ میو کے قتل کے مشہور افسانے کی طرح غلط طور پر وہابیوں کے سر تھوپا گیا تھا۔ امیر خاں کے مقدمے کے فیصلے کے اعلان کے ایک سال بعد نارمن پر حملہ وقوع میں آیا تھا۔ قاتل ایک پنجابی مسمّٰی عبداللہ تھا جس کا وہابیوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور سرکاری طور پر جسے پاگل قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا، امیر خاں کا مقدمہ اس وقت کا ایک مشہور و معروف مقدمہ تھا۔ اور حملہ اس کے اتنا بعد جلد واقع ہوا کہ حکام کے مخالف وہابی گروہ اور کچھ عام آدمیوں نے اس گندہ فعل کے ارتکاب میں وہابیوں کو ملوث کر دینے کا اچھا موقع تاک لیا۔

جس دوران میں اجرائے پروانہ کے مسئلہ کی سماعت جاری تھی، انگلستان کی ایک عدالت میں لارڈ میو گورنر جنرل اور لارڈ گرے لفٹنٹ گورنر کے خلاف مستغیثوں کی طرف سے ان کی ایذا رسانی اور جسمانی حملہ کے لیے ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ مگر خبر نہیں کہ اس کا کیا ہوا۔

جسٹس نارمن کے فیصلے کے اعلان کے فوراً بعد انیسٹی نے چیف جسٹس اور جسٹس مارکبی کی عدالت میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی درخواستیں دیں۔ چیف جسٹس نے درخواست قبول کرنے سے انکار کیا مگر اپیل کرنے والوں کو ہدایت کی کہ اگر مناسب سمجھیں تو عدالت کے دستور کے مطابق ان کو رجسٹرار کے دفتر میں داخل کریں۔ چونکہ ہائی کورٹ کا ایک جج مصروف ہوگا اس لیے اس نے اپیل کی کوئی قریب تاریخ مقرر کرنا بھی منظور نہ کیا۔

۱۴ر ستمبر کو انیسٹی نے جسٹس نارمن اور چیف جسٹس دونوں کے فیصلوں کے خلاف پریوی کانسل میں اپیل کی اجازت طلب کی۔ اسی تاریخ کو اسے بھی نامنظور کر دیا گیا۔ اس طرح حکومت اور ایک فرد کے درمیان قانونی کشتی کا پہلا دور ختم ہوا جو اندھا دھند گرفتاری سے آزادی کے ناقابل انقطاع حق کا مدعی تھا۔

امیر الدین اور ابراہیم منڈل کو سزائیں

ایک لحاظ سے امیر خاں کی مساعی کامیاب ہوئیں جن قیدیوں کے خلاف اتنے زمانے سے مقدمہ کے بغیر کارروائی رکی ہوئی تھی اس کو جلد انجام دینے کے لیے ان کوششوں نے

حکومت کو مجبور کر دیا۔ امیر الدین اور ابراہیم منڈل کے مقدمات کی سماعت پہلے شروع ہوئی۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں امیر الدین کا مقدمہ مالدہ میں اور ابراہیم منڈل کا راج محل میں مسموع ہوا۔ دونوں کو جزیرہ انڈمان میں عمر قید کی سزا دی گئی اور ان کی جائیدادوں کی ضبطی کا حکم صادر ہوا۔

امیر الدین مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہنچے۔ بعض رعائتیں جو جزیرہ کے قیدیوں کو دی گئی تھیں جن کا ذکر ہو چکا، وہ اب منسوخ کر دی گئی تھیں اور زیادہ سخت قاعدے نافذ کر دیے گئے تھے اس لیے بعد کے چند سال تک امیر الدین کو سخت سے سخت مصائب جھیلنا پڑے۔ بعد میں انھیں ایک مقامی مدرسے میں معلّم مقرر کر دیا گیا۔

۱۸۸۳ء میں اور وہابی قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی رہا کیا گیا۔ اپنے مولد شہر میں رہنے کی اجازت کی منظوری کے وقفے میں وہ عبدالرحیم کے ساتھ پٹنہ میں رہے۔ چند اور آدمیوں کی طرح مہینے میں ایک بار مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے حاضری دینا ہوتی تھی، اور پولیس کو اطلاع دیے بغیر کہیں باہر نہ جا سکتے تھے۔

اگرچہ ابراہیم منڈل کو بھی عمر قید کی سزا دی گئی تھی معلوم نہیں کہ وہ واقعی انڈمان بھیجے بھی گئے یا نہیں اس بارے میں جعفر کا بیان واضح نہیں۔ ایک مقام پر وہ ایک عام خیال ظاہر کرتے ہیں کہ امیر الدین تبارک علی اور ابراہیم سب گرفتار کیے گئے اور وہ انڈمان بھیج دیے گئے۔ مگر یہ واضح نہیں آیا "وہ" میں ابراہیم بھی شامل تھے۔ کیونکہ جعفر اگرچہ بعد میں پہلے دو کے جزیرے میں پہنچنے اور ۱۸۸۳ء میں ان کے رہا ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ابراہیم کا ذکر کہیں نہیں کرتے۔ ایک دوسرا مولف[1] لکھتا ہے کہ ابراہیم فی الواقع انڈمان نہیں بھیجے گئے۔ وہ ۱۸۷۸ء میں امیر خاں کے ساتھ رہا کر دیے گئے تھے اور اس صدی کے اوائل میں وفات پا گئے۔ یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

ملزمانِ پٹنہ کے مقدمہ کا آغاز

وہابی قائدین کے مقدمات کی سماعت کا دوسرا دور مارچ ۱۸۷۱ء میں پٹنہ میں شروع ہوا۔ اس میں سات آدمیوں کا چالان ہوا تھا جو تعزیرات ہند کی مختلف دفعات کے تحت ملزم قرار دیے

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تاریخ ۱۵۵

گئے تھے۔ ملزمین تبارک علی، پیر محمد، دین محمد، امیر الدین، امیر خاں، حشمت داد خاں اور مبارک علی تھے امیر خاں اور حشمت داد خاں پر تحریک کی مالی امداد کا جرم عائد کیا گیا۔ مبارک علی پر چندے کی رقوم کی تحصیل و ترسیل کا الزام لگایا گیا۔ ان کے بیٹے تبارک علی پر یہ الزام تھا کہ وہابی فوج کے ایک دستے کی انگریزوں کے خلاف معرکہ امبیلہ میں قیادت کی تھی۔ ان پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ فوجی تعلیم دیتے اور سرحد پر رنگروٹوں کو قواعد کراتے تھے۔ باقی تین پر باغیوں کی مختلف طریقوں سے اعانت کا الزام تھا۔

یہ ملزمین مختلف وقتوں میں اور مختلف جگہوں میں گرفتار کیے گئے تھے۔ ان میں سے بعض، جیسے مبارک علی کو وقفے کے دوران میں رہا کر دیا گیا۔ دوسرے ملزمین جلد جلد تمام صوبہ بنگال کے ایک جیل سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے تھے۔ لیکن بعض اور جیسے برادران خاں اور غالباً تبارک علی بھی جولائی ۱۸۶۹ء سے برابر قید رہے۔ لیکن سماعت مقدمہ کے وقت وہ سب اکٹھے حاضر کیے جاتے تھے۔ اور مبارک علی کو بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

وہابیوں کے املاک کی ضبطی اور سزائیں

تجویز سزا کی کارروائیاں ڈی ایم بارہر جائینٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں منعقد ہوئیں۔ ۲۷ مارچ کے سارے ملزمین کو عدالت سشن کے سپرد کیا گیا۔ پرنسپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہوئی جو ۲۹ مئی ۱۸۷۱ء کو شروع ہوئی، سماعت کے دوران میں سارے ملک سے بلا کر لائے جانے والے ایک سو سے زیادہ گواہوں کے اظہار لیے گئے۔ سماعت وقفوں کے ساتھ ۱۹ جولائی ۱۸۰۱ء تک جاری رہی۔ اینسٹے اور انگرام نے جو اجرائے پروانہ کے مسئلہ کی سماعتوں میں برادران خاں کی طرف سے وکالت کر چکے تھے اس مقدمہ میں بھی ان کی نمائندگی کی۔

سارے ملزمین کو وہی ٹکی بندھی سزائیں عمر قید در جزیرۂ انڈمان اور تمام جائیدادوں کی ضبطی[1] سنائی گئیں بہ استثنائے حشمت داد خاں جو رہا کر دیے گئے۔ کیونکہ ان کے خلاف کوئی

---

[1] ان کی قیمتی جائیدادیں جن میں کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ کی شاندار عمارت بھی تھی فروخت کر دی گئیں اور املاک جن کی مالیت لاکھوں لاکھ کی تھی ضبط کر لی گئیں۔

بدیہی شہادت نہ ملی اور مقدمہ قائم نہ کیا جا سکا۔ پیر محمد بعد میں ہائی کورٹ سے اپیل پر رہا ہوئے۔

امیر خاں و حشمت داد خاں کا انتقال

امیر خاں کی عمر اب ۸۰ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ان کی جان توڑ کوششوں سے ان کو انڈمان نہ بھیجا گیا۔ نو برس سے زیادہ جیل کاٹنے کے بعد نومبر ۱۸۷۸ء میں گورنر جنرل لارڈ لٹن کی سفارش سے رہا کیے گئے۔ رہائی کے جلد ہی بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بھائی حشمت داد خاں نے کچھ پہلے ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔ دونوں پٹنہ میں مدفون ہیں۔ مبارک علی مقدمہ کے دوران شدید زدوکوب کے نتیجے میں فوت ہو گئے۔ باقی قیدی انڈمان بھیج دیے گئے۔ تبارک علی امیر الدین کے ساتھ مارچ ۱۸۶۳ء میں وہاں پہنچے۔ کئی سال سخت مصائب جھیلنے کے بعد وہ اسٹیشن محرر مقرر کیے گئے۔ ۱۸۸۳ء میں عام معافی کے وقت رہا کیے گئے، اور عبدالرحیم کے ہمراہ پٹنہ واپس آئے۔

یہ تھا انجام وہابیوں کے خلاف کارروائیوں کے آخری دور کا۔ وہابی سربراہوں کو گرفتار کر کے اُن کو انڈمان کی دُور افتادہ قیدیوں کی نوآبادی میں طویل المیعاد سزائے قید دے کر اور ان کی مادی املاک کو ضبط کر کے تحریک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے حکومت کے بس میں جو کچھ بھی تھا سب کر گزری۔ مگر سید احمد نے جو شعلہ روشن کیا تھا وہ بالکل نہ بجھا سطح کے نیچے نیچے چنگاری سلگتی رہی اور کبھی کبھی شرارے بھڑک اُٹھتے۔

۱۸۷۵ء: وہابی بھوپال اور رنگون میں

بہار میں پرنس آف ویلز کی آمد کے وقت حکومت کو وہابیوں سے کچھ گڑبڑ پھیلانے کا اندیشہ ہوا۔ ان کے موجودہ تنظیمی مرکزوں اور کارروائیوں کی تحقیقات کی گئی۔ ایشری پرشاد نے دسمبر ۱۸۷۵ء میں ذیل کی خفیہ رپورٹ تیار کی۔

اس نے ظاہر کیا کہ "اس ملک میں وہابیوں کی کارروائیوں کے تین مرکز ہیں جو پٹنہ بھوپال اور رنگون میں واقع ہیں۔ ان میں سے پہلا مرکز مقامی وہابیوں کی گرفتاریوں اور قید و بند سے بہت کمزور ہو گیا ہے اس لیے انہوں نے اپنی جدوجہد وسیع تر خطوں میں پھیلا دی ہے۔ پٹنہ میں دو مستعد کارکن ولایت علی کے بیٹے محمد حسن اور عبداللہ ہیں۔ آخر الذکر نے افغانی قومیت اختیار کر لی ہے۔ اول الذکر کے ایک بیٹے کے بارے میں رپورٹ

کی گئی کہ وہ لارڈ میو کے قتل کے وقت انڈمان گیا اور اس پر ارتکاب قتل میں ملوث ہونے کا شبہ کیا گیا[1] دوسرے کارکن عبداللہ کی گنڈری پٹنہ سٹی میں پھلوں کی دوکان ہے۔ مگر یہ محض نمائش ہے۔ وہ قیمتی موتی کی فروخت کے بہانے سے مختلف دیسی ریاستوں کا چکر لگاتا پھرتا ہے مگر اس کا اصل مقصد ریاستوں سے چندہ جمع کرنا ہے۔ پٹنہ کے مرکز سے بہت ملتا جلتا سورج گڈھ کا مرکز ہے جو نذیر حسین کی جائے پیدائش ہے۔ یہ اب بھی ہندوستان میں وہابیوں کا ایک ممتاز قائد سمجھا جاتا ہے اور "مدار المہام کہلاتا ہے۔"

دوسرا مرکز بھوپال تھا جس کے سردار منشی جمال الدین تھے جنھوں نے بھوپال کی ایک سابقہ بیگم سے شادی کر لی تھی۔ وہاں دوسرے ممتاز وہابی صادق حسن، عبدالجبار، عبدالرحمٰن اور علی کریم تھے۔ آخرالذکر شخص خاص طور پر ایک بے باک و بے اصول کردار تھا۔

تیسرا مرکز رنگون تھا۔ وہاں کے وہابیوں کی بھوپال کے مرکز سے کثرت مراسلت تھی۔ محمد حسین کے ایک بیٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں بھی گیا تھا[2]

۱۸۸۲ء: وہابیوں کی جدوجہد شاہ آباد میں

۱۸۸۱ء میں بہار کا ضلع شاہ آباد وہابی اثر کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے بہت نمایاں ہوا۔ وہاں کے سربراہ ابراہیم ولد حکیم عبدالعلی تھے، جو غدر کے زمانے میں آرہ کی عدالت میں ناظر فوجداری تھے۔ ابراہیم کے بڑے بھائی علی نے ۱۸۵۷ء کی شورش میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ بعد میں وہ گرفتار ہوئے اور موت کی سزا کا فیصلہ ہوا۔ ناظر کی حیثیت سے باپ پر فرض عائد ہوتا تھا کہ بیٹے کی پھانسی کے انتظامات کرے اس لیے انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اس

---

[1] لارڈ میو کے قتل میں ملوث نہ تھے (اوپر دیکھیے) یہ خیال غالباً ایلشری پرشاد کے وہابیوں کو قتل میں ملوث کرنے کی دھن کا نتیجہ ہے۔

[2] غالباً یہ بیان غلط ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں محمد حسن کے کسی بیٹے کے وہاں جانے کی اصلیت معلوم نہیں ہوتی۔

کے کچھ ہی عرصے کے بعد کچھ جائیداد غیر منقولہ جس کی سالانہ آمدنی تین ہزار تھی، چھوڑ کر انتقال کیا۔

کلکتہ پولیس کی وہابیوں کے متعلق رپورٹ

کلکتہ پولیس کی رپورٹوں سے[1] ۱۸۸۰ء میں ابراہیم کی جدوجہد کا حال معلوم ہوتا ہے ان میں سے ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۸۰ء میں ڈھاکا کے ایک شخص بدیع الزماں نے ممتاز وہابیوں کا ایک جلسہ کرنے کی کوشش کی تھی جس میں نذیر حسین دہلوی بھی شامل کیے گئے تھے۔ چونکہ وہ پولیس کے زیر نگرانی تھے۔ نذیر حسین نے دہلی میں جلسہ کرنے سے اختلاف کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کوئی دُور دراز کا اندرونی قصبہ منتخب کرنے کی رائے دی۔ ابراہیم نے مشورہ دیا کہ یہ جلسہ مظفر پور کے قریب ایک گاؤں تاجپور میں منعقد کیا جائے۔ جلسے میں کوئی تیس ہزار وہابی مولوی جمع ہوئے۔ جلسے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بغاوت پھیلانے کے لیے حکمت عملی تیار کی جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ مختلف فرقہ وارانہ اغراض کے لیے چندے فراہم کیے جائیں۔ دہلی، پٹنہ اور آرہ میں مدرسے کھولے جائیں جن میں وہابی عقائد کی تعلیم دی جائے۔ تقسیم کے لیے کتابیں اور رسالے چھاپے جائیں۔ چندے کے لیے مطبوعہ اپیلیں جلسے میں تقسیم کی گئیں اور دوسری جگہوں میں شائع کی گئیں۔" رپورٹ کے بیان کے مطابق "اپیل کی پذیرائی بہت حوصلہ افزا ہوئی۔ اور غریب طبقوں نے بھی جیسے درزیوں، دھوبیوں اور سقوں نے بھی مستعدی سے چندے دیے کئی مولویوں کو جو حاضر تھے رسالے دیے گئے اور ان سے تبلیغی دوروں کے لیے نکلنے کو کہا گیا ابراہیم نے کلکتہ، دہلی، لکھنؤ، غازی پور، بنارس وغیرہ کے دورے کیے اور ان جگہوں میں تقریریں کیں۔"

وہابیوں کے خفیہ اجلاس پر پولیس کا چھاپہ

اس کے بعد کی ایک پولیس رپورٹ[2] میں کمشنر پٹنہ کو اطلاع دی گئی کہ ممتاز وہابیوں کا ایک اور جلسہ سراج گنج میں منعقد ہوا، جہاں

---

[1] کلکتہ پولیس کی خفیہ اطلاعات سے ملخص، جو ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ لیمبرٹ نے کمشنر پٹنہ کو بھیجی تھیں۔ دیکھیے میمو نمبر ۶۵۲ مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۸۱ء۔

[2] ایضاً میمو نمبر ۱۴۶۳ مورخہ ۵ مئی ۱۸۸۱ء۔

نذیر حسین بھی اپنی بھانجی کی شادی کی شرکت کے بہانے سے گئے ہوئے تھے۔ اس تقریب نے وہابیوں کے اجتماع کے لیے ایک آسان حیلہ مہیا کر دیا۔ سربر آوردہ حاضرین میں نذیر حسین، محمد حسین لاہوری اور ابراہیم آردی تھے۔ جلسہ کے بانی و مہتمم ابراہیم تھے اور مقصد یہ تھا کہ ان کا تعاون حاصل کیا جائے اور اس ملک کے دار الحرب ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ سرحد پر وہابی ریاست کا ہندوستان سے رابطہ اور اعانت نسبتاً بہت کمزور پڑ گئی ہے۔ ہندوستان سے مزید رضاکاروں اور امداد کی ترسیل کی کوششیں کرنا چاہئیں۔ خفیہ اجلاس کی خبر حکام کو ملی اور مجسٹریٹ مولویوں کو اچانک جالینے کے لیے جھپٹے لیکن اس جگہ نہ کوئی قابل مواخذہ چیز دستیاب ہوئی نہ کوئی گرفتار کیا جا سکا۔

ابراہیم آردی کی تبلیغی مہم

جولائی ۱۸۸۱ء میں پی نولن سپرنٹنڈنٹ پولیس پٹنہ نے کمشنر کو رپورٹ کی کہ[1] ابراہیم نے اپنے کلکتہ کے ایک دورے میں تبلیغ کی ہے کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو جائے اور یہ کہ کسی غیر سرکاری تشغل میں آدھے معاوضے پر کام کرنا حکومت کے ماتحت اس قسم کے کام پر دوگنے معاوضے پر کام کرنے سے بہتر ہے۔ نولن نے ابراہیم کی تقریر کے بعض خاص خطرناک پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ ابراہیم نے احتجاج، شورش، مقدمہ بازی، فراہمی چندہ، سرکاری ملازمین کو استعفا کی ترغیب واغوا، اس طور پر کہ فوجی سپاہیوں پر اثر انداز ہوں، کے تمام طریقے استعمال کیے۔ نولن نے مزید اظہار رائے کیا کہ ابراہیم یقیناً ایسا آدمی معلوم ہوتا ہے جس پر نگرانی رکھنا چاہیے۔ اس نے یہ رپورٹ بھی کی کہ ابراہیم ایک طور کا آمدنی ٹیکس روپے میں ایک پیسہ لگا کر روپے جمع کر رہا ہے۔ بیگم بھوپال اس فنڈ میں چندہ دہندگان میں نمایاں حصہ لیتی

---

[1] کلکتہ پولیس کی خفیہ اطلاعات سے ملحق، جو ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ لیمبرٹ نے کمشنر پٹنہ کو بھیجی تھیں۔ دیکھیے میمو ۶۵۳ مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۸۱ء

تھیں جو بظاہر جمع تو کیا جاتا تھا ایک دیوانی مقدمہ[1] میں مالی اعانت کے لیے جس میں ضلع آرہ کے وہابی اُلجھے ہوئے تھے مگر دراصل یہ ستھانہ کے مذہبی دیوانوں کے لیے مقصود تھا۔

متذکرہ بالا بیانات سے ظاہر ہے کہ ۱۸۶۸ء تک وہی طریق کار جاری تھا جو برادران علی یا ان سے بھی پہلے شروع کیا گیا تھا۔ ابھی تک رنگروٹ جمع کرنے، روپے فراہم کرتے اور سپاہیوں کو ورغلانے پر زور دیا جاتا تھا۔ تنظیم کی عظیم ترتیبی و تادیبی طاقت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے اگرچہ پے درپے منزلوں سے پرانے ڈھانچے میں سے بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا پھر بھی بے جھجک پرانے طریق عمل پر کام ہوتا تھا۔

ابراہیم آردی کے خلاف تحقیقات

دوسرے سال بھی ابراہیم کے خلاف تحقیقات جاری تھی۔ پولیس انسپکٹروں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس شاہ آباد کو ان کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ بھیجی جس میں خبر دی کہ محمد عمر کی طرح ابراہیم کے تعلقات بھی اعلیٰ درجے کے ہیں اور طاقتور اور ذی اثر رشتہ داروں سے مربوط ہیں۔ شادیوں کے ذریعہ سے ان کا رابطہ خاندان صادق پور سے بھی ہے۔ وہ عبدالعزیز ساکن رحیم آباد ضلع دربھنگہ، عظمت حسین مختار کلکتہ (عبدالرحیم کے بھائی) عبدالرؤف، لطیف حسین اور اُن کے بھائی عبدالغفور (عبدالغفار) ساکن مہداوان کی شمولیت سے روپے کی تحصیل میں مشغول ہیں۔ اس سال جو روپے جمع ہوئے ان کی میزان دس ہزار سے زائد ہے۔ اس کی تقسیم ابراہیم نے کی مگر معلوم نہ ہوا کہ انہوں نے اس کو جمع کہاں کیا۔ ان تحصیل کردہ رقوم میں سے بہت قلیل حصہ مدرسہ اور دوسرے ظاہر کردہ رقوم میں سے بہت قلیل حصہ مدرسہ اور دوسرے ظاہر کردہ مدات پر صرف ہوا۔ باقی رقم کثیر غیر محسوب

---

[1] اس کا تعلق آرہ کے سنیوں (حنفیوں) اور وہابیوں کے درمیان عام مسجد میں نمازوں میں آمین بالجہر سے تھا۔ یہ سنیوں (حنفیوں) اور وہابیوں کے درمیان نہایت بے حقیقت و بامبالغہ اختلافات میں ایک ہے اور اکثر جھگڑوں اور بلووں کا باعث ہوا ہے۔ مذکورہ مقدمہ میں سنیوں (حنفیوں) کو عدالت زیریں میں کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن وہابیوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کی تھی۔ [2] مہداوان پٹنہ اور داناپور کے درمیان شارع عام پر ایک گاؤں ہے۔ خاندان صادق پور کی ایک شاخ (الٰہی بخش کے اسلاف) پہلے مہداوان کے باشندے تھے۔

اور نا مندرج رہی کیونکہ غالباً سرحد کو بھیج دی گئی۔

وہابی تحریک کے خلاف مؤثر کارروائی آخر میں رپورٹ میں دکھایا گیا کہ وہابی بالعموم ۷۱-۱۸۷۰ء میں اور اس سے پہلے ۶۵-۱۸۶۳ء میں اپنے سربراہوں کی سزایابی سے سخت تنگ حال ہیں لیکن ان سزاؤں کے خلاف اندر اندر سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ مزید متنبہ کیا گیا کہ جب کبھی ان کو طاقت ہو جائے تو یہ بے چینی حکومت کے خلاف پھوٹ پڑ سکتی ہے۔

گذشتہ صدی کے آخری عشرہ میں یہ بات ہندوستان میں وہابیوں کی صورت حال کا صحیح اندازہ تھا۔ حکومت کی زبردست پولیس کی تنظیم کا بے رحمانہ نشانہ بن کر اور پے درپے سزاؤں اور اخراج ملک کی ضربوں سے بے دست وپا ہو کر وہابی بالعموم بے ضرر مفلوج ہو گئے اور ان کے پیرووں کی عام جماعت بے شک بہت کمزور اور مجبور ہو گئی۔ پھر بھی پچھلی نصف صدی میں انھوں نے جو کچھ کیا تھا اُس کا اثر یہ تھا کہ حکومت ۱۸۷۰ء سے بہت عرصہ بعد تک اس کمزور جماعت سے خائف رہی۔ یہ وہ تاریخ ہے جو عموماً ہندوستان میں وہابیوں کی کش مکش کے اختتام کی نشان دہ سمجھی جاتی ہے۔

سرحد پہ وہابی ریاست ۱۹۰۲-۱۸۶۳ء **آخوند سوات** : معرکہ امبیلہ (۱۸۶۳ء) کے بعد زیادہ تر وہابی عبداللہ کی سرکردگی میں دریائے برندو کے شمال چاگرزئی ملک میں جا رہے۔ آخوند سے ان کے تعلقات اب تک مخلصانہ تھے، اُس علاقے میں ان کے قیام کے لیے اُس نے کچھ انتظامات کر دیے۔ کچھ عرصے کے بعد وہابیوں نے چاگرزئیوں سے دو گاؤں ٹنگور اور بٹورا کی بستیاں حاصل کر لیں اور ۱۸۶۸ء کے آغاز تک امن امان سے وہاں ٹھہرے رہے۔ لیکن وہاں وہ بعض ہمسایہ قبائل کی پوشیدہ عداوت کے سائے میں بسر کرتے تھے۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب اخوند سوات اور علاقہ کے ایک دوسرے روحانی اقتدار والے کوٹھا[1] کے مُلا کے مابین اختلاف رائے

[1] سید امیر معروف بہ کوٹھا ملا سوات اور بنیر کے علاقوں میں ایک با اثر پیر تھا۔ کوٹھا یوسف زئی علاقے میں جنوبی مغربی گوشے میں واقع ہے۔

اور کشیدگی تھا۔ یہ ملا کبھی سید احمد کے رفقا میں سے تھا اور اب تک اس کے پیرو کھلم کھلا وہابی کہہ کر ہی پکارے جاتے تھے۔ یہ نام ایک قسم کا مذہبی دشنام ہو گیا تھا۔ وہابیوں کے ساتھ آخوند کے تعاون میں کچھ ذہنی قیود داخل تھیں۔ وہ کوٹھا ملا کا کھلم کھلا مخالف تھا، کیونکہ ملا کوٹھا اور سوات ہی کے علاقوں میں خاصا اثر اور اتباع حاصل تھا۔ آخوند کو اپنے حریف کے بڑھتے ہوئے اثر سے اندیشہ رہتا تھا۔ مگر علاقہ کے سیدھے سادے اور بے تعصب مسلمانوں میں وہابیت کا داغ کوٹھا ملا پر ضرب لگانے کے لیے ایک آسان ڈنڈا بن گیا اور اس کے متبعین وہابی کی حیثیت سے مبغوض و مردود قرار دیے گئے۔ آخوند کے متبعین کی نظروں میں ہندوستانی زیادہ مشتبہ تھے۔ وہ اب بھی ایک ایسی طاقت کی نمایندگی کرتے تھے جس کی بنا سید احمد نے ڈالی تھی۔ علاوہ بریں وہ ایک مسلح اور تربیت یافتہ جماعت تھی جو اس کے حریف کوٹھا کے ملا کے لیے طاقت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی۔

وہابیوں کا زیج کٹا سے اخراج

اس زمانے میں بعض حالات اور آخوند کی پوشیدہ عداوت نے وہابیوں کو بعض ایسے اقدام کے لیے مجبور کر دیا جس نے آخوند کو زیادہ مشتبہ کر دیا۔ اب تک وہ چگارزئی علاقے میں رہتے رہے لیکن مقامی لوگوں نے پناہ دینے اور سامان مہیا کرنے کے معاوضے میں ان پر اتنے لگان لگائے اور سخت محاصل ادا کرنے پر مجبور کیا کہ ان کی زندگی بہت دشوار ہو گئی۔ چگارزئیوں پر آخوند نے دباؤ بھی ڈالا کہ وہابیوں کو نکال باہر کریں کیونکہ عبداللہ اور ان کے متبعین کو ان کے درمیان ننگو بنا دیا گیا۔ ان حالات میں وہابیوں نے نیر میں زیج کٹا کے عظیم خاں کی اس علاقے میں منتقلی اور سکونت کی پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ چنانچہ وہابی بٹورا کو ترک کر کے زیج کٹا کو منتقل ہو گئے۔ جہاں شاہزادہ فیروز شاہ ان سے آملا۔ اس جماعت کی نیر میں آمد کو جب آخوند اپنا ذاتی اثر تصور کرتا تھا۔ اور ساتھ ہی اس حقیقت کو کہ ان کا سرپرست عظیم خاں ملا کوٹھا کا زبردست حامی تھا آخوند نے اپنے اثر کے لیے صاف خطرہ تصور کیا۔ اس نے جرگا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ہندوستانیوں کو نیر سے خارج کر دے۔ اپنے آپ کو اقلیت میں پاکر ہندوستانی عظیم خاں کے ساتھ زیج کٹا کو چھوڑ کر اپنے قدیم مرکز ملکا کو لوٹ گئے جہاں انھوں نے اپنے قدیم متروک مکانات اور

استحکامات کی از سر نو تعمیر شروع کر دی۔ اس کے کچھ ہی بعد عبد اللہ آخوند سے ملے اور غلط فہمیوں کو دور کر دیا اور ہندوستانیوں کے بج کٹا واپس آنے کے لیے اُس کی رضا حاصل کر لی۔ لیکن وہاں زیادہ عرصے تک اُن کو رہنا نصیب نہ ہوا۔ عظیم خاں اور مقرب خاں کو اس کی غصب کردہ ملکیت واپس دلانے کے لیے کچھ بنیر کے قبائل اور امزئیوں کی ایک لیگ قائم کرنے کی کوشش کی۔ عبد اللہ کو بھی اس گٹھ جوڑ میں شریک ہونے کی ترغیب دی گئی۔ ستمبر ۱۸۶۳ء میں اخوند نے اپنے متبعین کو جمع کیا بج کٹا کے سامنے آکھڑا ہوا اور ہندوستانیوں کو اس جگہ سے فوراً نکل جانے کا مطالبہ کیا۔ پہلے انہوں نے مدافعت کا ارادہ کیا اور حملہ آور گروہ سے کچھ گولیاں چلانے کا مبادلہ بھی ہوا۔ مگر عظیم خاں نے انخلا پر راضی ہو جانے کی صلاح دی دوسرے ہی روز انخلا شروع ہو گیا۔ عورتیں اور بچے آگے بھیج دیے گئے اور عقبی صفیں پچاس ساٹھ دالُفلوں سے مسلح مردوں پر مشتمل تھیں۔ جب یہ نارکین ٹبورا اور بج کٹا کے درمیان ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہے تھے آخوند کے متبعین نے دھوکے سے اُن پر حملہ کر دیا۔ صدر دستے نے جس میں عظیم خاں اور عبد اللہ تھے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ورے سے گزر گئے مگر عقبی دستہ شجاعانہ مقابلے کے بعد بالکل کٹ مرا۔

وہابیوں کا بلوسی میں قیام

اس آویزش کے بعد ہندوستانی کچھ عرصہ تک چگارزئی کے علاقہ گولیما بورسی میں ٹھہرے جہاں امزائی قبیلہ والوں اور چگارزئی کے ایک طبقے نے ان سے آخوند کے مزید دباؤ کے خلاف اعانت کا وعدہ کیا۔ مگر اخوند کی طاقت اپنے حریف پر فتح یابی سے اور بڑھ چکی تھی۔ اُس نے چگارزئیوں پر زور دیا کہ ہندوستانیوں کو اپنے علاقے سے بھی نکال دیں۔ اس لیے وہابی پھر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نکلے۔ دریائے سندھ کے داہنے کنارے پر بہار[1] میں کچھ دن قیام کیا، پھر ۱۸۶۸ء کے اواخر میں جُدبائی پہنچے۔ ٹکاری[2] کے سردار نے اُن سے امداد کا وعدہ کیا، اپنے قلعہ میں پناہ اور وادی میں کچھ زمین پیش کی۔ تھاکوٹ کے سردار الائی جرگے نے بھی انگریزوں کے خلاف مدافعت کے اقدامات پر ان سے صلاح مشورے

---

[1] یہ ہندوستان کا صوبہ بہار نہیں (مترجم)

[2] ایک ٹکاری بہار ضلع گیا میں ہے۔ یہ وہ نہیں (مترجم)

کیے۔ لیکن حکام بھی ان جنگی تیاریوں پر نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ یہ حلیف اپنے اجتماع سے قوت پیدا کریں۔ میجر جنرل وائلڈ ۶۹-۱۸۶۸ء میں اچانک اُن پر آن پڑا۔ اور حلیف پھرتی سے منتشر ہو گئے۔ تب ہندوستانی پلوسی میں جو دریائے سندھ کے پار کے حسن زائیوں کا ایک گاؤں تھا جا رہے۔ ہندوستانیوں کے آفات میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنے کا لامتناہی سلسلہ یہاں ختم ہوا۔ اس وقت سے ایک کافی طویل مدت تک پلوسی وہابیوں کا مرکز رہا۔

وہابی نو آبادی

وہابی نو آبادی کی ریاست کا مفصل بیان، ان کی حربی طاقت کی ساخت اور تعداد اور آخوند کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیں ڈیلی کی بعض رپورٹوں سے معلوم ہوتے ہیں جو اُس نے اُس وقت بھیجی تھیں جب وہ متذکرہ بالا امور کی تفتیش کے لیے سرحد گیا تھا۔ اُس نے رپورٹ کی تھی کہ ہندوستانیوں کی جماعت جو تین سو قابل محاربہ افراد پر مشتمل ہے۔ دریائے سندھ کے پار بہار میں رہتی ہے اس کے خاص سربراہ عبداللہ کے علاوہ فیاض علی برادر احمد اللہ اور عبداللہ کے تین بیٹے امان اللہ، مطیع اللہ اور عبدالقدوس ہیں۔ ایک اور دقیع شخص اسحاق برادر مقصود علی اس وقت مکہ میں تھے ان کو اپنے رفقاء کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنے کی ترغیب کی کوششیں کی گئیں۔ محارب فوج آٹھ دستوں میں منقسم ہے، ہر ایک دستہ ایک جمعدار کے زیر کمان ہے اور وہ یہ ہیں: مالدہ کے رجب اور دیانت اللہ، حکیم پور کا عبدالغفور رامپور بولیہ کے معین الدین اور شریعت اللہ، جیسور کا نورالدین، عظیم گڑھ کا محمد اکبر اور زینۃ اللہ۔ محاربین یا سپاہیوں کی تعداد ۳۶۳ ہے جن میں ۷۵ آرہ اور غازیپور سے آئے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کی تعداد ستر ہے۔ ان کے پاس ۷، ۲ گھوڑے اور ۲۷ خچر ہیں جو بلوآہ میں رکھے جاتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ان کے پاس دو چھوٹی توپیں، ٹوپیوں والی گزدار بندوقیں اور سنگینیں ہیں اور ان کے لیے ٹوپیاں بھی بہم پہنچائی ہیں۔ مگر ان میں امداد کے رُک جانے سے عام بدحالی پھیلی ہوئی ہے۔"

ڈیلی کی رپورٹ کے مطابق اس صورت حال نے عبداللہ کے کچھ متبعین کو وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن عبداللہ نے ان کو متنبہ کر دیا ہے کہ ان میں سے جو اب واپس آئیں گے ان کے لیے زنداں اور پھانسی ہے۔ ڈیلی نے سفارش کی کہ اگر یہ اعلان کر دیا جائے تو بہت مناسب ہوگا کہ فیاض علی اور عبداللہ کے سوا جو لوگ واپس آئیں ان کو معاف کر دیا جائے گا۔ اس تدبیر

سے عبداللہ کے آدمیوں میں غداری کی لہر دوڑ جائے گی، وہ تنہا رہ جائے گا اور غالباً مکہ کو ہجرت کر جائے گا۔"

حسن زئیوں کی وہابیوں کو پیشکش

آخر میں ریلی نے اپنی رپورٹ میں مزید لکھا کہ حسن زئیوں نے ہندوستانیوں کو آباد ہونے کے لیے اراضی کی پیش کش کے ساتھ دعوت دی ہے۔ بیمار میں عبداللہ کی علالت کے سبب سے اس دعوت کے ایجاب میں کچھ تاخیر واقع ہو گئی ہے۔ ریلی کہتا ہے کوئی شک نہیں کہ صحتیاب ہوتے ہی وہ ہمارے خلاف لڑنا شروع کر دیں گے۔ ریلی کو تعجب ہوتا ہے کہ اس حقیقت کے لیے ثبوت ڈھونڈا جا رہا ہے کہ یہ مذہبی دیوانے ملکہ (وکٹوریہ) سے برسرِ جنگ ہیں۔ وہ تو انگریزوں کے خلاف برابر مصروف پیکار رہے ہیں۔ ان کا علانیہ مقصد انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنا ہے اور ان کا رویہ دائمی مخاصمت رہا ہے (ریلی نے یہ اس وقت لکھا تھا جب وہ مالدہ اور پٹنہ کے مقدمات سے متعلق تفتیش میں مصروف تھا)

فیض اللہ کی وہابیوں کے متعلق رپورٹ

ریلی نے اپنی رپورٹ کے ساتھ ایک شخص فیض اللہ کی رپورٹ بھی منسلک کی تھی۔ اس شخص کو ایبٹ آباد کے ڈپٹی کمشنر نے ہندوستانیوں پہ نگاہ رکھنے پر متعین کیا تھا۔ اس کے روزنامچے کا خلاصہ دسمبر ۱۸۶۸ء سے اپریل ۱۸۶۹ء تک پر حاوی ہے۔ اس سے ہندوستانیوں کے خلاف اخوند کی مخاصمت ظاہر ہوتی ہے جس کا کچھ ذکر اوپر ہو چکا۔

۳۰ مارچ ۱۸۶۹ء کے ذیل میں فیض اللہ کی رپورٹ ہے کہ فیاض علی نے اعلان کر دیا ہے کہ اگر اس کے بھائی احمداللہ اور یحییٰ علی جو انڈمان میں قید ہیں رہا کر دیے جائیں اور ان کو پٹنہ واپس آنے کی اجازت دی جائے، اور اگر اسلام پور کے ابراہیم منڈل کو بھی جو اس وقت قید میں ہے رہا کر دیا جائے تو وہ اپنے تین سو متبعین کے ساتھ جنگ ترک کر کے مکہ چلے جائیں گے اور ان کے سفر مکہ کے اخراجات حکومت کو ادا کرنا پڑیں گے۔ اس اطلاع میں ریلی نے ابراہیم منڈل کے خلاف توجہ دلائی کہ وہ نمایاں طور پر وہابیوں میں ایک اہم شخصیت تھا اور اس کی گرفتاری عبداللہ کے لیے ایک شدید ضرب ہے۔ چنانچہ اس نے حکومت پر زور دیا کہ عبداللہ کو چھوڑ کر ان کے باقی متزلزل متبعین کو وطن واپس آنے کی اجازت دے۔

وہابیوں کا حکومت سے مطالبہ

یہ سوال کہ حکومت سرحد پر بعض وہابیوں کی بہتیہ تجویز کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کرے۔ ۱۸۷۲ء میں پھر اُٹھا، جب کہ حکومت کو آلہی بخش، برادر مقصود علی ساکن سورج گڑھ اور محمد حسن ولد ولایت علی کی کچھ تجویزیں سرحد کے کچھ وہابیوں کو وطن کی مراجعت کے بارے میں وصول ہوئیں۔ حکومت کو بہت شک تھا آیا یہ دونوں اشخاص سرحد کے وہابیوں کی واقعی نمائندگی کرتے ہیں، یہ درحقیقت ہتھیار ڈالنے کی پیش کش نہ تھی۔ بلکہ وہ حکومت سے کچھ ضمانتیں چاہتے تھے جن میں مزاحمت کے بعد انتقامی کارروائیوں سے براءت بھی داخل تھی۔ مجسٹریٹ نے خیال کیا کہ اگرچہ وہابی اب کوئی قابل اعتنا جماعت نہیں رہی لیکن سرحد پر ان کا وجود ایک بڑی آفت ہے جو جاہل اور متعصب مسلمانوں کے دماغوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس نے حکومت سے خواہش ظاہر کی کہ جو لوگ مراجعت قبول کریں ان کو غیر مشروط معافی دے دے۔ لیکن کمشنر کو حکومت کے وقار کا زیادہ خیال تھا وہ غیر مشروط معافی کے حق میں نہ تھا۔ اس نے دو شرطیں پیش کرنے کی رائے دی۔ ایک یہ کہ صرف وہی نہیں جو آنا چاہیں بلکہ سارے کے سارے وہابی مع قائدین واپس آجائیں اور دوسری یہ کہ جو واپس آئیں وہ بعض مقررہ علاقوں میں پولیس کی نگرانی میں رہیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا کہ چونکہ حکومت کو وہابیوں کی طرف سے اب تک ہتھیار ڈالنے کی کوئی باقاعدہ پیشکش وصول نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے یہ ساری بحث قبل از وقت ہے اور یہ حکومت کا کام نہیں کہ ایسے امور میں پہل کرے۔

الیشری پرشاد کی مخالفت

الیشری پرشاد نے بھی وہابیوں اور ان کو معافی دینے کے موضوع پر کمشنر کے لیے ایک لمبی چوڑی یادداشت تیار کی۔ اس نے اس قوی پہلو پر زور دیا کہ "مجاہدین ایسے ملک میں ہیں جہاں سے وہ رزق حاصل نہیں کر سکتے۔ لامحالہ ان کو اسی ملک کی مالی اعانت پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ جب تک سرحد کا مرکز باقی رہے گا وہاں کے قائدین ہندوستانی وہابیوں کو باغیانہ کارروائیوں پر اُکساتے رہیں گے۔ عام طور پر مانا جاتا تھا کہ کچھ مدت تک سید احمد کے ظہور ثانی کا انتظار کرنے کے بعد وہابی حوصلہ کھو بیٹھیں گے اور خود واپس آجائیں گے۔ مگر اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ وہ دوسرا امام بھی منتخب کر

سکتے ہیں ۔ آخوند سوات سرحد میں ایک معزز و موقر شخص ہے ۔ وہابیوں کا سردار عبداللہ بھی سرحد میں ایک متقی بزرگ کی حیثیت سے معروف و مشہور ہے وہ اخوند کی محبت حاصل کر لے سکتا ہے جو ایک بوڑھا آدمی لب گور ہے اور اس کی جانشینی کی کوشش کر سکتا ہے ۔ اس صورت میں پٹھانوں کی ایک کثیر تعداد کی اطاعت حاصل کر لے سکتا اور ان کو حکومت کے خلاف کارروائیوں میں استعمال کر سکتا ہے[1] ۔ عبداللہ کے وہابی ہونے کی بنا پر الیشری پرشاد نے اس امکان کو ردّ کر دیا کہ وہ اخوند کی جانشینی کے لیے کھڑا ہو گا ۔ کیونکہ اخوند خود ایک گوجر اور شاید ذات کا ہندو ہے ۔ اس لیے الیشری پرشاد نے یہ زیادہ مناسب قرار دیا کہ تمام وہابیوں کو شرم اور ذلت سروں پر لادے ہوئے وطن واپس آنے دیا جائے ۔ خود ان کی مراجعت ان کی شخصیتوں پر سے کلاہ افتخار و وقار اتار لے گی اور ان کے مقصد کے بودے پن کو فاش کر دے گی ۔

امیر عبداللہ

بہرحال ان قبل از وقت مباحث کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔ وہابی قائدین خصوصاً عبداللہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ایک مقصد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں ۔ عبداللہ نے حکومت کے ساتھ طویل اور زوردار آویزشوں میں مسلسل مصیبتیں اور ناکامیاں برداشت کی تھیں ۔ ممکن نہ تھا کہ آخر لمحے میں ان کے قدم ڈگمگا جائیں ۔ وہابیوں نے اپنی کشتیاں جلا دی تھیں اور حکومت سے اجازت مراجعت کی درخواست کا کوئی سوال ہی نہ تھا ۔ دوسری طرف حکومت اس معاملہ میں پہل کرنا نہ چاہتی تھی کیونکہ یہ اس کے وقار کے خلاف متصور تھا ۔ اس کے علاوہ حکومت یہ بھی نہ چاہتی تھی کہ کچھ معمولی سپاہیوں اور شاگرد پیشوں کو مراجعت کی اجازت دے دے اور سربراہوں کو سرحد ہی پر رہنے دے ۔ اس سے

---

[1] یہ تصور دلچسپی سے خالی نہیں کہ الیشری پرشاد نے جس امکان کا ذکر کیا ہے وہ فی الواقع واقع ہو جاتا ۔ یہ امر کہ الیشری پرشاد کا تصور محض وہم نہ تھا اس واقعہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ عبداللہ ذاتی طور پر ایک بار آخوند سے ملے تھے اور وہابیوں کے متعلق تمام شبہات رفع کر دینے میں کامیاب ہوئے تھے ۔

حکومت کے خیال میں زخم میں مواد فاسد بھرتا جاتا تھا۔

پلوسی میں نسبتاً طویل المدت قیام نے وہابیوں کو اپنے منتشر و پراگندہ وسائل کو دوبارہ مجتمع کرنے کی مہلت دے دی جس کی سخت ضرورت تھی۔ پچھلے دس سال میں اکثر قبائل نے زیادہ تر آخوند کے مخاصمانہ اثر کے تحت ان کو بہت پریشان رکھا تھا۔ اس صورت حال نے اور مضر نتائج سے قطع نظر، ان کی زوال پذیر صفوں میں مزید شگاف پیدا کرنا شروع کر دیا وہ شکایت کرنے لگے کہ انھوں نے اپنے گھر بار قبائلیوں سے نہیں بلکہ انگریزوں سے لڑنے کو چھوڑے تھے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ لڑائیاں وہ اپنی مرضی سے نہیں لڑے بلکہ یہ قلیل اور شجاع جماعت بالکل تنگ نظرانہ فرقہ وارانہ اختلافات کا شکار ہو گئی جنھوں نے اس کے عظیم مقصد کو ڈبو کر رکھ دیا۔

یہ ہندوستانی جماعت اب تک ایک بڑی صلاحیتوں والی محارب طاقت تھی اب بھی وہ ہمسایہ قبائل سے زیادہ مسلح تھی۔ اس حقیقت نے اس کے افضل علم و دانش کے ساتھ رل مل کر اسے بہت حد تک اثر بخش دیا تھا۔ چالاک قبائلی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ عبداللہ قبائلیوں کے ساتھ ان افسوسناک خانہ جنگیوں کو ختم کر دینے اور اپنے متبعین کو اصلی مگر عارضی طور پر ترک کیے ہوئے مقصد عظیم کی راہ پر واپس لانے کے لیے سخت جدوجہد کر رہے تھے۔

کوہ سیاہ کی مہمات میں وہابیوں کا کردار

بعد میں ۸۸-۱۸۸۱ء میں انگریزی فوجوں کی کوہ سیاہ والی مہموں میں وہابیوں نے نمایاں کردار ادا کیے۔ اس زمانے میں کئی جھڑپوں میں وہ بڑی بہادری اور جوش سے لڑے۔ مگر ان جھڑپوں میں ان کا کردار نمایاں طور پر ثانوی تھا۔ وہ زیادہ تر مظلوم قبائلیوں کے حلیف کی حیثیت سے نظر آئے۔ وہ ایک ایسی کمزور جماعت ہو گئے تھے کہ انگریزوں کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن اس پر بھی وہ ایک مضمحل مگر جوشِ آزادی کے ایک زندہ نمونہ تھے۔ اپنے ہندوستانی ہموطنوں کے دلوں میں مردہ امیدوں میں جان ڈالنے کے علاوہ نیم آزاد قبائلی علاقوں میں انگریزوں کے اثر کے نفوذ

کے خلاف مدافعت کی گاڑی میں ایک مضبوط دھرا ثابت ہوئے۔ اب بھی اُن میں یہ صلاحیت باقی تھی کہ قبائلیوں میں انگریزوں کے خلاف مستقل جذبے کو منظم کر کے ایک متحد اور زبردست تحریک کی شکل دے دیں، اسی لیے آگے بڑھتی ہوئی انگریزی فوجوں کے جارحانہ حملوں کا بار بار شکار وہی ہوتے تھے اور اُس زمانہ میں ان کا طرزِ مقابلہ مدافعانہ ہوتا تھا۔

امیر عبداللہ کی فیروز شاہ سے درخواست

کوہ سیاہ کی چوتھی مہم ۱۸۹۱ء کے بعد حسن زئی کو بھی مجبور کیا گیا کہ ہندوستانیوں کو اپنے علاقے سے خارج کر دیں۔ عبداللہ کے لیے یہ سخت مصیبت کا زمانہ تھا۔ دوسرے قبائل سے کچھ اراضی پٹے پر دینے کی درخواست کی تاکہ ان کے لوگ اپنی ایک بستی بسا سکیں مگر انگریزوں کے دباؤ سے یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ آخر میں عبداللہ نے اپنے پرانے سرپرست اور حامی فیروز شاہ ولد مبارک شاہ سے درخواست کی کہ وہ اپنا ایک گاؤں تلوائی آباد کرنے کے لیے دیدے۔ کچھ تامل کے بعد اس نے یہ درخواست منظور کر لی۔ مرکز میں جماعت کا یہ غیر مستقل وجود ۱۹۰۱ء میں عبداللہ کی رحلت تک باقی رہا۔

امیر عبداللہ کی عظیم قیادت

ان کی قیادت کی مدت چالیس سال سے زیادہ تھی۔ ان کی قیادت کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ نمایاں طور پر غزوۂ امبیلہ کے دوران وقوع پذیر ہوا۔ لیکن ان کی ہمت، استقلال اور قیادت کی اصل آزمائش اس کے بعد ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب وہ پیہم مصائب اور قبائلیوں کی مخاصمت کے سلسلہ لامتناہی میں جکڑے ہوئے تھے، اور یہ کسی شخص کے ایمان کے ڈانواں ڈول کر دینے کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ مگر ان کی زبردست قوت ارادی میں کبھی نرمی نہ آئی اُنھوں نے قبولِ اطاعت کی ہر تجویز یا وہم کو بھی سختی سے ٹھکرا دیا۔ قوت ارادی میں دوئی سے ادنیٰ ضعف جو ان کے بعض متبعین میں تھوڑی دیر کے لیے بھی ظاہر ہو جاتا اُس کا موثر طور پر مقابلہ کرتے اور دفع کر دیتے۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبدالکریم سردار منتخب ہوئے۔ ان کے عہد (۱۹۰۲ء) میں مرکز اسمست میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ برنڈو ندی کے کنارے ایک زرخیز گاؤں تھا۔ اس وقت تک ہندوستان سے ہر قسم کا فائدہ بخش تعلق منقطع ہو چکا تھا اور مرکز (ہر چند اب بھی موجود ہے) مقامی سیاسی ماحول میں مدغم ہو گیا۔

باب ۱۰

وہابی تحریک کا جائزہ

(۱) وہابی تحریک کی نوعیت

وہابی تحریک کا آغاز تو ایک سماجی مذہبی جذبہ کے تحت ہوا تھا لیکن جلد ہی اس نے خصوصاً براوران علی کی قیادت میں اور بعد میں سیاسی رُخ لے لیا - بعد میں بعض بندۂ غرض مصنفوں نے پوشیدہ اغراض سے اس کے مذہبی پہلو کے دکھانے میں بالقصد مبالغہ اور غلو سے کام لیا۔ اس تحریک کے متعلق جو غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ خالص مذہبی تحریک تھی اور خالصتہً سکھوں کے خلاف چلائی گئی تھی - یہ اُس کی تمام تاریخ کے درخت کو حد سے زیادہ کاٹ چھانٹ کر ننگا کر دینا ہی نہیں بلکہ اُس کے اصلی اغراض و مقاصد کا جان بوجھ کر حلیہ بگاڑ دینا ہے۔

وہابی انگریزوں کے خلاف جو لڑائیاں لڑے ان میں سے بعض کا بیان اوپر کیا گیا - یہ بھی دکھایا جا چکا کہ جب سکھوں کا وجود ایک سیاسی وحدت کی حیثیت سے ختم ہو چکا تھا اس کے بعد بھی مدت دراز تک ان کی حربی کشمکش جاری رہی، اگو یہ بھی صحیح ہے کہ سید احمد کے حین حیات میں سرحد شمالی مغربی کو بنیاد عمل منتخب کر لیا گیا تھا اور پہلا دور سکھوں ہی کے خلاف پیکار سے شروع ہوا تھا۔

عقیدۂ ہجرت کی توضیح

ان دونوں پہلوؤں کو کماحقہ سمجھنے کے لیے اسلامی عقیدۂ ہجرت کی مختصراً توضیح ضروری ہے۔ یہ لازمی شرط قرار دیتا ہے کہ اگر کسی ملک پر جو پہلے اسلامی حکومت میں ہو کوئی غیر مسلم طاقت مسلّط ہو جائے یا جب وہاں کے اندرونی حالات ایسے ہو جائیں کہ احکام شریعت کی پیروی ناممکن ہو جائے تو ایسے ملک کے رہنے والے مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ کسی اسلامی ملک میں یا جہاں ان کے مذہبی حقوق میں کوئی مداخلت نہ ہو ہجرت کر جائیں۔ اول الذکر قسم کے ملک کو دارالحرب اور دوسری قسم کو دارالاسلام کہتے ہیں دارالحرب میں اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جنگ کرنا بھی مسلمان کا فرض ہے۔ یہ جنگ کسی امام کی رہنمائی اور سربراہی میں ہونا چاہیے اور اُسے اعلیٰ روحانی اور انتظامی قابلیتوں کا آدمی ہونا چاہیے۔ ہندوستانی علماء کے ایک طبقے نے بہت دقیق اور پیچیدہ مباحث کھڑے کیے ہیں۔ آیا ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا جا سکتا ہے اور آیا ایک امام کی صحیح اہلیتیں کیا ہونا چاہئیں۔ ان جھگڑوں میں اُلجھے بغیر اتنا بتا دینا بہتر ہو گا کہ سید احمد نے اپنے ضمیر کی روشنی میں محسوس کیا کہ انگریزوں کے برسرِ اقتدار ہو جانے اور پھر ہندوستان کے آزادی سے محروم ہو جانے کے بعد یہ ملک دارالاسلام باقی نہ رہا۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے فرض سمجھ لیا کہ وہ کسی آزاد علاقے میں جو انگریزوں کے احاطۂ اقتدار سے باہر ہو ہجرت کر جائیں اور وہاں سے جہاد شروع کریں۔ اس نتیجے پر پہنچ کر سید احمد کے لیے ایسے مناسب مرکز کا انتخاب کرنا رہ گیا تھا۔

ہندوستان اس وقت تک بہت حد تک یا تو انگریزوں کے براہِ راست قبضے میں آ چکا تھا یا مقامی ریاستوں کے زیرِ حکومت تھا، جو ذیلی اتحادات کے لیے ایک جال کے بندھن میں بندھی ہوئی انگریزوں سے وابستہ اور زیرِ نگیں تھیں وہ معدودۂ چند ریاستیں بھی جو انگریزوں کے زیرِ اثر نہ تھیں کسی طور سے بھی ان کی مخالفت سے خائف رہتی تھیں۔

شمالی مغربی سرحد کو مرکز بنانے کی وجہ

شمالی مغربی سرحد ہی ایک علاقہ تھا جو اُس وقت تک انگریزوں کے اثر سے باہر تھا۔ یہاں کے لوگ اپنی جنگجوئی اور آزادی کی محبت کے لیے مشہور تھے۔ وہ سکھوں کے

متشددانہ نیم فوجی تسلط سے پیچ و تاب کھا رہے تھے ۔ وہ کسی شخص سے بھی ہاتھ ملانے کو تیار تھے جو ان کو آزادی کی راہ پر لانے کی معقول امید دلا سکے ۔ اس علاقے کی ہیئت کذائی بھی ایسی تھی کہ سید احمد اپنے پیچھے کسی مخالفانہ کارروائی کے خطرے سے محفوظ تھے ۔ اس کے پیچھے بعض ریاستوں کا بلامداخلت غیرے ایک محفوظ خطہ تھا جس کے سرداروں سے وہ کئی سال سے مراسلہ و مرابطہ کر چکے تھے اور اپنا مقصد عظیم ان پر واضح کر چکے تھے ، اور جنوب اور مشرق کی طرف اپنی مجوزہ پیش قدمی کی صورت میں وہ بلوچستان ، بہاول پور اور سندھ کی ریاستوں سے جو ان کے مجوزہ راستے میں پڑتی تھیں ، دوستانہ تعاون کی امید رکھ سکتے تھے ۔

وہابی تحریک کا بنیادی مقصد

سید احمد کا سرحد کو مرکز منتخب کرنا زیادہ تر انہیں خیالات کے زیر اثر تھا ۔ لیکن اس انتخاب سے ناگزیر ہو گیا کہ پہلی جھڑپ سکھوں سے ہو جن کا علاقہ سید احمد کی مشرق کی طرف پیش قدمی میں پڑتا تھا ۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہابیوں کو انگریزوں کے خلاف سکھوں سے مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کرنا تھا ، لیکن کسی فریق نے یہ سیاسی پختگی نہیں دکھائی ۔ اس کے برخلاف سکھ انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ کر چکے تھے ۔ سکھوں سے تصادم ایک ناگہانی واقعہ تھا اور اس سے تحریک کا اصل مقصد ظاہر نہیں ہوتا ۔ یہ انگریزوں کے ساتھ طاقت کی آزمائش ابتدائی قدم تھا ۔ کیونکہ خود سید احمد کی تحریر اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ان کے دماغ میں یہ خیال رچا ہوا تھا کہ ان کے اصل دشمن "سوداگر اور بنیے" (انگریز) ہیں ۔

سید احمد نے اپنے مکتوب میں بار بار اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ ان میں سے بعض کے اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں ۔ سید احمد سکندر جاہ حیدر آباد کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "مشیت ایزدی سے ہندوستانی مشرکین اور یورپی کفار نے کئی معزز و موقر لوگوں کی زمینوں پر تغلب و تصرف کر لیا ہے ۔ اہل علم و اہل صدق کی شان اور وقار کو خاک میں ملا دیا ہے ۔" ایک اور خط میں دولت راؤ سندھیا کے بہنوئی ایک ہندو راؤ کو لکھا ہے "دور دراز ممالک کے اجنبی ملکوں کے حکمران بن گئے ہیں اور سوداگر اور بنیوں نے سلطنت کا درجہ حاصل کر لیا ہے ۔" ایک اور مکتوب میں "میرا اصل مقصد جہاد قائم کرنا اور جنگ کو

ہندوستان لے جانا ہے، خراسان کی سرزمین میں پڑا رہنا نہیں۔" شاہ اسماعیل نے جو کمان میں سید احمد کے دوسرے نمبر پر تھے تحریک کے اصل مقاصد کے متعلق چند سوالات کے جواب میں زیادہ وضاحت سے تشریح کی ہے۔ میر شاہ علی کے جواب میں لکھتے ہیں" ہماری طاقت رنجیت سنگھ اور کمپنی کے برابر تو نہیں مگر یہ تم سے کس نے کہا کہ امام کا ارادہ اس چھوٹی سی فوج کے ساتھ لاہور اور کلکتہ کی طرف پیش قدمی کرنے کا ہے؟ اس کے برعکس وہ دن رات مسلم فوج کی تکثیر و ترقی میں مصروف ہیں ....." یہ اقتباسات اپنی دلیل آپ ہیں اور کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ سید احمد کے مکتوب کے طومار میں ہندوؤں کی طرف کوئی معاندانہ اشارہ یا کوئی ایسا حوالہ جس سے اس تحریک کا ہندوؤں کے من حیث ہندو ہونے کے خلاف ہونا ظاہر ہو۔ اس کے برخلاف اُن کا ایک معنی خیز مکتوب ایک با اثر ہندو سردار ہندو راؤ گوالیار کے نام ہے جس میں اُسے یقین دلایا ہے کہ جب انگریزوں کو شکست ہو جائے گی تو کچھ شرائط کے ساتھ ہندو حکمران سرداروں کے اختیارات بحال کر دیے جائیں گے۔ سید احمد نے لکھا تھا" جوں ہی ارض ہندوستان غیر ملکی دشمنوں سے پاک ہو جائے اور اہل ہند کی جدوجہد سے ان کا مقصد حاصل ہو جائے، ریاست اور منتظمہ کے عہدے اور ملازمتیں مستحقین کو دے دی جائیں گی اور ان کی طاقت اور اختیارات کی بنیاد مستحکم ہو جائے گی۔" سید احمد نے اس کو مزید فہمائش کی کہ ان رضاکاروں کے خاندان کی نگرانی کرے اور مدد دے جو ان کے ساتھ سرحد کو ہجرت کر کے آ گئے ہیں۔ سید احمد کا ہندو راؤ کو متذکرہ یقین دہانی ہی نہیں بلکہ ٹھوس امداد کا مطالبہ نہایت معنی خیز اور غور طلب ہے۔

متعدد ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ وہابیوں نے جو چندے جاری کیے تھے ان میں ہندوؤں نے بھی شرکت کی رہنا تسیک نے بمبئی کے ایک جلسے کے واقعے پر تعجب کا اظہار کیا ہے "جس میں ایک وہابی مقرر کے سامعین میں زیادہ تر ہندو تھے اور مقرر نے عیسائی مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا[1]

---

[1] جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ صفحہ ۳۶۳

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سرحد کو روپے بھیجنے کا نہایت رازدارانہ اور خطرناک کام اُن ساہوکاروں کی معرفت ہوتا تھا جن میں بہت سے ہندو تھے۔

وہابی تحریک کا دینی پہلو

ان تمام باتوں کے معنی تحریک کے دینی پہلو سے چشم پوشی نہیں ۔ در حقیقت تحریک کی بڑی کمانی کم سے کم سید احمد کے جلبن حیات میں دینی تھی ، مگر مذہبی پہلو کا منشا قوم کی حیات ملی سے بعض سماجی مذہبی برائیوں کی اصلاح تھا نہ کہ دوسرے فرقوں کے خلاف مذہبی تعصب کے بیج بونا ۔ سید احمد غیر خدا کے پرستار اور منافق وریاکار مسلمانوں کی مذمت میں بہت بے باک تھے ۔ حقیقتہً سکھوں کی مخالفت سے زیادہ وہ ایسے مسلمانوں کی مخالفت پر زیادہ صرف کرتے تھے ۔ امت مسلمہ میں سماجی مذہبی اصلاحات کی ضرورت کا پرچار اسی لیے کیا جاتا تھا کہ اسے آنے والی سیاسی کش مکش کےلیے قوی تر اور لائق تر بنایا جائے ۔ جیمس اوکنیلی ، سر سید اور ان کے بعد کچھ اوروں نے اس کے مذہبی پہلو کی نشان دہی میں (جو کھلی چیز ہے) ہی نہیں بلکہ پوری تحریک کو مذہبی اور صرف سکھوں کے خلاف قرار دینے میں غلطی کی ہے ۔ ایسی رائے قائم کرنا جرح و دلائل کے مقابلے میں تحریک کی پوری تاریخ سے آنکھیں بند کر لینا ہے ۔

وہابی تحریک کے متعلق ہنٹر کا نظریہ

وہابی تحریک کی تاریخ کی ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی اصلی غرض و غایت کی غلط ترجمانی کرنے والے صرف ہنٹر اور دوسرے یورپی مصنفین جیسے نقاد ہی نہیں بلکہ بہت سے ہندوستانی بھی ہیں اور زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ خود اس کے کچھ متبعین بھی ہیں ۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ تحریک کے سب سے پہلے اور سب سے بسیط حالات لکھنے والا اور شائع کرنے والا ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر تھا ۔ اُس نے لکھا کہ بعض سیاسی اقتصادی اسباب کی بنا پر سارے مسلمان من حیث مسلمان حکومت (برطانوی) کے مخالف ہیں ، یہ خیال اُس کی کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے " ہمارے ہندوستانی مسلمان ۔ آیا وہ ایمان سے ملکہ کے خلاف بغاوت کے لیے مجبور ہیں ؟ " وہابی تحریک کی تاریخ کی جدید تدوین اور بالخصوص

اس کے طرز تنظیم کے سمجھنے میں ہنٹر کی تحریر بے شک بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اس نے اپنے غور و فکر سے تحریک کی علت غائی مخالفت انگریز ہونے کا جو نتیجہ نکالا ہے وہ ہے تو بالکل ٹھیک مگر اس موضوع پر اس کے عام طرز بیاں میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس نے تحریک کے فرقہ وارانہ پہلو پر مبالغہ کے ساتھ زور دیا ہے۔ اس نے ہر بات کو ہندو مسلم فرقہ وارانہ تصادم اغراض سے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں اس نے تحریک کے زیادہ وسیع سیاسی مذہبی پس منظر سے اغماض کیا ہے۔

ہنٹر کے استدلال سے مسلمانوں کے ماتھے پر مخالفت حکومت کا جو ٹیکہ لگتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقے نے بڑا مان کر اس کی تردید کی۔ اس طبقے کے لکھنے والوں نے حکومت کی وفاداری کے بلند بانگ اعلانات میں نگارشات کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے اور وہابی تعلیمات کی تردید میں وہابیوں کو مسلمان ماننے سے بھی انکار کیا ہے، اس کی مقدار اتنی ہے اور صاف طور پر ایسی فدویانہ و غلامانہ ہے کہ یہاں تفصیل سے اس پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ خود ہنٹر[1] اس بلند بانگ اعلان وفاداری کے متعلق مشتبہ ہوگیا۔

ہنٹر کے نظریہ کی تردید

ہندوستانی مسلمانوں کے اور زیادہ ذمہ دار طبقے نے بھی ہنٹر کے نظریہ کی تردید کی۔ ان میں سر سید احمد خاں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اور ہنٹر کی کتاب پر ان کا تبصرہ و تنقید اس طبقے کی تحریرات کا اعلیٰ نمونہ ہے انہوں نے یہ تنقید ہنٹر[2] کے دعاوی کی صاف صاف تردید میں لکھی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ وہابی نہ انگریزوں کے خلاف ہیں نہ حکومت کے۔ انہوں نے اس نکتے پر زور دیا کہ وہابی تحریک خالصتہً سکھوں کے خلاف چلائی گئی تھی۔ تحریک پر ان کی بعض رائیں قابل توجہ ہیں۔ شاہ اسماعیل کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ اس مبلغ نے اپنی تمام زندگی میں ایک لفظ بھی ایسا

---

[1] آور انڈین مسلمان صفحہ ۱۴۲ [2] یہ تنقید جو علیحدہ شائع کی گئی ہے۔ وہ گراہم کی "سر سید احمد کی زندگی اور کارناموں" میں ۱۸۸۵ء لندن میں دوبارہ مفصل شائع کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۵ تا ۲۴۴۔ یہ اقتباسات اسی سے ماخوذ ہیں۔

نہیں نکالا جسے اس کے ہم مشربوں کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے سے تعبیر کیا جا سکے۔" ایک اور مقام پر انہوں نے کہا تھا کہ "انگریزی حکومت میں مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔" برادران علی کے متعلق انہوں نے لکھا کہ ولایت علی اور عنایت علی اور ان کے ادنیٰ متبعین نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے مترشح ہو کہ انہوں نے ہندوستان میں انگریزی طاقت کے خلاف کوئی سازش کی ہو۔ آخر میں انہوں نے نتیجہ نکالا کہ وہابی جہاد جسے ہمارے مؤلف (ہنٹر) نے انگریزوں کے خلاف ظاہر کیا ہے دراصل صرف سکھوں پر فتح یابی کے لیے مقصود تھا۔"

سرسید احمد خاں کا طرزِ اصلاح

مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی احیا میں سرسید کی خدمات رہنمائی اتنی مسلم ہیں کہ یہاں ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہابی تحریک کے سیاسی پہلو کے متعلق ان کا نظریہ حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر ہم قوم میں مغربی خیالات کی نشر و اشاعت کرنے اور تعلیم عامہ کے لیے ان کی جد و جہد کے پس منظر میں اس موضوع پر ان کے نظریوں کو دیکھیں تو ہم ان کی توجیہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ انہوں نے ایک نیا مکتب فکر پیش کیا جس نے ثابت کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل مغربی خیالات سے کنارہ کش رہنے یا مخالفت کرنے میں نہیں بلکہ ان خیالات کے اپنانے اور اپنے آپ کو ان کے مطابق کر لینے میں مضمر ہے۔ انگریزی حکومت اور مغربی خیالات کے خلاف کسی سیاسی تحریک کا اجرا و قیام ان کے مکتب فکر سے متضاد تھا اسی لیے انہیں اس تحریک کی نوعیت کی یہ عجیب تاویل و تعبیر کرنا پڑی اس کے ساتھ ہی بعض نہایت ضروری سماجی مذہبی اصلاحات جاری کرنے کے لیے وہابیوں کی مساعی سے ہمدردی اور تحسین کا احساس بھی اس تنقید کے اکثر حصوں میں صاف نمایاں ہے۔

حریف سکھ تھے یا انگریز؟

مصنفوں کے ایک گروہ میں خود کچھ وہابی بھی ہیں جنہوں نے معلوم اسباب کی بنا پر یہی لنگڑی لولی تاویل پیش کی ہے ان میں سب سے پہلے جعفر تھانیسری تھے۔ اپنی تصنیف کے آخری حصے میں انہوں نے سید احمد کے کوئی ۵۹ مکتوبات کا متن اور بعض اور اصحاب جیسے شاہ اسماعیل کی تحریر شائع کی۔ واضح رہے کہ سید احمد کے مکتوبات کے کئی اور مجموعے بھی موجود تھے اگرچہ یہ سب مخطوطات تھے اور آسانی سے دستیاب نہ تھے۔ ان کے مطبوعہ نسخے سہل الحصول تھے، اور تحریک کے ایک سرکردہ

رکن کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر کی حیثیت سے اس کی بڑی قدرومنزلت تھی۔ مطبوعہ مکتوبات کی اصلیت بلاتاخیر مان لی گئی تھی یہاں تک کہ فی الحال محفوظ نسخوں سے مقابلہ کیا گیا[۱] اور یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ بعض مکتوبات میں کئی دقیق تبدیل الفاظ اور دوسرے تصرفات کیے گئے ہیں[۲]۔ یہ ترمیمات یا تصرفات ایسے ہیں کہ بعض بنیادی باتوں میں پورے مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔

واقعات کے متعلق عمداً تحریف

جعفر کے اس طریق کار پہ یہ عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تالیف ایسے وقت میں شائع ہوئی جب انگریز پوری طاقت سے برسر اقتدار آچکے تھے اور ان کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنا تھی لیکن وہ ان مکتوبات کی اشاعت سے قطعی احتراز کر کے اپنے ضمیر کو سلامت رکھ سکتے تھے۔ الفاظ میں عمداً تحریف کر کے وہ واقعات کے توڑ مروڑ یا غلط بیانی اور تحریک کی ضرر رسانی کے مجرم بھی ٹھہرتے ہیں۔ ایک دوسرے مؤلف جو اسی تذبذب کا شکار ہوئے وہ عبدالرحیم عظیم آبادی تھے وہ اپنی بیش بہا کتاب تذکرہ صادقہ میں بالقصد غلط بیانی کے مرتکب تو نہ ہوئے مگر انگریز حاکموں کی رواداری عدل گستری اور رحمدلی کی مدح گوئی ہی نہیں کی ہے بلکہ برادران علی کے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو خفیف کر کے دکھایا ہے۔

تحریک پر خود وہابیوں کی ان نگارشوں کے ساتھ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر کچھ انگریز مولفوں کے تبصروں کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ جنہوں نے خود سید احمد کے زمانے میں تحریک کی انگریز دشمنی کے اظہار میں زیادہ صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ بیلو ابو سف زئیوں پر اپنی رپورٹ میں سید احمد کے بارے میں لکھتا ہے "یہ شخص کوئی اور نہ تھا بلکہ میر سید احمد بریلوی ہی تھا جو ان علاقوں میں سید پادشاہ کے نام سے معروف تھا۔ جس کا کردار ایک مختصر عرصے تک کامیاب رہا جب کہ وہ مختلف ہمسایہ سنّی مسلم حکومتوں کے حکمرانوں اور لوگوں کو اکسایا کرتا تھا کہ اُس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں جو اسلامی سلطنت کے دوبارہ قیام کے لیے اور جزیرہ نما سے ہند کو کفار

---

[۱] مہر جلد ا صفحہ ۲۵ - ۳۲۶ نیز ملاحظہ ہو مقالہ انگریزی از سید حسن عسکری بعنوان "سید احمد بریلوی کی تحریک کا سیاسی مفہوم" صفحہ ۱۶۴-۱۸۱ - روداد جلد ۳۱ دسمبر ۱۹۵۵ء [۲] دیکھیے تتمہ ۶

انگریزوں اور سکھوں سے آزاد کرانے کے لیے بلند کیا گیا ہے۔" ایک اور مصنف سرحد پر سولھویں صدی کی روشنیہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ روشنیہ کا سربراہ بایزید پیر روشن اور اس کے متبعین اکبر کے حق میں وہی ہو گئے تھے جو وہابی سکھوں کے حق میں، اور ہندوستانی مذہبی دیوانے برطانوی حکومت کے حق میں ہو گئے تھے۔" یہی مصنف ایک دوسرے مقام پر یوں رائے زنی کرتا ہے۔" بایں ہمہ سید احمد کے نائبین نے جو نو آبادیاں چھوڑی تھیں۔ وہ برطانوی حکومت کو ورثہ میں ملیں۔ پنجاب کے ساتھ ہمیں جو متروکات ملے ان میں شاید سب سے زیادہ دردسر کا باعث تھے" سکھوں کا مشہور مورخ کننگھم جو سید احمد کے نسبتی بھائی اور رفیق خاص سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا، یہ معنی خیز فقرے لکھتا ہے: " چار سال کی غیر حاضری کے بعد وہ دہلی لوٹے اور مسلمانوں سے کہا کہ کافروں کے خلاف جنگ میں ان کی متابعت کریں۔ ان کے تیور سے ایسا ظاہر ہوا کہ کافروں سے ان کی مراد صرف سکھ ہیں لیکن واقعی مراد صحیح طور پر سمجھی نہ گئی"[1]

سید احمد کا خلوص اور جاں نثاری

سید احمد کی زندگی میں تحریک کے بعض خاص پہلوؤں کا عام جائزہ کچھ تشنہ رہ جائے گا اگر ان کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو جو تحریک کی روش پر ایک حد تک اثر انداز ہوا سامنے نہ لایا جائے۔

مقصد کے ساتھ ان کا خلوص اور جاں نثاری ان کے قریب قریب تمام مکتوبات سے صاف نمایاں ہے وہ ایک مستحکم تنظیم اور تربیت یافتہ فوج کے مانے ہوئے بلا اختلاف قائد اور ایک معتنابہ علاقے کے کمان دار تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنے لیے کوئی دنیاوی اقتدار اختیار نہیں کیا، انھوں نے ایک امام اور ایک سلطان کے درجوں کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچ رکھا تھا، وہ اپنے اس پختہ فیصلے کا بار بار اعادہ کرتے تھے کہ وہ اپنا فرض ادا کرنے کے بعد یعنی فرنگیوں کو ملک سے باہر کرنے کے بعد عام سرداروں کو اپنے اپنے علاقے کے انتظامی اختیارات لوٹا دیں گے۔ ہندو راؤ کے نام ان کا منقولہ بالا مکتوب اس دعوے کی دلیل ہے۔ ایک اور خط میں خان پشاور یار محمد کے بھائی سعید احمد کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "نہ مجھے جاہ و حشمت

---

[1] کننگھم صہ ۲۶۵

اور جھوٹے وقار کی تمنا ہے، نہ انتظامی اختیارات کی آرزو، نہ کبھی دولت جمع کرنے کا خیال میرے دل میں آیا یہ بار بار دہرایا جانے والا دعوےٰ محض خالی خولی عجز و انکسار کی نمائش نہ تھی، فتح پشاور کے بعد ان کا کردار اس کی صداقت کی بیّن دلیل ہے۔ سلطان محمد صاف طور پر جنگ میں (وہابیوں سے) شکست کھا چکا تھا لیکن سید احمد نے حکومت اُس کو واپس کر دی۔ انہوں نے اپنا اقتدار یہیں تک محدود رکھا کہ قاضی اور اخلاق عامہ کے محتسب مقرر کیے۔ اس سلسلہ کی ایک اور مثال یہ ہے کہ کچھ پہلے رنجیت سنگھ نے جو پیشکش کی تھی کہ وہ اپنی مخالفانہ کشمکش ترک کر دیں تو ستلج کے پار علاقے میں ان کو آزاد ریاست عطا کر دی جائے گی۔ اسے انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سید احمد کا عزم اپنے لیے کسی ریاست کا حصول نہ تھا بلکہ اس سے بہت اعلیٰ و ارفع۔

سید احمد کے ریاست کا تخیل بھی ایک خاص رنگ کا تھا۔ ان کا خاص نقطۂ نظر یہ تھا کہ سلطان کا دنیاوی اقتدار اور امام کے مذہبی فرائض ساتھ ساتھ چلیں انہوں نے سلطان کے میدان عمل کی مبہم طور پر تعیین کر دی تھی، مگر ساتھ ہی امام کے لیے ایک طور کے مجموعی نگران (گو غیر مخل) کے تقرر کی سفارش کی۔ مگر یہ نظریہ ان کی زندگی میں خوابیدہ سا رہا۔ نہ نافذ کیا جا سکا نہ پوری طرح عمل میں لایا جا سکا۔

سید احمد پر بعض سماجی مذہبی صورت حال اور غیر ملکی اقتدار کے روز افزوں خطرات کا بہت سخت اثر تھا۔ وہ ان مفسدات کو دفع کرنے کے لیے اپنے نسبتًا ادنیٰ و پست درجۂ زندگی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا مقصد مخلصانہ اور بے غرضانہ تھا۔ وہ اپنے مشن کی تکمیل کے بعد شاید اپنے قدیم مشغلہ کی طرف لوٹ آنے کا قصد رکھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ کئی اعتبار سے کسی قدر ایک ہندوستانی گیری بالڈی نظر آتے ہیں۔ مگر گیری بالڈی کے برخلاف زندگی میں اپنے مقصد کا کامیاب انجام دیکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔

وہابی تحریک کا سیاسی پہلو

تحریک کے سیاسی حصے نے جو سید احمد کی زندگی میں صاف عیاں تھا بعد کے دور میں غلبہ پا لیا۔ خالص مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کا زور سیاسی تبلیغ میں منقلب ہو گیا۔ ہنٹر بھی اس غیر محسوس تغیر پر یوں تبصرہ کرتا ہے۔ " احبار میں مذہبی عنصر کا زور گھٹنے لگا، تحریک کے قدیم تر قائدین کے

تحت ہی اس کے انحطاط کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ پٹنہ کے داعیوں نے بھی اس کو صاف طور پر محسوس کر لیا تھا اور اپنی تعلیمات کو زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا تھا۔" اس دور میں وہابی داعیوں کی تعلیمات سے متعلق رودادوں میں خالص مذہبی مباحث کا کوئی حوالہ مشکل سے ملتا ہے۔ بے شک اب بھی اسلام کے ان فرائض کا جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کی بجا آوری پر زور دیا جاتا تھا مگر وہابی کارکنوں کا اصل کام چندے جمع کرنا اور سرکاری فوجوں میں سپاہ کا اغوا رہ گیا تھا۔ ان کی تعلیمات کا نچوڑ غیر ملکی حکام سے جہاد کا فرض رہ گیا تھا۔ ۱۸۳۱ء سے لے کر غزوہ امبیلہ کے اختتام تک انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کے سلسلے میں شاید ہی کوئی مذہبی مسئلہ سامنے آیا ہو۔ اس کے برخلاف اُس زمانے میں اور اس کے بعد تک بھی وہابی انگریزوں کے لیے خالصتہً سیاسی خطرہ بنے رہے۔ وہ مخالفت و مخاصمت کے مستعد کارمحو بنے رہے، اور ہمیشہ مقامی قبائل کی معمولی معمولی بے چینی کو ہوا دے کر انگریزوں کے خلاف عام جنگ کی شکل دے دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اس زمانے میں وہابیوں کی جدوجہد کا رقبہ اور ان کے اثر کی حدود بھی بہت کچھ وسیع ہو گئی تھیں۔ وہابیوں کی سازشوں کا جال جو کچھ پہلے ہنٹر نے تمام بنگال تک پھیلا ہوا پایا تھا۔ اب ۱۸۶۹-۱۸۶۸ء کی تحقیقات کے دوران میں ملک کے زیادہ حصوں پشاور سے بیجاپور تک اور ڈھاکا سے پونا تک پر چھایا ہوا تھا۔

غیر وہابی عناصر کی شمولیت

ظاہر ہے کہ ایسی وسیع الذیل تحریک بیشتر غیر وہابی عوام کی عملی اعانت و حمایت کے بغیر زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ سرحد کو روپے کی خفیہ ترسیل کے کام میں ہندوستانی ساہوکاروں کا تعاون جو پہلے سے جاری تھا اس زمانے میں اور بڑھ گیا۔ اُس زمانہ کی سرکاری رودادوں میں ہندو ساہوکاروں کے بارے میں اکثر حوالے ملتے ہیں جن کا کاروبار سارے شمالی ہند میں پھیلا ہوا تھا۔ اگر سب نہیں تو کچھ ساہوکاروں کو ضرور معلوم ہو گا کہ جن لین دین کے معاملوں میں یہ حصہ لے رہے ہیں وہ کوئی سدھا دن کاروباری نہیں بلکہ ان کے پیچھے کوئی زیادہ گہرا اور شاید خطرناک مقصد پوشیدہ ہو گا۔ روپے کی ترسیل ہنڈیوں کے بھنانے کے کمیشن اور زرمبادلہ کے حصول

کا محض لالچ اس خطرناک کام میں اتنے ساہوکاروں کی مستعدی سے شمولیت کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔

وہابی تحریک کا قومی رنگ

غیر وہابی عناصر کی زبردست اعانت اور اسی قسم کی دوسری تدبیروں نے اس تحریک کو قومی رنگ دے دیا۔ قدرتاً ان کو مذہبی جھگڑوں یا فرقہ وارانہ موشگافیوں سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ ہندوستان میں اس تحریک کا روزنامچہ نویس ریہاتسیک اس غور طلب مسئلہ کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلاتا ہے: "بغاوت کی یہ خبریں رفتہ رفتہ وہابیوں کی اصلی تعلیمات پر جیسے اخلاق، پاکبازی، مشرکانہ رسوم کا قلع قمع، جن کی شروع میں بڑے جوش وخروش سے تاکید کی جاتی تھی ایسی چھا گئیں کہ ان سب کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا"[1] ایسی مثالیں جہاں ان کے داعی و مبلغین صرف دینی امور پر بحث کرنے اور سیاسی مسائل سے اجتناب کرتے اب قریب قریب معدوم ہیں۔ ایسے مسائل پر گفتگو سے سامعین آہستہ آہستہ مجلس سے کھسک جاتے۔ ہنٹر بھی تحریک کی روش میں اس تغیر پر یوں تبصرہ کرتا ہے: "اخلاقیات کی مستحسن ترویج سے آغاز کرنے کے بعد انہوں نے اپنے پیغام کے روحانی عنصر کو بتدریج ترک کرکے اور فطرت انسانی کے بدترین جذبے کو ابھار کر اپنے روبہ زوال مقصد کو قوت دینا شروع کیا"[2]

اس سے معلوم ہوگا کہ قدرتاً عوام کو تحریک کے مذہبی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کی سیاسی اور مخالف حکومت اپیل ہی زیادہ عملی اور معقول دکھائی دی جس پر چلنے کے لیے وہ تیار ہوگئے۔ اس طرح تحریک کی روش میں تغیر نے عوام میں اس اپیل کو وسیع تر کرکے اس کی حمایت و مقبولیت میں اضافہ کر دیا۔

ایک جدید مصنف اٹھارہویں صدی کے نصف دوم اور انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مختلف شورشوں کی نوعیت کا جائزہ لیتے ہوئے وہابی تحریک کے متعلق رائے زنی کرتا ہے۔ "وہابی تحریک کی مقبولیت عام نے اپنی مضبوط و مربوط تنظیم سے

---

[1] جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ صفحہ ۳۶۲

[2] آور انڈین مسلمان صفحہ ۶۹

ملک کے طول و عرض میں ڈھاکا سے پشاور تک کے رنگروٹ اور روپے حاصل کر کے اپنا بول بالا کر لیا۔ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جن تحریکوں کو جنم دیا اُن میں وہابی تحریک سب سے زیادہ بے دردی اور سختی سے مخالف انگریز تھی اور ان کی تمام جدوجہد میں یہ صورت قائم رہی"۔[1]

وہابی تحریک کے دو خاص پہلو تھے، سماجی مذہبی اور سیاسی۔ اول الذکر اسلامی معاشرے کی اصلاح سے متعلق تھا۔ اور آخر الذکر کا تعلق انگریزوں کے ساتھ جہاد سے تھا۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں نے نیز بعض اور حالات نے تحریک کی رفتار ترقی کو متاثر کیا۔ اس کی تمام مدت رفتار میں ان پہلوؤں کی علیحدہ علیحدہ افادیت بدلتی رہی۔ اس لیے مجموعی طور پر تحریک کی عام نوعیت پر رائے زنی گمراہ کن ہوگی۔ پھر بھی نمایاں طور پر صاف نظر آتا ہے۔ کہ سید احمد کی شہادت کے بعد کے دور میں تحریک کا سیاسی پہلو رفتہ رفتہ غالب آگیا اور اس کی تاریخ پر چھا گیا۔ زیادہ تر اسی دوہرے پہلو سے چشم پوشی کے سبب سے ہی عموماً اس کی نوعیت پر غیر متوازن نظر ڈالی جاتی ہے۔

(ب) وہابی تحریک کی کچھ خدمات اور اس کی ناکامی کے اسباب

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہابی تحریک کے کئی رخ تھے۔ تحریک کے الگ الگ میدانوں میں اس کی کامیابی اور ناکامی کی مقدار بہت حد تک مختلف رہی ہے۔ اس لیے ان پر جدا جدا غور کرنا ہوگا تحریک کی ناکامی پر عمومی طور پر یہ کہہ دینا کہ اس کا سبب سیاسی مقصد انگریزوں پر فتحیابی حاصل کرنے میں ناکام ہو جانا تھا، گمراہ کن ہے۔ سیاسی میدان میں اس کی ناکامی پر بحث کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ غیر سیاسی عالم میں اس کی بعض خدمات کا مختصراً ذکر کر دیا جائے۔

سماجی مذہبی اصلاح

سماجی مذہبی میدان میں اس کی کامیابی کی مقدار بہت کچھ ہے اس تحریک کے ہندی مسلم معاشرہ اور مذہب کے ساتھ تصادم اور کشمکش کا مطالعہ ایک پُر معنی بحث ہے جو علیحدہ اور پوری طرح مذاکرہ اور استقصا کا متقاضی ہے۔ ہم

---

[1] ایس بی چودھری مصنفہ CIVIL DISTURBANCES DURING THE BRITISH RULE IN INDIA کلکتہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۵۰

یہاں اس کے بعض خاص پہلو پیش کرتے ہیں - ہندوستان میں اس تحریک کے نشو و نما کے وقت جو سماجی مذہبی صورت حال تھی وہ مفصلاً بیان کی جا چکی ہے - بعد کی صورت حال پر ایک سرسری نظر وہابیوں کے آوردہ فرق ہی کو نہیں بلکہ ترقی کو نمایاں کر دے گی - بیواؤں کے نکاح ثانی کی ترویج و تبلیغ نمائشی رسوم، بعض تہواروں اور تقریبوں میں تباہ کن فضول خرچی کا ترک، سیدھے سادے عوام کی گردنوں کو ملاؤں کے پنجے سے چھڑانا، قبروں کی پرستش، مُردوں سے مرادیں مانگنے کے عام رواج کا ترک، اور پاک و صاف پیشہ اختیار کرنا، یہ تھے وہابیوں کے آوردہ اور بعض اصلاحات کے کچھ درخشاں پہلو۔

اُردو کی خدمت

وہابی تحریک کا ایک اہم اور نظروں سے پوشیدہ ضمنی فیضان وہ زوردار جنبش ہے جو اُس نے اُردو زبان خصوصاً نثر نگاری کی رفتار ترقی کو دی - اپنے پیغاموں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش میں اور تبلیغی تحریکوں کی طرح اس نے مقامی زبانوں کے استعمال پر بہت زور لگایا - اگرچہ اعلیٰ طبقہ کی عام زبان فارسی تھی، وہابی قائدین نے اُردو کا زیادہ استعمال کیا اور اسی زبان میں بہت زیادہ رسالے لکھے۔

سیاسی تنظیم کا نمونہ

وہابی تحریک نے اپنے پیچھے انگریزوں کے خلاف دلیرانہ اور پائیدار کش مکش کی ایک حوصلہ افزا روایت اور ایک مستحکم و مربوط عمومی ہندوستان گیر سیاسی تنظیم کا ایک نمونہ بھی چھوڑا - اکثر حکمت عملیاں اور سیاسی چالیں جن کی ابتدا اور عمل درآمد وہابیوں سے ہوئی بعد میں ابتدائی سیاسی جماعتوں خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس نے اختیار کر لیں اور ترقی دی - مجہول عدم موالات یا عدم تعاون، پنچایت کی ترویج وفادار عناصر کا سماجی بائیکاٹ، "حقہ پانی بند" جیسا کہ ریلی نے تعبیر کیا ہے، یہ تمام حربے آزادی کے لیے کش مکش کے دوران میں کمال کو پہنچا کر سیاسی احتجاج کے زبردست وسیلے بنا لیے گئے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی ابتدا وہابیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی - سر سریندرا ناتھ بنرجی نے ایک عام جلسے کی تقریر میں وہابیوں کے ایجاد کیے ہوئے چندوں کی تحصیل کے ایک غیر نمایاں اور موثر طریقہ کا ذکر خاص طور پر نمونہ کے طور پر کیا تھا - ضروری خبروں کے اعلان اور تمام ملک سے آدمی اور روپے کے بھیج بھیجاؤ کے لیے وہابیوں کی پیچیدہ اور نہایت خفیہ تنظیم آج بالکل

جدید اور نہایت موثر معلوم ہوتی ہے۔ انگریزوں کے خلاف کش مکش میں فوج کے دیسی دستوں کی موثر کارگزاری کی اہمیت کا سب سے پہلے وہابیوں نے ادراک کیا اور اُن کو ملا لینے، یا جیسا کہ اُس وقت کی سرکاری رپورٹوں سے ظاہر ہے، ان کو اطاعت سے منحرف کرنے کی معقول کوششیں کیں۔

وہابی تحریک کا سر سید پر اثر

وہابی تحریک کی ایک اور معنی خیز خدمت یہ تھی کہ سر سید کی مسلمانوں میں مغربی تعلیم اور ثقافت اختیار کرنے کی حمایت کی تحریک کے ردعمل کو متوازن بنا دیا۔ وہابی تحریک انگریزوں کے خلاف صرف سیاسی طور سے چلائی نہیں گئی تھی بلکہ دوسری جدت پسند تحریکوں کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم کا ایک لازمی عنصر دلنواز ماضی کے اعادے پر زور دینا بھی تھا۔ لازمی طور پر اس کے معنی جدید طور طریقوں سے اغراض اور ان کا مقاطعہ بھی تھے۔ جہاں سماجی اور مذہبی میدانوں میں پاک وصاف ماضی کی طرف لوٹنے کی ضرورت مسلّمہ طور پر شدید تھی وہاں وہابیوں نے معاشرہ وقت کی بہت سی اہم حقیقتوں سے روگردانی کی۔

انگریزوں کا سیاسی تفوق

ان حقیقتوں میں سے ایک انگریزوں کا سیاسی تفوق تھا جو مغرب کی مادی اور فنی تفوق کی محض ایک علامت تھا اور جو ہندوستان میں آکر جم گیا تھا۔ اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ مگر کیسے؟ اس کا مقاطعہ اور مخالفت کر کے یا جاپانیوں کی طرح جذب اور ہضم کر کے؟ وہابی تحریک نے اس اہم سوال کا کوئی صاف جواب تو نہ دیا لیکن مجموعی حیثیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر طرز عمل اختیار کیا۔ جس سے مدعا بر نہ آیا۔ سر سید کی تحریک جو مسلمانوں میں تمام جدید سماجی اور تعلیمی اصلاحات کا ہراول تھی وہابی تحریک کے ردعمل کے طور پر ہی وجود میں آئی اور ایک حد تک اس کی بنا وہابی تحریک کی مرہون منت ہے۔

اسباب ناکامی قبائلیوں کی غداری

رہا اس تحریک کی ناکامی کا سوال۔ تو سیاسی حیثیت سے اس کا خاص سبب قبائلیوں کی مسلسل غداری اور آئے دن کی مخاصمت تھا۔ سید احمد نے بعض ملحوظات سے جن کا ذکر ہو چکا سرحد کے علاقے کو اپنی کارروائیوں کا صدر مقام منتخب کیا تھا۔ ان میں سے اکثر ملحوظات نظری

اعتبار سے بالکل معقول و مناسب تھے۔ مگر ان کے قیاسات کی ایک اہم کڑی، یعنی قبائلیوں کا صرف سہارا نہیں بلکہ عملی تعاون کے حصول کی امید بعد کے واقعات سے خاک میں مل گئی۔ قبائلیوں کی متوقع ہمدردی اور اعانت کے عوض انہیں ان کی پوشیدہ عداوت بلکہ کھلم کھلا مقاومت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

وہابی تحریک کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ قبائلیوں نے تحریک کی اصل غرض و غایت کو نہ سمجھا اور اس کے سربراہوں سے حقیقی اور مستقل اعانت سے دریغ کیا۔ اس میں وہابیوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ سید احمد کے دور سے ہی انہوں نے قبائلیوں کے ساتھ غیر معمولی تحمل اور رواداری کا برتاؤ کیا۔ قبائلیوں نے بار بار ان کے ساتھ بدعہدی و غداری کی جو جان و مال کی بربادی کا موجب ہوئی مگر وہ سب کو نظر انداز کرتے رہے۔ وہ نصف صدی سے زائد تک پند و نصائح اور عمل سے اتحاد مقصد اور آزادی کے لیے قربانیوں کے جذبے کو ان کے ذہن نشین کرتے رہے مگر سب لاحاصل رہا۔ زیادہ تر انگریز مصنفوں نے اور ان کے تتبع میں بعض حالیہ مصنفوں نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہابیوں کے شدید دینی جوش نے قبائلیوں کی ہمدردی کھو دی۔ لیکن اس فیصلے کی صحت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی کہ اگر یہ مفروضہ (تقشف) عمل میں نہ آتا جب بھی قبائلیوں کی روش کچھ اور نہ ہوتی۔ اس کے برعکس شروع ہی سے، جب وہابی متشددانہ اصول نافذ کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے قبائلی وہابیوں کے ساتھ برتاؤ میں تلون و تزلزل اور اکثر اوقات غداری کا ثبوت دیتے رہے۔ یہ زیادہ تر نتیجہ تھا تحریک کے متعلق وہابیوں اور قبائلیوں کے مختلف بنیادی نقطہ نظر کا۔ قبائلی صرف اپنے سردار کے وفادار ہوتے ہیں اور عموماً دین و مذہب پر کسی عظیم تر تخیل سے زیادہ نسلی رشتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ قبائلیوں میں کبھی وہ بے غرضانہ للہی گرم جوشی نہیں دیکھی گئی جس سے وہابی سرشار تھے۔ وہ ہمیشہ دل سے موقع پرست اور زر پرست رہے۔ اگر وہ اس جدوجہد کی اصلی غرض و غایت کا ذرا بھی احساس رکھتے تو وہابیوں کے نافذ کردہ تشدد و تقشف کے عام عائد کردہ الزام کو مان کر بھی بہ اپنے اوپر تھوپے ہوئے متقشفانہ دیندارانہ اقدامات کے متعلق کچھ نہ کچھ تو کرتے۔ لیکن وہابیوں کی اصلی ناکامی یہ تھی کہ وہ اپنا جوش اور بلند نظریہ جس نے خود ان کو متحرک کیا، قبائلیو

میں پیدا نہ کر سکے اور ان کو اپنے اعلیٰ معیار عمل تک اُٹھا نہ سکے بے شک یہ سچ ہے کہ ہر تحریک میں عام افراد متعلقہ میں اتنا جوش و جذبہ نہیں ہوا کرتا جتنا ان کے قائدین میں ہوتا ہے۔ لیکن بصورت موجودہ ایک سادات ستھانہ کے تنہا اور درخشاں کردار کے سوا قبائلیوں نے تحریک کی اصل روح کو کبھی کسی مدت کے لیے واقعی طور پر اخذ نہیں کیا۔ اسی صورت حال نے وہابیوں کو اپنے ہندوستانی مرکز کا زیادہ محتاج بنا دیا۔

امدادی مراکز سے دوری

واقعتہً وہابیوں کی ہر قسم کے مادی سہارے کے لیے اپنے ہندوستان کے مرکزوں کی قطعی محتاجی، ان کی ناکامی کا دوسرا اہم سبب تھا یہ مرکز بالکل انگریز حکام کے رحم و کرم پر مبنی تھا اور بلا زحمت دبا دیا یا بیخ و بن سے اکھاڑ بھی دیا جا سکتا تھا۔

فوجی تدابیر کے ابتدائی اصول میں سے ایک یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی کی ایک محفوظ و مختصر راہ نکال لی جائے سامان و ذخائر کے بھیج بھجاؤ کا راستہ جو صرف یہی نہیں کہ ہزاروں ہزار میل طویل ہو بلکہ سیدھا دشمن کی سرزمین سے گزرتا ہو، لابدی ہے۔ وہابیوں نے ایسے راستے کے خطرات کا اندازہ ضرور کر لیا ہوگا۔ صرف وفاداری اور رازداری (خواہ کتنی ہی احتیاط برتی جائے) زیادہ عرصہ تک اسے محفوظ نہ رکھ سکتی تھی۔ وہابی اسے محسوس تو بہت کرتے تھے مگر ان کے پاس کوئی چارہ کار کم سے کم اُس وقت کچھ اور نہ تھا۔

وہابی تحریک نے ہر صحیح القویٰ فرد پر سرحد کو ہجرت کے فریضہ پر بہت زور دیا۔ قریب قریب سارے وہابی رسائل اس کی ترغیب و تاکید کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے ان لوگوں کو جو کسی عذر سے فی الوقت ہجرت نہ کر سکیں رخصت دی کہ جب تک وہ ہجرت کے قابل نہ ہوں تحریک کی مالی اعانت کرتے رہیں۔ اس طرح ہندوستان میں تحریک کے مالی معاونین کا ایک طاقتور گروہ پیدا ہو گیا۔ وہابیوں کا مقصد شاید یہ تھا کہ جیسے ہی سرحد پر ان کے قدم مضبوط جم جائیں گے وہ ہندوستان کے مرکزوں سے استمداد کے محتاج نہ رہیں گے۔ مگر وہ منزل کبھی نہ آئی۔

قدیم اسلحہ سے جدید آلات حرب کا مقابلہ

آخر میں وہابیوں کا مادی وسائل میں اپنے حریفوں کے تقابل میں کچھ مہیا نہ کر سکنا ان کی ناکامی کا دوسرا اہم سبب تھا۔ خالی خولی جوش جانبازی کسی مقصد کی کامیابی کے لیے کتنی ہی ضروری ہو مادی وسائل کا کامل بدل نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں تمام مشرق کی طرح وہابی بھی حالات و ماحول کے مجبور اور بے بس شکار ہو کر رہ گئے۔ صنعتی انقلاب اور پھر فنی ترقیات نے مغرب کو وہ مادی وسائل خصوصاً ایسے اعلیٰ درجہ کے آلات حرب مہیا کر رکھے تھے جن کے حصول کی اہل مشرق مستقبل قریب میں توقع نہ رکھ سکتے تھے۔ ملکہ میں وہابیوں کا بارود کا دقیانوسی کارخانہ اور اس سے بھی زیادہ دقیانوسی بانس کے نلکوں کی دستی توپیں، نو ایجاد، انفیلڈ رائفلوں کا کیا بدل ہو سکتی تھیں جو ۱۸۵۸ء کی مہم کاٹن میں پہلی بار سرحد پر استعمال کی گئی تھیں۔ آخری جائزے میں مغرب کا یہی مادی تفوق وہابیوں کے خلاف محاربہ میں فیصلہ کن چیز تھا۔ اور یہی چیز مشرق و مغرب کے درمیان چین کی راہ کشائی اور زوال پذیر سلطنت مغلیہ کی شکست سے لے کر ۱۸۵۷ء کی تحریک کی پامالی تک بہت سے بڑے بڑے اور مہتم بالشان معرکوں میں بھی فیصلہ کن ثابت ہوا۔ وہابی بھی اسی کا نشانہ بن گئے۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ زبردست حوادث جو اٹھارہویں صدی ہی سے بار بار رونما ہوتے رہے، ان کے اسباب و نتائج کو نہ ۱۸۵۷ء کے قائدین پوری طرح سمجھے نہ وہابی۔ جب واقعات و حوادث کے اسباب و نتائج ہی نہ سمجھے جائیں تو ان کے خلاف علاج و تدبیر کے اقدامات کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

تمّت بالخیر

اخلاف مجاہدین صادق پور کا تاثر

آنکھ جب کھولی تو دیکھا میکدہ لوٹا ہوا
مے سبو سے بہہ چکی تھی اور خُم ٹوٹا ہوا

ہر طرف بکھرے ہوئے تھے پارۂ جام و سبو
مست رکھتی تھی انہیں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی بُو

مغبچے زنداں میں، ساقی غائب، اور محفل خاموش
محتسب کے خوف سے سہمے ہوئے تھے بادہ نوش

ہائے وہ اک سید احمد کی شراب لالہ رنگ
اور اک سر سید احمد خاں کی صہبائے فرنگ

وہ جنونِ سرفروشی اس نے زہر سے دھو دیا
دی توانائی خرد کو زور ایماں کھو دیا

(مسلم عظیم آبادی)

ضمیمہ جات

(ا)

بعض اہم ارکانِ صادق پور کے سوانحی خاکے

وہابی تحریک کی بنا و ارتقا میں خاندان صادق پور کے ارکان کا حصہ معتد بہ اور بہت نتیجہ خیز تھا۔ ان میں سے سب کے نہیں تو چند نمایاں ترین اصحاب کے نام جو اس سلسلہ میں بہت معروف و مشہور ہیں قابل ذکر ہیں وہ ولایت علی، عنایت علی، احمد اللہ، یحییٰ علی، عبدالرحیم اور عبداللہ ہیں، ساتھ ہی خاندان کے بہت سے اور ارکان نے اس تحریک کی جو خدمات انجام دیں اگرچہ وہ کم معروف اور کم نمایاں ہیں مگر بے غرضانہ اور مخلصانہ جذبے میں کسی سے کم نہیں۔ ان کے زمانے مختلف تھے اور ان کی اعانت کی غایت اور نوعیت بھی مختلف۔ ان میں سے بعض کے سوانحی خاکے تذکرہ صادقہ پر مبنی پیش کیے جاتے ہیں۔

الٰہی بخش: ولد شیخ ہدایت علی ساکن مہدا دان (متصل منیر)۔ وہ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۵ء) میں متولد ہوئے۔ ان کی شادی بی بی لطیفن دختر شاہ معز ساکن ننموہیاں۔ شہر پٹنہ سے ہوئی۔ ان کے ماموں عبدالعلی کی کوشش سے ان کو نواب مرشد آباد کی ملازمت میں ایک اعلیٰ عہدہ مل گیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد مستعفی ہو کر وطن واپس آ گئے۔ ان کی خدمات کے صلے میں ان کو دو بڑے بڑے مواضع بھوئی اور گوپالپور عطا ہوئے۔ انہوں نے سید احمد کو اپنے ہاں مدعو کیا اور اپنے بیٹوں کی ان کے ہاتھ پر بیعت کرائی۔ مگر بعض اسباب سے خود بیعت نہیں کی۔ بعد میں انہوں نے ولایت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اپنی بیوہ بیٹی جمیلۃ النساء (زوجہ قمر الدین جو سرحد پر شہید ہوئے) کا عقد ثانی ولایت علی سے کر دیا۔ سید احمد کے رخصت کے وقت انہوں نے اپنے تین بیٹوں (فیاض علی اور اکبر علی) کو ان کے ہمرکاب روانہ کر دیا۔ باقی دو احمد اللہ اور ولی اللہ پٹنہ میں رہ گئے۔ الٰہی بخش کو کمشنر پٹنہ ٹیلر ۱۸۵۷ء میں وہابیوں کا سردار بتاتا ہے وہ ۷۵ برس کی پختہ عمر میں ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۹ء) میں رحلت کر گئے اور مسجد ننموہیاں سے متصل مقبرے میں مدفون ہوئے۔

وہ شہر کی ایک اہم شخصیت، معروف محبِ خلق اور کتابوں کے شائق تھے۔ ان کو

ایک کتب خانہ ورثہ میں ملا تھا جس پر انھوں نے گراں قدر اضافہ کر رکھا تھا۔ یہ کتب خانہ ان کے بڑے بیٹے احمد اللہ کو ورثہ میں ملا۔ مگر ان کی گرفتاری کے موقعہ پر کچھ حصہ ضبط اور کچھ ضائع ہو گیا۔ الٰہی بخش ایک مشہور طبیب تھے مگر طبابت کو کبھی پیشہ کی طرح اختیار نہ کیا۔ البتہ وہ دوائیں مفت تقسیم کرتے تھے۔ وہ فوجی تربیت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

احمد اللہ: الٰہی بخش کے بڑے بیٹے ۱۸۰۸ء میں متولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ولایت علی اور خاندان کے دوسرے افراد سے پائی۔ محمد حسین کی ایک بیٹی سے ان کی شادی ہوئی اس پہلی شادی سے ان کے چھ بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں۔ پھر دوسری شادی سے ایک بیٹا ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے حکیم عبد الحمید اپنے زمانہ میں ہندوستان کے مشہور ترین اطبا میں سے تھے۔ اپنے باپ کی طرح عبد الحمید بھی شہر کے سماجی اور سرکاری حلقے میں بہت موقر تھے۔ پٹنہ میں مطبوعہ تصانیف اور علمی ذوق رکھنے والوں کی ایک فہرست جو حکومت ہند نے طلب کی تھی اس کے جواب میں پٹنہ کے کلکٹر اے ٹل نے لکھا تھا کہ "میں شہر کے ایک فاضل ترین شخص سے ملا میں ان کو اس سلسلہ میں ایک اعلیٰ سند سمجھتا ہوں۔ اور میری رائے میں اب علم و فضل کا ذوق بہت کم ہو گیا ہے۔" مقامی حکام اور عمائد شہر سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ کچھ مدت تک ڈپٹی کلکٹر اور انکم ٹیکس کے اسیسروں کے بورڈ کے ممبر بھی رہے وہ پٹنہ کی تعلیم عامہ (پبلک انسٹرکشن) کی کمیٹی کے ممبر بھی مقرر کیے گئے تھے ۱۸۵۷ء میں ٹیلر نے اُن کو اور عمائدین شہر شاہ محمد حسین اور واعظ الحق باشندہ گورہٹہ (پٹنہ) کے ساتھ وہابیوں کے ایک قائد ہونے اور حکومت کے خلاف سازش کے شبہ میں گرفتار کر لیا، مگر تین ماہ کی نظربندی کے بعد رہا کر دیے گئے۔ یہ تمام واقعات اور آخر کار ان کی گرفتاری اور ۱۸۶۵ء کے مقدمہ کے حالات بیان ہو چکے۔

فیاض علی الٰہی بخش کے دوسرے بیٹے تھے جو ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ولایت علی کی وفات کے بعد فرحت حسین نے اُن کو پٹنہ بلا لیا۔ کچھ عرصہ تک بہار میں تنظیمی کام میں اُن کا ہاتھ بٹایا۔ فطرتاً وہ خاموشی پسند اور تنہائی پسند تھے۔ عام وعظ بہت کم کہا کرتے۔ یہ کام ان کے چھوٹے

بھائی یحییٰ علی کے سپرد تھا۔ فرحت حسین کی وفات کے بعد وہ پھر سرحد شمالی مغربی چلے گئے اور تادم حیات وہیں مقیم رہے۔ انہوں نے لاولد انتقال کیا۔

یحییٰ علی آلٰہی بخش کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ فیاض علی سے دس سال چھوٹے تھے۔ ان کا قد اوسط رنگ گورا، اور جسم گٹھا ہوا۔ ڈاڑھی چھوٹی اور چہرے پر چیچک کے چند نشان تھے۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک لڑکی جمیدہ سے ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی ولایت علی سے بیعت کی تھی اور ان کے خلفاء میں سے تھے۔ سرحد کے دونوں سفروں میں وہ ولایت علی کے ساتھ تھے اور ۱۸۵۲ء میں ان کی وفات کے بعد پٹنہ واپس آئے۔ وہ ایک بڑے منچلے غازی تھے۔ اور بڑے بڑے خطروں کے مقابلے میں ان کی شجاعت وجرأت کے واقعات تذکرہ صادقہ میں مذکور ہیں۔

بارہ سال (۱۸۵۲-۶۳ء) پٹنہ کے قیام کے دوران میں انہوں نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے کارنامے انجام دیے۔ شاہ محمد حسین کی وفات کے بعد انہوں نے پٹنہ کی زمام تنظیم اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ ہر جمعہ کو نمو ہیہ جاتے (جو محمد حسین کی جائے قیام تھا) اور صادق پور سے تھوڑی ہی دور واقع ہے۔ وہاں وہ نماز جمعہ پڑھاتے، مریدوں سے ملتے اور مختلف مسائل پر گفتگو کرتے۔ رات میں دیر سے صادق پور لوٹتے۔ ہر منگل کو ولایت علی کے مکان میں وعظ کہتے۔ دور دراز سے آنے والے رنگروٹوں کو دینیات اور دوسرے مسائل پر درس دیتے اس زمانے میں وہ سرحد کو آدمی اور سامان کی ترسیل کے لیے پٹنہ کی نہایت خفیہ اور پیچیدہ تنظیم کے سربراہ تھے۔ اس زمانہ میں احتیاط کے پیش نظر ان کے مراسلات محی الدین کے فرضی نام سے ارسال کیے جاتے۔ پہلی بیوی سے ان کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی اور دوسری سے ایک بیٹا تھا۔

تذکرہ صادقہ کا جو نسخہ میرے استعمال میں ہے اس میں ان کے ایک مکتوب مورخہ اتوار ۲۱ جمادی الاول ۱۸۶۶ء[1] جو انھوں نے صادق پور کے گھر کے انہدام وبربادی کی خبر سن کر اپنی بیوی کو لکھا تھا منقول ہے۔ یہ اس نوع کا تنہا مکتوب ہے جو بچ رہا ہے اور انسانی نقطہ نظر سے

---

[1] تعجب ہے کہ مہینہ کا نام قمری تقویم کے مطابق اور سال عیسائی کی تقویم سے درج ہے۔

بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ معمولی سلام و دعا اور سابقہ خطوط کے حوالے کے بعد لکھتے ہیں "ایک اہم بات قابلِ تحریر یہ ہے کہ محمد حسن سلمہ ہی کے خط سے دونوں مکانوں کے انہدام کی خبر معلوم ہوئی۔ یہ معلوم کر کے میرے دل کو سخت کرب ہوا اس لیے کہ دونوں ہمارے آبائی مکان تھے اور زیادہ تر اس لیے کہ وہاں اللہ کا ذکر ہوتا اور ہمیشہ اس کے احکام بجا لائے جاتے اور اس لحاظ سے مومنین صادق ان کو اپنے اعزا و اقارب کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ اس کے بعد خط میں وہ اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے آنحضرت (صلعم) کی زیارت کی کہ آپ نے ان کو تسکین دی کہ" اللہ تعالیٰ اپنے سچے مومنوں کی اطاعت اور ایمان کا امتحان کرتا ہے۔ جو اس میں پورے اُترتے ہیں اُن کو راحت جاوید نصیب ہوتی ہے۔ جیسے دشمنانِ خدا نے عارضی طور پر مسجد اقصیٰ کو تباہ کر دیا تھا مگر آخر اس کی دوبارہ تعمیر ہو گئی اور اس کے تباہ کرنے والے مغلوب ہو گئے اُسی طرح ان کے (مومنوں کے) گھروں کے تباہ کرنے والے مغضوب و مقہور ہوں گے اور گھر دوبارہ تعمیر ہو جائیں گے۔"

ولی اللہ: الٰہی بخش کے دوسرے بیٹے تھے، مگر وہ اپنے تینوں بھائیوں کی طرح تحریک پر زیادہ کام نہ کر سکے، کیونکہ ابتدائے عمر میں ہی ان کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

فتح علی: آلٰہی بخش کی طرح جن کے یہ معاصر تھے ان کے بھی متعدد فرزند تھے، جنھوں نے تحریک کی تاریخ میں اعلےٰ امتیاز حاصل کیا۔ وہ وارث علی کے بیٹے اور ننیال کی جانب سے بہار کے ایک مشہور ولی حضرت احمد چرم پوش کی اولاد میں سے تھے۔ وہ چودھویں صدی میں بہار کے مشہور ولی حضرت شرف الدین (مخدوم) سے نسلاً مربوط تھے۔ خانقاہوں کے عام دستور کے مطابق فتح علی کے مکان پر بھی پیری مریدی کی بہت دھوم رہتی تھی۔ لیکن سید احمد کی پٹنہ میں تشریف آوری کے موقع پر انھوں نے سید احمد کو اپنے گھر دعوت دی اور اپنے تین بیٹوں کے ساتھ ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور یہ زیادہ تر ان کے بڑے بیٹے ولایت علی کی ترغیب سے انجام پایا۔ انھوں نے سید احمد کے ہمراہ سرحد کے سفر کی خواہش بھی ظاہر کی مگر ان کی کبرسنی کی وجہ سے ان کو گھر ہی کی اقامت پر آمادہ کیا گیا۔ وہ غزوہ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے فوراً بعد رحلت کر گئے۔

ان کی پہلی بیوی دختر شیخ ہدایت علی مہدانوی شادی کے فوراً بعد لاولد قضا کر گئیں۔ دوسری بیوی رفیع الدین حسین خاں کی دختر تھیں آخر الذکر مغل پورہ پٹنہ سٹی کے ایک متمول رئیس سے ہوئی۔ اس محل سے ان کے چھ بیٹے ہوئے۔ ان میں سے دو کم سنی میں قضا کر گئے۔ پہلے دو ولایت علی و عنایت علی کی زندگی پر بحث ہو چکی۔ تیسرے بیٹے طالب علی سرحد گئے اور وہیں وفات پائی۔ چوتھے فرحت حسین گھر کے مرکز پٹنہ کے سربراہ رہے اور ہمیشہ یہیں مقیم رہے۔

فتح علی کے پاس بھی کتابوں اور مخطوطات کا ایک گراں بہا ذخیرہ تھا جو ان کے پوتے عبدالرحیم کی گرفتاری کے زمانہ میں ضبط کر لیا گیا۔

طالب علی: ولایت علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے بھی سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی اور انہیں کے ہمرکاب سرحد چلے گئے۔ وہاں ابتدائی معرکوں میں شریک رہے اور جنگلائی میں بعارضہ ذات الجنب وفات پائی۔

فرحت حسین: ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں متولد ہوئے وہ پست قامت، لاغر اندام، اور رنگ کے گورے تھے۔ ڈاڑھی چھوٹی، بھویں جڑی ہوئی۔ اور ان کے درمیان پیشانی پر ایک سرخ تل تھا۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک بیٹی سے ہوئی۔ جس کے بطن سے عبدالرحیم مولف تذکرہ صادقہ پیدا ہوئے۔ بعد میں انہوں نے دو اور شادیاں کیں۔ وہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں ۴۸ سال کی عمر میں رحلت فرما ہوئے۔

وہ پٹنہ کے مرکز کی تنظیم کے سربراہ ہوئے اور وقتاً فوقتاً ولایت علی کی پٹنہ سے غیر حاضری میں ان کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے گھر میں روزانہ جلسے ہوتے جہاں سماجی مذہبی مسائل پر تقریریں ہوتیں۔ ان میں مستورات بھی حاضر ہوا کرتیں۔ اُن سے علیحدہ تقریریں کی جاتیں اور کبھی ان کی بیوی بھی وعظ کہتیں۔ اس گھر سے مدرسہ کا مصرف بھی لیا جاتا۔ طلبہ کی ایک کثیر تعداد مختلف موضوعات پر درس لیتی۔ اکثر کلاسیں یحییٰ علی لیا کرتے۔ طلبہ کے طعام و قیام کے اخراجات بیت المال سے پورے کیے جاتے۔

پٹنہ کی شورش کے موقع پر پیر علی اور شورش کے دوسرے سربراہ، وہابیوں کے سربراہ فرحت حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ ان کے ساتھ شریک ہو جائیں ان

کے انکار کے اسباب اور ۵۸-۱۸۵۷ء کی تحریک میں وہابیوں کی عام روش پر اوپر بحث کی جا چکی۔

عبداللہ: ولایت علی کی دوسری محل مراد النساء سے ۱۲۶۰ھ (۳۱-۱۸۳۰ء) میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد ولایت علی کے سرحد کے متعدد سفروں میں ان کے ساتھ رہے۔ اور وہاں مختلف معرکوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۴۷ء میں پٹنہ کی مراجعت کے بعد وہ اپنی تعلیم میں مصروف رہے۔ اسی زمانے میں فرحت حسین کی بیٹی سے ان کی شادی ہو گئی۔

ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے چچا عنایت علی سے ان کے تعلقات خوش گوار نہ رہے۔ اور پٹنہ چلے آئے۔ چند سال فرحت حسین کے پاس رہ کر تنظیمی امور میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ فرحت حسین کے انتقال کے بعد اپنے دو بھائیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ سفر حج کو روانہ ہو گئے۔ حجاز سے افغانستان آئے اور وہاں سے سوات سید اکبر شاہ کے پاس چلے گئے جو سرحد پر وہابیوں کے پرانے سرپرست اور میزبان رہے تھے۔ وہاں وہ وہابی نو آبادی کے سردار منتخب ہوئے۔ غزوہ امبیلہ انہیں کی قیادت میں لڑا گیا۔ ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بھائی عبدالکریم ان کے جانشین ہوئے۔ قلعہ کی تعمیر، توپ اندازی اور سواری کے فنون میں ان کی مہارت مسلّم تھی۔

عبدالرحیم: فرحت حسین کے بیٹے تھے۔ ۱۴ر شعبان ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں متولد ہوئے ابتدائی تعلیم خاندان کے متعدد بزرگوں جیسے فیاض علی و عبدالحمید وغیرہ سے حاصل کی، ان کے والد کی وفات اور عبداللہ کی سرحد پر تعیناتی کے بعد گھر میں تنظیمی کاموں کا سارا بوجھ ان کے اور یحییٰ علی کے کاندھوں پر پڑا۔ انبالہ کے مقدمے میں یحییٰ علی کے ساتھ یہ بھی مدعا علیہ تھے اور حبس دوام کے سزا یاب ہوئے۔ اٹھارہ سال سزا بھگتنے کے بعد ۱۸۸۳ء میں ان کی میعاد سزا ختم کی گئی، پٹنہ واپس آئے۔ اور اپنا آبائی مکان ایسا منہدم پایا کہ اس کی شناخت بھی ناممکن تھی۔ تمام افراد خاندان منتشر تھے۔ خاندانی مقبرہ بھی جو گزشتہ چودہ پشتوں سے مستعمل تھا باقی نہ چھوڑا گیا تھا۔ رہائی کے بعد بھی ان کی نقل و حرکت پر سیاسی پابندیاں برقرار تھیں۔ ہر دو ہفتے پر پولیس میں حاضری دینا پڑتی تھی۔

قید میں بیس برس وطن سے غیر حاضری کے بعد اب انہوں نے اپنے عزیزوں اور تمام شہر

کی زندگی میں ایسا انقلاب پایا کہ تمیز و شناخت ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اس نئی دنیا اور متغیر ماحول میں، جو ان کی نگاہ میں غیر دینی اور غیر اخلاقی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا اور افسردہ پاتے تھے۔ اس لیے انھوں نے حکومت سے سفرِ حج کی اجازت طلب کی جو بڑی بڑی مشکلوں سے منظور ہوئی۔ بمبئی اور حجاز تک پابندیاں برقرار رکھی گئیں۔ حجاز میں بھی ان کو برطانوی کونسل میں حاضری دینے کا حکم تھا۔ بعد میں ۱۳۱۰ھ میں ایک اور حج کیا۔

انڈمان سے مراجعت کے بعد انھوں نے اپنی خانگی زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر جوڑا۔ اس زمانے میں ان کے کچھ اولاد ہوئی اور اپنی کئی اولاد کی شادیاں کیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے خاندان کے ارکان کی سوانحی روداد یں تیار کیں جو تذکرہ صادقہ کے نام سے زیادہ معروف ہیں اور جو تحریک کے اہم ترین مطبوعہ مآخذ میں سے ہے۔ وہ ۹۲ سال کی پختہ عمر میں ۱۹۲۳ء میں رحلت فرما ہوئے۔

باقر علی: فتح علی کے بھائی بشارت علی کے بیٹے اور ولایت علی کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کی کمسنی میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور چچا نے ان کی پرورش کی۔ سید احمد کے سرحد کے ابتدائی قیام کے دوران میں وہ رسد کی تقسیم پر متعین تھے۔ ذخائر کے حصول، تحفظ اور تقسیم کے عام کاموں میں محمد ولی پھلتی کے معاون تھے۔ ان کو یہ امتیاز نصیب تھا کہ وہ پہلے مجاہد تھے جس نے اپنے مقصد معینہ کے لیے جان دی۔ وہ ۳۰ر دسمبر ۱۸۲۶ء کو معرکہ اکوڑہ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف انیس سال تھی۔

قمر الدین حسین: رکن الدین حسین کے بیٹے اور مغلپورہ (پٹنہ سٹی) کے رفیع الدین حسین خاں کے پوتے تھے۔ ان کی شادی احمد اللہ کی بہن سے ہوئی تھی۔ سید احمد کے ہمرکاب سرحد گئے تھے۔ اور مظہر علی جب پشاور کے قاضی مقرر ہوئے تھے تو یہ بھی وہیں متعین کیے گئے تھے، اور مظہر علی ہی کے ساتھ سلطان محمد والے ناگہانی مسلح انقلاب کا شکار ہوئے۔ ان کی بیوہ کا عقد ثانی ولایت علی سے ہوا۔

عبد العلی: ارادۃ اللہ صادقپوری کے بیٹے تھے۔ وہ بنگال کے نواب مظفر جنگ کے عہد نظامت میں پٹنہ میں جج کے عہدے پر مامور تھے۔ وہ زاہدانہ فقیرانہ اور فیاضانہ طبیعت رکھتے تھے۔

نواب نے اُن کو اعزازی خلعت اور بہت کچھ انعامات بخشے، سب مسکینوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیے، خود قرآن مجید کی نقلیں لکھ کر ان کی فروخت سے گزارہ کرتے۔ سید احمد جب پٹنہ میں وارد تھے تو انھوں نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صادقپور کے قائدین کے نام سید احمد کے مکتوبات میں ان کے نام بھی ایک مکتوب تھا۔ وہ ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹/۳۰ء) میں تقریباً ایک سو سال کی عمر میں رحلت فرما ہوئے۔

مظہر علی: اگرچہ خاندان صادق پور کے رکن نہ تھے مگر تحریک کے اہم مقامی قائدین میں سے تھے اور ان کی ابتدائی زندگی کا ایک مختصر تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ انہوں نے غالباً سید احمد کے دورۂ پٹنہ سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سید احمد اپنے پٹنہ کے دورہ کے دوران میں کچھ دن ان کے ہاں رہے۔

مظہر علی تحریک کے ایک جوشیلے اور بہادر کارگزار تھے۔ ایک جلوس کے تعزیے کو نقصان پہنچانے کے الزام میں ان پر مقدمہ قائم کیا گیا تو بھاگ کر گورکھپور چلے گئے۔ بعد میں جب سید احمد سے ان کی ملاقات ہوئی تو فرار ہو کر اپنے ضمانتوں کو پریشانی میں ڈالنے پر اُن کو سرزنش کی اور واپس جانے کی ہدایت کی جس کی انہوں نے تعمیل کی، مگر ان کے پٹنہ پہنچنے سے پہلے مقدمہ اُٹھالیا گیا تھا۔

وہ سید احمد کے ہمراہ سرحد گئے اور بہت سے معرکوں میں حصہ لیا۔ شاہ اسماعیل نے غزوۂ مردان میں ان کی بہادری کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے، ۱۸۳۱ء میں جب پشاور پر قبضہ ہوا اور اُس کے شکست خوردہ سردار سلطان محمد کو پھر لوٹا دیا گیا تو سید احمد نے مظہر علی کو اپنے نمایندہ کی حیثیت سے وہاں چھوڑ دیا تھا۔ وہ قاضی اور اخلاق عامہ کے محتسب بھی مقرر کیے گئے تھے۔ وہابیوں نے جو ادھورا عارضی نظام حکومت قائم کر لیا تھا اُس میں یہ عہدے کلیدی اہمیت رکھتے تھے۔ اُن کا یہ تقرر دلیل تھا ان کی پرہیزگاری، علمی فضیلت اور اُس اعتماد کا جو سید احمد ان پر رکھتے تھے۔ پشاور کے قیام میں ان کو سلطان محمد کے غدارانہ منصوبے اور متوقع اچانک حملے کی بھنک ملی، شاہ اسماعیل کو پوری صورت حال لکھ بھیجی شاہ صاحب نے ایک طویل مراسلے میں سلطان محمد کے طرف داروں کے متعدد اتہامات کا جواب دیا جن کی مظہر علی نے ان کو اطلاع دی تھی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے وقت پر پشاور سے نکل جا سکتے

تھے لیکن وقت ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے اس زبوں صورت حال کا پورا اندازہ کرنے اور اپنے سردار کو رپورٹ دینے کے لیے وہیں ٹھہر گئے۔ آخر وہ سلطان محمد کے اچانک غدارانہ حملے میں نہایت بے رحمی سے قتل کیے گئے۔

---

(۲)

سیّد احمدؒ کا ایک نایاب غیر مطبوعہ مکتوب

سید احمدؒ کے مکتوبات کے شائع شدہ اور مخطوطہ مجموعے بہت سے موجود ہیں۔ مگر یہ مکتوب کسی مجموعے میں موجود نہیں۔ یہ بالخصوص خاندان صادق پور کے ارکان کے نام ہے اور اسی کی ایک نقل اسی خاندان کے ایک[1] رکن کے پرانے کاغذات سے دستیاب ہوئی۔

اس کے مکتوب الیہ خاندان صادق پور کے سارے اہم ارکان اور ضلع پٹنہ کے دوسرے مومنین ہیں۔ سوء اتفاق سے اس میں تاریخ تحریر درج نہیں۔ مگر اس کے وقت کا کچھ اندازہ اس کے مضمون سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سرحد سے ولایت علی اور عنایت علی کی رخصت کے کچھ بعد لکھا گیا۔ اور یہ واقعہ سنہ ۱۸۲۸ء کے بعد کا ہو سکتا ہے۔ یا سنہ ۱۸۲۷ء کے آخر کا۔ کیوں کہ ولایت علی کی محل ثانیہ حیدر آبادی سے عبد اللہ کی پیدائش سنہ ۱۲۴۶ھ (۳۱-۱۸۳۰ء) کے کسی مہینے میں ہوئی۔ ولایت علی کے سرحد سے دکن پہنچنے، حیدر آباد میں قیام کرنے اور شادی کرنے میں صرف وقت کا اندازہ کر کے ہم حیدر آباد میں اُن کے پہنچنے کا اندازی وقت دیر سے دیر وسط سنہ ۱۸۲۸ء قرار دے سکتے ہیں۔

پورے مکتوب کا انگریزی ترجمہ درج ذیل ہے۔

از امیر المومنین سید احمد بخدمت جامعین علم و فضل، مخازنِ صدق و ایمان ... مولانا عبد العلی، فتح علی، الٰہی بخش، اکرام الحق، واعظ الحق، منعم الحق، محمد حسین۔ شیخ علی جان، السید

---

[1] مولوی عبد الغفار صادق پوری متذکرہ بالا کے بیٹوں کے پاس ہے۔

جمال علی و دیگر مومنین عظیم آباد [1]

بعد تحیاتِ سلام و دعائے حسنات واضح باد:۔

آپ کے خطوط ملے اور ان کے مضامین سے تمام حالات مجھ پر منکشف ہوئے۔ الحمد اللہ میں مع الخیر ہوں۔ دن رات مقصد کی ترقی کے لیے مصروف کار رہتا ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے جہاد کے قیام اور کفار کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بہت کچھ امداد حاصل ہوگئی ہے۔ اس ملک کے مومنین، شرفا، عوام اور سادات، سب کے سب جہاد اور اپنی جانیں نثار کرنے کے لیے تیار ہیں اور میری اطاعت کا عہد قبول کر لیا ہے، انشاء اللہ فتح کی خبر آپ کو جلد مل جائے گی۔

ہر ذرہ مخلوق، اللہ کی رضا جوئی اور خالق کے لیے جاں سپاری میں مصروف ہے۔ اس کی محبت ہر ماسوا کی محبت سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ گو اس اعلیٰ درجے کے اخلاص و ایمان اور اس بلند (روحانی) مرتبے کا حصول عوام الناس کے لیے دشوار ہے۔ مگر ہر شخص پر جو دین (اسلام) کا متبع ہے اتنا تو فرض ہے کہ نور و ظلمت کے درمیان کش مکش اور کفر و اسلام کے درمیان جنگ میں اسلام کی آبرو کے جذبے کو بروئے کار لائے۔ ہر وہ شخص جو ایسے نازک موقع پر انصار کی صف میں شامل نہ ہو وہ فسق کا مجرم ہے، اور جو شخص جان کے خوف سے اس نازک گھڑی میں کترا جائے اپنی بدبخت پیشانی پر اللہ سے علیحدگی کا داغ لگانے کا مرتکب ہے [2]

---

[1] مکتوب الیہم میں عبد العلی، فتح علی، الٰہی بخش اور محمد حسین خاندان صادق پور کے ارکان ہیں جن کے سوانح پیش کیے جا چکے۔ اکرام الحق اور واعظ الحق پہلے باڑھ کے باشندے تھے۔ سید احمد کے باڑھ کے دورے کے موقع پر اکرام الحق نے ان سے بیعت کی تھی۔ علی جان دانا پور کے باشندے تھے اور سید احمد کے دانا پور کے دورے کے موقع پر ان سے بیعت کی تھی اور بہت بعد تک تحریک کے لیے کام کرتے رہے۔

[2] یہاں ایک خط کھنچا ہوا ہے۔ عبارت کا تسلسل منقطع سا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کی عبارت میں عام اصول کے بیان سے ہٹ کر یک بیک ایک خاص امر ترسیل کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔

مجاہدین کی فتوحات مومنوں کے لیے ایمان افروز اور منافقوں کے لیے دل سوز ہیں۔ اطمینان رکھیے۔ آپ نے ۲۱۶۸ روپے کی ہنڈی کے بارے میں جو لکھا تھا کہ شیخ عبداللطیف کو بھیج دی گئی ہے وہ مجھے پہنچا دیں۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ :۔ اسی مضمون کا شیخ عبداللطیف کا ایک خط مجھے ملا جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ انھوں نے ایک سات ہزار کی ہنڈی بھی مجھے روانہ کی ہے۔ مگر یہ رقم اب تک مجھے نہیں ملی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی مل جائے گی۔ اس طرح جو رقمیں آپ حضرات نے ارسال کیں وہ معتًا مل گیئں۔ مگر واضح رہے کہ اب سے پہلے روپے کی ترسیل بند رہی اور کچھ وصول نہ ہوا تھا۔ اب اللہ کے فضل سے ترسیل زر کا ایک آسان تر ذریعہ دریافت کر لیا گیا ہے۔ مومنین مخلصین کو چاہیے کہ روپے مولانا اسحاق کے نام دہلی بھیجا کریں۔ وہاں سے مجھے مل جایا کریں گے۔ میں نے ان کو (اسحاق کو) ایک آسان اور محتاط (آنکھوں میں خاک جھونکنے کا) طریقہ لکھ بھیجا ہے۔ چنانچہ مجاہدین کے اخراجات کے لیے دو یا تین ہزار روپے وصول بھی ہو چکے۔ لہٰذا جو کوئی رقم بھیجنا چاہے وہ اس کی ہنڈی مولانا اسحاق کو دہلی بھیج دیا کرے۔ وہاں سے مجھے مل جایا کرے گی۔

مولوی ولایت علی، محمد زکی الشیخ، باقر علی، قمرالدین حسین اور شیخ علی جان نے بھی خط لکھے ہیں۔ ان کی رسیدیں مرسلہ رقوم کی وصولی کے بعد بھیج دی جائیں گی، اطمینان رکھیے۔ میں نے (پہلے) ولایت علی کو مفوضہ کام کے لیے دکن بھیجا تھا۔ مولوی عنایت علی بھی میرے کہنے سے اس ضلع (پٹنہ) کو روانہ ہو گئے۔ اس ضلع کے باقی لوگ مع الخیر ہیں بجز مولوی طالب حسین کے جو طبعی موت سے انتقال کر گئے (ان کے عزیزوں کے لیے) یہ صبر و تحمل کا وقت ہے۔ حافظ قطب الدین مومنین اور مخلصین کی تعلیم کے لیے (ادھر؟) تعینات کر دیے گئے ہیں۔ اگر وہ اس ضلع (پٹنہ) میں پہنچ جائیں تو ان کی اعانت و تعاون کی کوشش کرنا۔

والسلام

(۳)

وہابی مراسلات میں مستعمل اصطلاحات اور سازشیوں کے عرفی ناموں کی کلید[1]

زنگر وٹوں کو جہادی، خدمت گار، بیوپاری، مسافر، ٹرگا و کہتے تھے۔ زنگر وٹوں کی ٹولیوں کو قافلہ

ملکہ وستھانہ کو بڑا گو دام اور پٹنہ کو چھوٹا گو دام کہتے تھے۔

جھڑپ یا معرکے کو مقدمہ، خدا کو مختار۔ اشرفی کو بڑا سرخ لعل، بڑے سنہرے جوتے اور بڑی چڑیاں۔ نصف اشرفی کو چھوٹے سرخ دانے اور چھوٹے سنہرے جوتے کہتے۔

اشرفیوں کے ارسال کو سرخ دانوں کی تسبیح۔ ہنڈی کو سنگ سفید کہتے، اور رقوم کی تعداد کو تسبیح کے سفید دانوں کے عدد سے ظاہر کرتے۔

روپے کے ارسال کو کتابوں اور سودے کی قیمت ظاہر کرتے۔

پٹنہ میں صادق پور کے مولویوں کی عمارات بالخصوص اس حصے کو جو ولایت علی اور عبدالرحیم کا تھا قافلہ کہتے تھے۔

اسمائے عرفی :-

احمد اللہ کے : احمد علی، محمد علی، یا احمد خاں۔

عبداللہ کے : بابو صاحب، بابو جان، خاں صاحب، یا بابو، میاں جان، خاں صاحب۔

فیاض علی کے : بصیر الدین یا فیاض عالم۔

عیسیٰ کا : روح اللہ

حافظ عبدالمجید کا : حافظ صاحب

یحییٰ علی کا : محی الدین

محمد شفیع کا : شفاعت علی

عبدالکریم کا :- کریم بخش

عبدالرحیم کا :- مرزا رحیم بیگ

قاضی میاں جان کا قاضی محمد شکور یا عبدالرحمٰن

عیسائی یا برطانوی سپاہ و ثنائے حضرت روح اللہ (عیسیٰ مسیح) کہلاتے۔

---

[1] حکومت بنگال کی دستاویزات سے انتخابات جلد ۲ ہم صفحہ ۱۶۱ و ۱۶۲

غزوۂ امبیلہ کے موقعہ پر عبداللہ اور سید عمران کا مشترک مکتوب ایک سرحدی قبائلی سردار کے نام

(انگریزی ترجمہ)

سلام کے بعد، کفار کی ایک بڑی فوج سیلم خاں، یار حسین اور شیخ جانا پر اس ملک کی غارتگری کی غرض سے آئی ہے۔ اس لیے تم کو لازم ہے کہ اس خط کے ملتے ہی اپنی کمر کس لو اور چملا کی طرف روانہ ہو جاؤ، اور درہ (امبیلہ) کے دوسرے حلیفوں میں اعلان کر دو کہ سرپٹی اور لنڈائی یعنی وادی جنگلاتی پر قبضہ کرلیں، اور اپنی (دفاعی) طاقت کو مستحکم بنالیں۔ اس ہدایت کی تعمیل میں تمہیں ایک لحظہ بھی دیر نہ کرنا چاہیے۔ اگر اس میں تاخیر یا سستی ہوئی تو مفسد کفار تمام پہاڑی خطے، خصوصاً چملا، بنیر، سوات وغیرہ کے صوبے لوٹ کر غارت کر دیں گے اور اپنے علاقوں سے ان کا الحاق کرلیں گے۔ تب ہمارا دین و مذہب اور دنیاوی املاک سب کچھ تحس نحس ہو جائے گا۔ اس لیے اسلام اور ایمان کے تقاضے اور دنیاوی مفاد کو مدنظر رکھ کر تم کو اس موقع پر غفلت نہ برتنا چاہیے۔ یہ کفار انتہائی دھوکے باز اور غدار ہیں، جس طرح بھی ممکن ہوگا ان پہاڑوں پر آ جائیں گے اور ملک کے عوام میں اعلان کریں گے کہ "ہمیں تم سے کوئی بیر نہیں، ہماری لڑائی ہندوستانیوں سے ہے ہم تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے، اتنا بھی نہیں کہ کسی کے سر کا ایک بال بھی بیکا ہو، ہندوستانیوں کو فنا کر کے فوراً واپس چلے جائیں گے اور تمہارے ملک میں ہم کوئی مداخلت نہ کریں گے۔" وہ عوام کو مال و دولت کا لالچ بھی دیں گے اس لیے تمہیں واجب ہے کہ ان کے فریب میں نہ آؤ ورنہ جیسے ہی وہ موقعہ پائیں گے وہ تمہیں بالکل تباہ و برباد کر دیں گے، آزار پہنچائیں گے طرح طرح کی رسوائیاں دیں گے۔ تمہارے تمام مال و املاک پر قبضہ کرلیں گے اور تمہارے دین کو بھی ضرر پہنچائیں گے۔ اس وقت تمہیں یاس و حسرت کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ ہم اس معاملے کو تمہارے ذہن نشین کیے دیتے ہیں [1]

مہر سید عمران	مہر عبداللہ

---

[1] پیگٹ اینڈ میس متذکرہ بالا

(۵)

جے ایچ ریلی، این گھوش ڈی آئی جی اور سب انسپکٹر پولیس اسپیشل ڈیپارٹمنٹ صوبہ جات زیریں کے عیارانہ اور من مانے طریق کار کی روداد

اگست ۱۸۶۷ء میں نوبوکسٹو گھوش سب انسپکٹر پولیس کے خلاف ایک نالش کی گئی کہ اس نے ایک شخص تلوک سنگھ پر کچھ تھالیوں کی چوری کا الزام لگا کر مستغیث کو دق کرنے اور نقصان پہنچانے کی غرض سے اور عداوت سے ناجائز طور پر فوجداری مقدمہ قائم کر دیا تھا۔ ای ڈرومنڈ۔ مجسٹریٹ پٹنہ کی عدالت میں نالش کی سماعت ہوئی۔ اس نے ۱۹ اگست کو ملزم گھوش کو عدالت سشن کے سپرد کر دیا۔

ڈبلیو اینلی سشن جج کی عدالت میں اس کی سماعت[1] ہوئی۔ جج کی اعانت کے لیے ایک جیوری بھی مقرر ہوئی۔ ملزم پر مستغیث کو نقصان پہنچانے کی غرض سے اس کے خلاف ناجائز مقدمہ قائم کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔

جیوری نے بھی اسے مجرم قرار دیا اور اسے ایک سال کی قید سخت اور ایک سو روپے جرمانہ کی سزا دی۔ جج نے بھی جیوری کی تجویز سے اتفاق کیا۔

اس مقدمے میں اینلی کا فیصلہ اُس آزادانہ اور دلیرانہ طرز عدالت کی بہترین روایات میں سے ہے جن میں قانون کے آگے تمام انسان امیر و غریب کی مساوات یکساں قائم رکھنے کے لیے نہایت مستعدی اور باریک بینی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس فیصلے کے کچھ ضروری اقتباسات ذیل میں اس لیے پیش کیے جاتے ہیں کہ ریلی اور اس کے ماتحت پٹھوؤں نے کے عیارانہ اور من مانے طریق کار کی نشان دہی کرتے ہیں۔

"اس مقدمے میں کوئی حکم، خواہ وہ حکومت ہی کا کیوں نہ ہو، کسی ایسے فعل کے لیے سند نہیں ہو سکتا جو ملک کے تحریری قانون کے خلاف ہو، چہ جائیکہ وہ حکم کسی ادنیٰ حاکم کا ہو۔ اگر مسٹر ریلی نے ملزم کو بے داغ ٹھہرانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے تو وہ اسے پورا کرے اس سے

---

[1] محافظ خانہ عدالت ڈسٹرکٹ جج پٹنہ۔ بنڈل ۱۱ دستہ ۱۸۶۷ء) مقدمات سشن ۱-۵۶

مجھے کوئی بحث نہیں۔ مجھے جس چیز سے بحث ہے وہ یہ ہے کہ قانون کو اپنے راستے پر چلنا ہے، اور یہ کہ اس عدالت میں ملزم کے خلاف جو الزام پیش کیا گیا ہے وہ اس عدالت کے احاطۂ اختیار میں ہے اور اُس کی جانچ کو آخر حد تک پہنچانا ہے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ مقدمہ کے زور یا کمزوری سے ملزم سزایاب ہو یا رہا ہو جائے۔ میرا فرض ہے کہ میں اس عذر کی جانچ کروں جس کی بنا پر اس عدالت کو کارروائی روک دینے کی درخواست کی گئی ہے۔ میں نہیں مانتا نہ کوئی ہوشمند انسان مان سکتا ہے کہ حکومت نے مسٹر ریلی اور ان کے ماتحتوں کو کبھی ہدایت کی ہوگی یا اختیار دیا ہوگا کہ وہ جس کو چاہیں لاکھا دو سادھ جیسے مخبر کی اطلاع پر بے لاگ شہادت سے یہ اطمینان کیے بغیر کہ بقرینۂ غالب الزام درست ہے گرفتار کر لیں۔ اس کے بعد، نہ کہ قبل، ایسا اقدام کریں جس میں ان کے ہموطن رعایا کی جو قانون کے آگے ان کے برابر ہیں آزادی ہی نہیں بلکہ جان کا خطرہ بھی متصور ہو........

اب میں اس کا جائزہ لیتا ہوں کہ اسپیشل پولیس قانون کے ان حصوں کی پابند نہیں جن کا تعلق تھانے کے پولیس افسروں سے ہے..... مسٹر ریلی کہتے ہیں کہ ان کے محکمہ کو کیا اختیارات ملے ہیں وہ نہیں بتا سکتے، نہ وہ حکومت کے کسی ایسے حکم کا حوالہ دے سکتے ہیں جس سے یہ اختیارات ظاہر ہوں، میں یہ نہیں مان سکتا کہ اگر وہ چاہتے تو مجھے اس سے آگاہ نہ کر سکتے تھے یا یہ کہ ان کا حافظہ اتنا کمزور ہے جیسا کہ اس مقدمے کی سماعت میں معلوم ہوتا ہے ایسے محکمہ کے صدر ہونے کے پیش نظر میں اسے باور نہیں کر سکتا.....[1]

اس مقدمے کا کوئی تعلق وہابیوں سے نہ تھا۔ مگر یہ ۱۸۶۸ء میں ٹھیک وہابیوں کی تفتیشوں کے

---

[1] یہ روداد سماعت سشن سے متعلق ہے جس میں گھوش سزایاب ہوا۔ لیکن بعد میں غالباً وہ رہا کر دیا گیا۔ ورنہ ۱۸۶۸ء اور بعد میں وہ ملازمت میں نہ ہوتا۔ مگر ان کاغذات میں اُس کی رہائی کا کوئی ذکر نہیں۔

آغاز میں وقوع میں آیا۔ اس ڈرامہ میں دو ایکٹر تو وہی ہیں جو وہابیوں کی تحقیقات میں تھے۔ اس مقدمے میں ان کے جس من مانے اور انتقامی طریق کار پر جج نے اس سختی سے تازیانے لگائے ہیں وہ ان کی بعد کی کارروائیوں کا بھی ٹھیک نمونہ ہیں۔ یہ مقدمہ ریلی کے جابرانہ نظام کا کچھ پتا دیتا ہے جس کا خیال تھا کہ اس کا اسپیشل محکمہ ملک کے عام قوانین سے بلند ہے اور اس کو کامل اختیار حاصل ہے کہ جس کسی کو چاہے گرفتار کرلے اور اس پر مقدمہ چلا دے۔

یہ مقدمے پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر کے غصے اور غیر معمولی برافروختگی کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ ریلی نے ایسے بدنام آدمی کو پٹنہ میں (جہاں وہ سزایاب ہوا) وہابیوں کے خلاف تفتیشوں کے لیے متعین وفد پر مسلط کیا تھا۔

---

(۶)
سید احمدؒ کے بعض مکتوبات شائع کردہ محمد جعفر و مندرجہ نسخہ مخطوطہ کی مختلف تعبیرات

(ترجمہ انگریزی)

سوانح احمدی	نسخہ مخطوطہ پٹنہ یونیورسٹی
(۱) رنجیت سنگھ کی طرح ہمیں طاقت اور وسائل میسر نہیں، اگر تم سے کس نے کہا کہ امام اس قلیل طاقت سے لاہور پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس کے برعکس وہ دن رات مسلمانوں کے وسائل میں اضافہ کرنے کے لیے کوشاں ہے (صفحہ ۲۸۹-۹۰)	(۱) رنجیت سنگھ اور کمپنی جیسی طاقت اور وسائل ہمیں میسر نہیں مگر تم سے کس نے کہا کہ امام اس قلیل طاقت سے لاہور اور کلکتہ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے (بعد کی عبارت وہی ہے۔ (صفحہ ۹۹)
(۲) میرا اصل مقصد پنجاب کے سکھوں کے خلاف جہاد قائم کرنا ہے اور افغانستان اور باغستان کے ملکوں میں بیٹھے رہنا نہیں (صفحہ ۲۴۸)	(۲) میرا اصل مقصد جہاد قائم کرنا اور جنگ کو ہندوستان میں جاری رکھنا ہے اور سرزمین خراسان میں بیٹھے رہنا نہیں (صفحہ ۸۱)
(۳) دراز مو کفار (سکھ) جو پنجاب پر مسلط ہیں وہ	(۳) عیسائی کفار جنہوں نے ہندوستان پر قبضہ کر رکھا ہے بڑے عیار اور دغاباز ہیں (ص ۳۹)

بڑے کارآزمودہ، چالاک اور دغاباز ہیں (ص۲۶۱)

(۴) بدنہاد سنگھ اور بدبخت مشرکین نے دریائے سندھ کے سواحل سے دارالحکومت دہلی تک ہندوستان کے مغربی حصوں پر تسلط جما رکھا ہے (ص۲۵۷)

(۴) بدنہاد عیسائیوں اور بدبخت مشرکین نے ہندوستان کے بہت سے حصوں پر دریائے سندھ کے ساحل سے سمندر کے سواحل تک جو چھ مہینوں کی مسافت ہے تسلط جما رکھا ہے (صفحہ ۳۹)

واضح رہے کہ ع۱ میں دو معنی خیز الفاظ "کمپنی" اور "کلکتہ" "رنجیت سنگھ" اور "لاہور" کے بعد حذف کر دیے گئے ہیں۔ نمبر۲ میں "ہندوستان میں جہاد" کے عوض "سکھوں کے خلاف جہاد" درج کیا گیا ہے۔ نمبر۳ میں "عیسائی کفار" کی جگہ "درازموکفار" (سکھ) درج کیا گیا۔ نمبر۴ میں "سمندر کے سواحل" کے عوض "دہلی" درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کا توضیحی فقرہ "چھ مہینے کی مسافت" بالکل حذف کر دیا گیا ہے ورنہ عبارت میں تضاد واقع ہو جاتا۔

---

(۷)

وہابی اور خلاف وہابی نگارشات پر تبصرہ

وہابی نگارشات:۔

وہابی تحریک نے اردو نثر نگاری کی رفتار کو بالخصوص بہار میں[1] بہت ترقی بخشی کیونکہ بہار ایک مدت دراز تک برطانوی ہند میں اس کا صدر مقام رہا۔ تحریک اصلاً تبلیغی تھی اور ایسی تمام تحریکوں کی طرح اس نے عوام کے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچنے کے لیے زیادہ تر مقامی زبانوں سے کام لیا جن کو عوام زیادہ سمجھ سکیں۔ وہابی سربراہوں نے مختلف کثیر التعداد اور کتابچے تحریر کیے۔ ان میں سے زیادہ تر مذہبی اور سماجی موضوعات پر ہیں جن میں مختلف مذہبی نظریات کی تشریح آسان زبان میں کی گئی ہے تاکہ عوام الناس ان کو بلا استمداد غیرے سمجھ سکیں۔ انہوں نے اکثر مذہبی اور سماجی رسوم پر بھی لکھا ہے جن میں کچھ رسوم کی نمائشی پیروی کے عوض

---

[1] پروفیسر اختر احمد اُرینوی نے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" میں اردو نثر کی ترقی میں وہابیوں کی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۷ء۔

ان کے حقیقی مفہوم اور روح معنے کو سمجھنے پر زور دیا گیا ہے۔

وہابی مصنفین اپنی تحریروں میں باغیانہ مضمون سے بہت احتیاط برتتے تھے۔ ایسے مضامین وہ دورہ کرنے والے واعظین کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ اس پر بھی بعض جوشیلے سرکاری افسر خالص مذہبی رسالوں میں بھی غلط معنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تاہم بعض وہابی تصانیف جیسے جہاد نامہ اور حارق الاشرار میں دین اور آزادی کے لیے جہاد کی فضیلت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اکثر وہابی رسائل اب ناپید ہیں۔ وہابی خود حکومت کے مخالف سمجھے جاتے تھے اس لیے ان کی تحریریں بھی مشکوک تصور کی جاتی تھیں۔ لوگ اس بات سے خوف زدہ رہتے تھے کہ یہ خطرناک تصنیفات ان کے پاس پائی جائیں اس لیے ان کو علیحدہ کر دینے کی کوشش میں رہتے تھے چنانچہ رفتہ رفتہ یہ ضائع ہو گئیں۔

اپنی اس کتاب کی تالیف کے دوران میں پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر کے دفتر میں مجھے کچھ وہابی رسالے اور چند گمنام رسائل ملے جن پر یہ شبہ تھا کہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین کے تحریر کردہ ہیں۔ ان سے متعلق کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے ان کو قابل اعتراض قرار دیا اور غالباً ممنوع بھی۔ کچھ اور رسائل مطبوعہ و مخطوطہ، دونوں، پٹنہ اور دوسرے مقامات کے لوگوں کے نجی کاغذات سے دستیاب ہوئے۔ ان میں سے اکثر خاندان صادقپور کے اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں اور کچھ بے نام ہیں۔

کچھ وہابی کچھ مخالف وہابی رسالوں کی مختصر توضیحی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے:[1]

اکابر صادق پور کی تحریرات کا سب سے مشہور مجموعہ جو عام طور پر دستیاب[2] ہے وہ رسالہ تسعہ مطبوعہ مکتبۂ فاروقی دہلی ہے۔ صفحات ٥٦

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ نو رسالوں کا ایک مجموعہ ہے جو ولایت علی / عنایت علی اور فیاض علی نے مختلف موضوعات پر لکھے تھے۔ ان میں سے کچھ اردو میں اور کچھ فارسی

---

[1] نیز ملاحظہ ہو آور انڈین مسلمان صفحہ ٦٦-٦٧ بعض وہابی رسائل کی فہرست کے لیے۔

[2] اب دستیاب نہیں (مترجم)

میں ہیں (جن کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے) ایک عربی میں ہے۔ اس مجموعہ میں حسب ذیل رسالے ہیں:-

ا۔ رسالہ ردّ شرک فارسی، صفحات ۱-۲۹۔ یہ ولایت علی کی تالیف ہے مع ترجمہ از الٰہی بخش (بڑاکری) دونوں کے متن پہلو بہ پہلو ایک ہی ایک صفحے میں ہیں اور ان کے درمیان میں ایک خط کھنچا ہوا ہے۔ زبان آسان اور بامحاورہ ہے۔ یہ شاہ اسماعیل کے مشہور رسالہ تقویۃ الایمان کا خلاصہ ہے جو ہدایۃ التوحید کے نام سے ۱۳۱۴ھ میں مطبع دارالسلطنت کلکتہ سے علیحدہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ صفحات ۴۷

ب۔ رسالہ عمل بالحدیث فارسی۔ صفحات ۳۰-۴۵۔ مولفہ ولایت علی مع ترجمہ اردو از آلٰہی بخش (بڑاکری) آسان اور شستہ اردو میں دونوں کے متن (ا) کی طرح ایک ہی صفحے پر درج ہیں۔ یہ فقہ اسلامی کے مختلف مسائل پر ہیں۔

ج۔ اربعین فی المہدیین۔ عربی مع ترجمہ اردو۔ صفحات ۳۰-۴۵۔ مولفہ ولایت علی۔ یہ مہدی یا مسیح کے ظہور سے متعلق ۴۰ احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ رسالہ سید احمد کے ظہور ثانی کے عقیدے کا اظہار ہے جو کچھ عرصے تک وہابیوں کے ایک گروہ میں پھیلا ہوا تھا۔

د۔ رسالہ دعوت اردو صفحات ۶۴-۷۸ مصنفہ ولایت علی۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو سید احمد کی تعلیمات قبول کرنے اور بیعت کرنے کی دعوت دیتا ہے اور ظہور ثانی کے عقیدے کا بھی کچھ بیان ہے۔

ہ۔ رسالہ تنبیر الصلوٰۃ، ۷۹-۸۷-۹۴ مصنفہ ولایت علی۔ اس میں مختلف قسم کی نمازوں کا ذکر ہے۔

اس رسالے کا ایک غیر مورخہ مخطوطہ نسخہ[1] مجھے فی الحال سورج گڈھ کے ایک صاحب کے نجی ذخیرے سے دستیاب ہوا ہے۔ سورج گڈھ ضلع مونگیر بہار میں وہابیوں کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔

و۔ رسالہ شجرہ باثمرہ[2]۔ اردو۔ صفحات ۸۸-۹۴ مصنفہ ولایت علی، لبعض مزوجہ

---

[1] اب دستیاب نہیں (مترجم) [2] شاید یہ شجرہ بے ثمر ہے (مترجم)

صوفی طریقوں اور پیروں کی تعظیم میں غلو کے رد میں لکھا گیا ہے۔

ز۔ رسالہ بت شکن اردو۔ صفحات ۹۴-۱۰۶ مصنفہ عنایت علی۔ یہ طنزیہ طرز پر لکھا گیا ہے اور ان لوگوں کی تضحیک کی گئی ہے جو تعزیے نکالتے اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔اسی اسی موضوع پر کچھ اردو اشعار بھی ہیں۔

ح۔ رسالہ منبع الفیوض۔ فارسی۔ صفحات۔ ۱۰۶-۱۳۸ یہ مکالمہ ہے۔ جس میں مختلف مذہبی مسائل پر فیاض علی سے سوالات اور ان کے جوابات ہیں پہلے یہ فیض الفیوض کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ بعد میں فارسی متن مع ترجمہ اردو از الٰہی بخش (برڑاکری) منبع الفیوض کے عنوان سے شائع ہوا اور اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا۔

ط۔ بیان الشرک، اردو صفحات ۱۴۲-۱۵۶ مولفہ ولایت علی۔ یہ دراصل رسالہ کی نظر ثانی اور کچھ اضافہ ہے۔

مولوی عبدالغفار صادق پوری کے ذخیرہ کتب میں مختلف مسائل جیسے ادائے عبادات نکاح بیوگان، جہاد وغیرہ پر کچھ رسالے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے بعض نا تمام ہیں اور ان کے لکھنے والوں کے نام اور مقام و تاریخ اشاعت کی دریافت ممکن نہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) رسالہ، نماز، اردو صفحات ۱-۱۷ و تفسیر سورہ فاتحہ اردو صفحات ۱۸-۲۸ دونوں ایک ساتھ مجلد ہیں اور محرم ۱۲۶۸ھ میں مصری گنج پریس کلکتہ سے شائع ہوئے۔

(۲) رسالہ نماز بامعنی[1]، اردو۔ صفحات ۱-۴ نماز ادا کرنے کے طریقے سے متعلق ہے

رسالہ جہادیہ۔ اردو نظم صفحات ۵-۷ اوکینلی نے اس نظم کا پورا ترجمہ انگریزی میں کر کے اپنے متذکرہ صدر مقالہ کے ساتھ کلکتہ ریویو جلد ۵۱ دسمبر ۱۸۷۰ء میں شائع کیا۔

رسالہ نکاح بیوگان۔ نا تمام، ایک صفحہ

---

[1] تھر جلد ۲ صفحہ ۹۷۴ میں ایک ہی نام کے دو رسالوں کا ذکر کرتے ہیں جو سید احمد کی تصنیف تھیں۔ مگر وہ ان کی کوئی تشریح نہیں کرتے نہ کوئی اقتباس دیتے ہیں اس لیے ان رسالوں کو عین وہی قرار دینا ممکن نہیں۔

(۳) حازق الاشرار مطبوع مطبع محمدی دہلی ۱۲۸۳ھ صفحات ۳۲- اس میں ۳۵۶ بندوں کے خمسے ہیں۔ آڑی سطروں میں لکھے ہوئے ہیں اور ہر خمسہ کے نیچے ایک سیدھی لکیر ہے۔ ہر صفحے پر چھ خمسے ہیں۔ ان کے موضوع مختلف ہیں۔ توصیف جہاد، شاہ اسماعیل کی شجاعانہ جنگ، دھوکے باز پیروں اور باطل مرشدوں کی مذمت وغیرہ غالباً حکومت نے اس کتاب کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر کے دفتر میں ممنوعہ وہابی رسالوں میں پایا گیا۔

(۴) ظہور الحق عظیم آبادی کا ایک بے نام مخطوطہ رسالہ بھی ہے۔ یہ کوئی حرفہ یا پیشہ سیکھ کر اپنی روٹی آپ کمانے کی فضیلت پر زور دیتا ہے۔ یہ احادیث کی رو سے مسلمانوں میں پھیلے ہوئے اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ بعض پیشے جیسے پارچہ بافی، خیاطی وغیرہ گھٹیا اور غیر شریفانہ ہیں مصنف اس غلط خیال کی تردید کرتا اور دعویٰ کرتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں سارے پیشے یکساں شریف ہیں۔

واضح رہے کہ اس تحریک کی تاریخ میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ وہابی تحریک کے متبعین کی بھاری اکثریت پیشہ وروں یا کاشت کاروں کے طبقے سے تھی۔ یہ رسالہ ان طبقوں کی حمایت میں نہایت دلچسپ تحریر ہے اور اپنی قسم کی ایک ہی ہے

وہابی اور خانقاہ پھلواری شریف

یہ نکتہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ قدیم اور مشہور و معروف مرکز صوفیہ پھلواری شریف بھی ۸۱-۱۸۷۰ء کے دوران وہابیوں سے ہمدردی کے شبہ میں مبتلا رہا۔ ترکوں کی اعانت کے لیے سجادہ نشین کے بعض اعلانات اور خالص مذہبی امور سے متعلق ان کی بعض مطبوعہ تصانیف بھی معرض اشتباہ میں آئیں، یہاں تک کہ وہابیوں کے ساتھ علمائے پھلواری کی ساز باز پر حکومت کے استعمال کے لیے ایک بسیط یادداشت تیار کی گئی۔ اس میں بتایا گیا کہ "پھلواری والوں کی روش وہابیوں کی روش سے بہت مشابہت رکھتی ہے اور یہ کہ پھلواری نے بھی بالکل صادق پور کے قدم بہ قدم چلنا شروع کر دیا ہے" اس نے یہ سفارش بھی کی کہ پھلواری

کو بھی ایک سب ڈویژن بنا دیا جائے۔ اور ایک تجربہ کار ڈپٹی مجسٹریٹ بابو الیشری پرشاد جیسا (وہابیوں کا شکار کرنے والا) وہاں متعین کیا جائے۔

علمائے پھلواری کی بعض تصانیف جنھوں نے حکومت کو برانگیختہ کیا یہ تھیں :-

تحفۂ محبت۔ فارسی پہلے کسی "سنی حنفی مسلم" کی لکھی ہوئی ایک کتاب مسمّٰی تحفہ محبت میں وہابیوں کے خلاف کچھ مذہبی الزامات عائد کیے گئے تھے۔ یہ کتاب اسی کے رد میں لکھی گئی۔ اس کتاب کی اشاعت میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ۱۸۶۷ء کی دفعہ ۲۵ کی خلاف ورزی تھی۔ اس پر نہ مصنف کا نام درج تھا نہ شائع کنندہ کا۔ لیکن حکومت نے پھلواری شریف کے ایک بڑے عالم پر اس کے مصنف ہونے کا شبہ کیا۔ اور ایک اعلان شائع کیا کہ جو کوئی کتاب کے مصنف اور شائع کنندہ کی اطلاع دے گا اُسے اشخاص متعلقہ کے جرمانہ کی (ایک ہزار روپے کی) رقم کا نصف عطا کیا جائے گا۔

معیار المذہب فارسی مصنفہ مولانا سید علی اعظم قادری پھلواروی۔ پہلی بار ۱۲۸۸ھ میں اور دوسری بار ۱۲۹۱ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوئی۔

اسوۂ حسنہ۔ فارسی۔ مصنفہ شاہ محمد علی حبیب پھلواروی۔ ۱۲۹۲ھ میں مطبع محمدی سے شائع ہوئی۔

یہ ساری تصنیفیں خاص طور سے مذہب اور فقہ کے مسائل پر ہیں۔ لیکن یہ بات قابل اعتراض ٹھہرائی گئی کہ آخری دونوں کتابوں کے مصنفوں نے وہابیوں کے مرغنہ کو "آفتاب روحانیت" "عماد متقین" اور ماہتاب آلہیئن کی صفات سے یاد کیا تھا۔

وہابیوں کے خلاف نگارشات

انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات کی سماعت کے دوران میں جن لوگوں پر وہابیت کا شبہ ہوتا ان کی دھر پکڑ اور جستجو شروع ہو گئی۔ مشتبہ وہابیوں کی نشان دہی ایک زرخیز مشغلہ بن گیا۔ بعض لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا کہ بظاہر وہابی تعلیمات پر سنجیدہ تنقید کے ساتھ کتابیں شائع کرتے مگر درحقیقت گندہ مذاق کے ساتھ وہابیوں پر دشنام طرازیاں ہوئیں۔

اس قسم کی تحریرات کا ایک خاص نمونہ امداد علی جج عدالت خفیفہ ترہت وسکریٹری بہار

سائنٹیفک سوسائٹی کی کتاب "وہابیوں کی تاریخ کا خلاصہ"[1] ہے اس میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوششیں کی ہیں کہ "وہابی اسلام سے خارج ہیں" "اسلام سے ان کا کوئی واسطہ نہیں" اور "بے ایمان شریر، دھوکے باز اور باغی" لوگ ہیں۔

اس طبقہ کے مصنفین کی شامت یہ تھی کہ ان کی درپردہ نیت اتنی صاف اور نمایاں ہوتی کہ خود سرکاری حکام جن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ لکھی جاتیں ایسے لوگوں اور ان کی تحریروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ پٹنہ کے کمشنر نے امداد علی کی وہابیوں کے خلاف مجسٹریٹ کو یادداشت لکھتے ہوئے رائے زنی کی "میرا خیال یہ ہے کہ امداد علی پھر فریب دے رہا ہے اور وہابیوں اور وہابیت کا پردہ کشا بن کر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے"[2]

بعض مقامی اخبارات ورسائل نے بھی وہابیوں پر گندگی اچھالی۔ ایسا ایک اُردو اخبار سورج مل ڈپٹی انسپکٹر پٹنہ نارمل اسکول نے چشمۂ علم کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے شمارہ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۸۷۵ء میں ایک مضمون "وہابیوں کی نئی چالیں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی ابتدا اس جملے سے ہوئی "آج کل وہابیوں نے چوہوں کی طرح بلوں سے سر نکالنا شروع کر دیا ہے....."

ایک اور وہابیوں کا شکاری ایک مقامی رئیس نجم الدین پدر قطب الدین اور (نواب) ولایت علی گزری پٹنہ سٹی کا عزیز دوست تھا۔ اس نے جواب دو از دہ گنا" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۸۶۸ء میں محمڈن پریس پٹنہ سے شائع ہوئی۔ اس میں وہابیوں کے دعاوی کے ردّ میں بارہ جوابات درج ہیں۔

اس کا ایک نسخہ ماکوئی کمشنر پٹنہ کی نذر کرتے ہوئے مصنف نے دعویٰ کیا کہ اس نے اسے "وہابیوں کی برائی کو روکنے کے لیے لکھا ہے" اور کمشنر کو یقین دلایا کہ میں وہابیوں کے سردار کے متعلق سب کچھ معلوم کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا..... (نواب) سید ولایت علی اور میں ہمیشہ یہی کرتے رہیں گے۔"

---

[1] موسیٰ علی مترجم ہائی کورٹ نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ اصل کتاب موجود نہیں مگر ترجمہ کا ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ موجود ہے [2] مجسٹریٹ مظفر پور کے ایک خط مورخہ ۲۸ فروری ۱۸۷۱ء پر کمشنر پٹنہ کا نوٹ۔

(۸)

مکتوب سید احمد بنام راجہ ہندو راؤ برادر نسبتی مہاراجہ دولت راؤ سندھیا گوالیار

از امیر المومنین سید احمد بمطالعہ عالی تبار، عالی جاہ، منبع جود و کرم ماوائے اہل سیف و قلم، مالک خزائن و دفاتر، صاحب افواج و حشم، بانی مصالح و حکم ریاست و نظام حکومت۔ خدا اس کی طاقت و اقتدار قائم رکھے اور اپنی زندگی میں خوش و خرم رہے۔

جذبات اتحاد و وداد کے اظہار کے بعد واضح ہو کہ میں ایک غریب آدمی رب العالمین کے کچھ بندوں کے ساتھ پشاور کے اطراف میں دین اسلام کی خدمات کی بجا آوری اور سید المرسلین کی امت کے مقصد کی حمایت میں مصروف ہوں۔ اور اپنی مساعی کے ثواب کا منعم حقیقی کی بارگاہ سے متوقع و آرزو مند ہوں۔

آپ کی نظر عالی میں ظاہر ہے کہ دور دراز ممالک سے اجنبی لوگ زمان و مکان کے فرمانروا ہو گئے ہیں، اور سوداگروں اور بنیوں نے حاکمیت و سلطنت کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے امرائے ذی شان کی زمین اور عالی جاہ رئیسوں کی ریاستیں برباد کر دی ہیں اور ان کے وقار و اقتدار کو بالکل خاک میں ملا دیا ہے۔ چونکہ صاحبان مملکت و سیاست گوشۂ خمول میں جا بیٹھے ہیں اس لیے چند غریب اور عاجز لوگوں نے مجبور ہو کر کمر ہمت باندھ لی ہے۔ عاجزوں کی یہ جماعت رب العالمین کے دین کے مقصد کی انجام دہی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی ہے، نہ کہ مال و دولت کے لالچ سے۔ جوں ہی ہندوستان کی سرزمین ان اجنبی دشمنوں سے پاک ہو جائے اور اس جماعت کی مساعی اس کے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جائیں، ریاست اور نظام حکومت کے عہدے اور دفاتر ان کے طلبگاروں کے حوالہ کر دیے جائیں گے اور ان کی طاقت و اقتدار کی جڑیں مضبوط ہو جائیں گی۔ یہ عاجز جماعت عالی مرتبہ مقتدر روساء و امراء سے صرف یہی چاہتی ہے کہ وہ دل و جان سے اسلام کے مقصد کی اعانت و حمایت کریں اور اپنے تخت حکومت پر قابض و برقرار رہیں۔

اگرچہ بظاہر درویشوں کا یہ گروہ ساز و سامان سے قطعاً محروم ہے تاہم رب العالمین کی ربوبیت و حفاظت سے جو اُسے حاصل ہے راضی و مطمئن ہے۔ وہ جاہ و وقار کی خواہشوں اور آرزوؤں سے متنفر اور مال و دولت کی غرض و طمع سے آزاد ہے وہ حال یا مستقبل میں ذاتی اور نفسانی خواہشوں کی تسکین کی ہوس نہیں رکھتا۔ وہ اُن تمام پرانے رؤساء و امراکی جو اس کی اعانت و حمایت کریں گے حکومت کی جڑیں مضبوط کر دے گا۔

چونکہ حامل مکتوب ہذا مقبول بارگاہ الٰہی حاجی بہادر شاہ اس عاجز کے رفقائے قدیم میں سے ہے اس لیے ان معروضات کی تفصیلات عرض کرنے کی خدمت اس کی زبان صادق البیان کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اب کچھ عرض کرنا باقی نہیں بجز اس تاکید مکرر کے کہ آپ ان معروضات کی تہہ تک پہنچیں اور صورتِ حال کی اہمیّت کا احساس کریں۔

مزید گزارش یہ ہے کہ حاجی صاحب ایک مدت سے اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں مصروف ہیں اس لیے اپنے گھر والوں کی ضروریات اور آسائش کی طرف توجہ نہیں کر سکے ہیں انہوں نے مستقبل میں بھی اسلامی فوج میں شامل رہنے کا عزم مصمم کر لیا ہے اس لیے اُمید نہیں کہ وہ آئندہ بھی اپنے خاندان کی دستگیری کے لیے لوٹ سکیں گے۔ اس لیے خدمت عالی میں گزارش کی جاتی ہے کہ ان کے بھائی اور بیٹے کو آپ کی ریاست میں کوئی خدمت سپرد کی جائے تاکہ حاجی صاحب خدا کے کام میں دل جمعی سے مصروف رہ سکیں۔
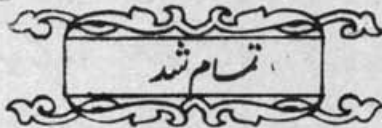
مآخذ

مخطوطات :-

۱ - امیر نامہ (سوانح نواب امیر خاں والی ٹونک) مولفہ بساون لال - ۳ جلدیں - نسخہ کتب خانہ کلکتہ یونیورسٹی -

۲ - مخزن احمدی مولفہ محمد علی او پی آئی - منقولہ ۱۲۶۲ھ ہجری -

۳ - مثنوی شہر آشوب از حکیم عبد الحمید - میرا ذاتی نسخہ

۴ - صراط مستقیم نسخہ صادق پور مورخہ ۱۲۴۳ھ

۵ - تاریخ ہزارہ مولفہ مہتاب سنگھ مورخہ ۱۸۵۴ء میرا ذاتی نسخہ

۶ - مکتوبات سید احمد کا بے نام مجموعہ - نسخہ کتب خانہ پٹنہ یونیورسٹی - مورخہ ۱۲۶۲ھ

۷ - وقائع احمدی - ۲ جلد - نسخہ کتب خانہ رام پور

۸ - نیشنل ارکیو (قومی محافظ خانہ) خارجی سیاسی اور خارجی خفیہ محکمہ جات کے مجموعوں سے حسب ضرورت جلدیں - ۱۸۳۱ء سے آگے -

۹ - سنٹرل ریکارڈز آفس کلکتہ - محکمہ عدالت کا مجموعہ دستاویزات ۱۸۳۱-۵۹ء

۱۰ - سنٹرل ریکارڈز آفس پٹنہ - محکمہ عدالت کا مجموعہ دستاویزات (مطبوعہ) ۱۸۵۹ء سے آگے -

۱۱ - دفتر ڈویژنل کمشنر پٹنہ :-

(۱) مجموعہ منجانب و بنام مجسٹریٹاں ۱۸۳۱ء سے آگے

(۲) "غدر" اور اہم عدالتی کاغذات (بنڈلوں میں) ۱۸۴۵ء سے آگے -

(۳) کچھ غیر منسلک کاغذات ایک الماری میں علیحدہ رکھے ہوئے یہ سب کاغذات ایک وقتی میں "وہابی خفیہ کاغذات" کے عنوان سے رکھے ہوئے ہیں -

مجموعے (۱) اور (۲) اب پٹنہ سنٹرل ریکارڈز آفس میں منتقل کر دیے گئے ہیں -

مطبوعات فارسی و اردو

یہ علیحدہ اور اہم مگر فراموش کردہ ماخذ ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں اور رسالے اشاعت کے فوراً بعد سے ممنوع الاشاعت قرار دیے گئے تھے۔ اور مختلف سرکاری دفاتر سے ان کی بازیابی کی گئی ہے۔ ان میں کچھ صوبہ کے مختلف مقامات خصوصاً سورج گڈھ (ضلع مونگیر سے جو تحریک کا ایک اہم مرکز رہا ہے) نجی ذخیروں میں پائے گئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تتمہ۔

۱۔ اختر احمد اُرینوی۔ بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقاء۔ پٹنہ ۱۹۵۷ء

۲۔ اے احمد۔ ہندوستانی ماحول میں اسلامی ثقافت آکسفرڈ ۱۹۶۴ء

۳۔ مرزا حیرت۔ حیات طیبہ۔ طبع ثالث۔ لاہور ۱۹۵۸ء

۴۔ عبدالحق۔ در مقال

۵۔ فضل حسین۔ حیات بعد الممات۔ آگرہ ۱۹۰۸ء

۶۔ جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی دہلی ۱۳۰۹ھ و تواریخ عجیب (کالاپانی) طبع ثانی انبالہ ۱۳۰۲ھ

۷۔ ایس آر۔ کوہلی (پبلشر) ظفرنامہ رنجیت سنگھ مولفہ دیوان امرناتھ۔

۸۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید وغیرہ ۴ جلدیں۔ لاہور ۵۶-۱۹۵۳ء

۹۔ اے ایچ۔ اے ندوی سیرت سید احمد شہید طبع ثالث۔ لکھنو ۱۹۴۸ء

۱۰۔ ایم اے ندوی۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تاریخ۔ طبع ثانی۔ راولپنڈی ۱۹۵۸ء

۱۱۔ ایم عبید اللہ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔

۱۲۔ عبدالرحیم۔ تذکرہ صادقہ۔ طبع ثانی۔ الہ آباد (حکیم عبدالخبیر نے ۱۸۶۴ء میں مع تتمہ طبع جدید شائع کیا)

۱۳۔ ایضاً۔ رسالہ تسعہ (مجموعہ مقالات) فاروقی پریس۔ دہلی۔